

برق گرتی ہے تو مسلمانو پر! (خصوصی فیچر)
محمد افضل رحمانی کی نئی طویل کہانی
کالی دیوی کا داس (احمد یار خان)
ایک رنگ نمبر نے پورا گھر برباد کر دیا!
میں بے حیا نہیں حیا آلودہ ہوں!



اپریل 2015ء

اپریل 2015ء

حکایت

قیمت - 90/- روپے



Safi Kafi Hai

خواجه رقی جو حروف
ظاہری ہی نہیں
بلکہ اندرونی بھی

اکبر فیاضی نے اپنا حیرت انگیز اور دلچسپ اور لطیف اور
پرسوں سے آلودہ بعد از کی جہان جیل کے سب سے بڑے
دوست کیسے کر سکتے ہیں۔



SAFI

THE BLOOD PURIFIER

نورِ مُبین



ہم نے ہر اُمت میں ایک رسول بھیج دیا اور اس کے ذریعے سے خبردار کر دیا کہ اللہ عزوجل کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو۔ اس کے بعد ان میں سے کسی کو اللہ عزوجل نے ہدایت بخشی اور کسی پر ضلالت مسلط ہو گئی، پھر ذرا زمین میں چل پھر کر دیکھ لو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا؟

(سورة النحل)

حکایت

ماہنامہ

جلد 44 اپریل 2015ء شمارہ 08

بانی
رحم
عنایت اللہ
شاہد بن عنایت اللہ

سرکولیشن منیجر

فضل رزاق

عرفان جاوید

شعبہ اشتہارات

خرم اقبال

محمد اشفاق مومن

کمپوزنگ

مجید

پرائم کمپیوٹرز - لاہور

مدیر اعلیٰ - صالحہ شاہد

مدیر - عارف محمود

منتظم - سعد شاہد

فنانس منیجر

وقاص شاہد ایڈووکیٹ

شعبہ تعلقات عامہ

میاں محمد ابراہیم طاہر

مجلس مشاورت

ابدال بیلا - عظمت فاروق

میم الف - ڈاکٹر شمیم

ڈاکٹر نعیمی - ڈاکٹر نصیر اسحاق

ڈاکٹر رانا محمد اقبال

مدیر - عارف محمود 0323-4329344

وقاص شاہد 0321-4616461

مدیر - فضل رزاق 0343-4300564

عرفان جاوید 0322-4847677

قیمت - 90/- روپے

ہیڈ آفس 26- پیالہ گراؤنڈ لنک میکلوڈ روڈ لاہور 042-37356541

monthlyhikayat44@gmail.com

primecomputer.biz@gmail.com

مضامین اور تحریریں ای میل کیجئے:

اس شمارے میں

11	افضل مظہر انجم	خصوصی فیچر برق گرتی ہے تو مسلمانوں پر لمحہ فکریہ
21	سید محمد سعید	ہم ایسی گل کتابوں کو.....
25	ابدال بیابان	ذہول ذہول آنکھیں
29	دیر حسین رضوی	انکشاف وار برٹن کون بچا؟
33	محمد رفیق ڈوگر	تاریخی ناول مغلانی بیگم جرم و سزا
65	احمد یار خان / عارف محمود	کالی دیوی کا داس
121	محمد نیر ملک	رائٹ نمبر
151	دعیمہ شاہ	نیچی پور کا لیڈر علم و تحقیق
193	شازیہ محسن	لفظ امریکہ
214	خادم حسین مجاہد	اصلاح زبان و بیان جگ بینی
97	محمد افضل رحمانی	ناٹ کا پوند قسط: 1
113	ڈاکٹر ہشیر حسن ملک	حیا آلود سلسلہ وار ناول
129	محمد رضوان قیوم	آکاس تیل قسط: 6
161	رذاق شاہد کوہل	دیر زنداں قسط: 9

اس شمارے میں

159	خادم حسین مجاہد	طنز و مزاح ایزی لوڈ
183	ڈاکٹر عبداللہ	دلچسپ و عجیب فرار کے چند مشہور واقعات
187	ممتاز مفتی	منتخب افسانہ میاں کا بھید
193	ڈاکٹر عبدالغنی فاروق	مکالمات عمل ہوائے فریڈ
198	حبیب اشرف صبوحی	کچھ یلدیں کچھ ہفتیں ایم اسلم
206	محمد ساجد گل اعوان	سب رنگالی غدار نہ تھے سنگھ
201	سکندر خان بونچ	تقریب ہند اور فوج کا کردار چل دیواریں کس دنیا
209	نسیم سیکینہ صدف	تقریب مقابلہ ہوا موش
217	اسے آرزوی	عجیب شادی ایک نقشہ
222	رحمن شاہد	داروں کا سفر تکخیص
225	میاں محمد امجد علی طاہر	افریقہ میں خونی کارروائیاں نقطہ نظر
238	پروفیسر ڈاکٹر سلیم احمد شاہ	فلسفہ انقلاب

سالانہ چندہ رجسٹرڈ ارمیل

لاہور
حکایت
ماہنامہ

پاکستان 800 روپے

7000 روپے 1

سعودی عرب، کویت، اردن، ایران، سری لنکا، ابوظہبی، بحرین،
دوبئی، قطر، شارجہ، بھارت، سوڈان، یوگنڈا، کینیا، نائیجیریا اور
دیگر افریقی ممالک، مشرقی اور مغربی جرمنی، ڈنمارک، انڈونیشیا، ناروے،
سویڈن، فرانس، ملائیشیا، سویٹزرلینڈ، سنگاپور، ہانگ کانگ، آسٹریلیا، پروانگی

7000 روپے 2

آسٹریلیا، کینیڈا، فجی، نیوزی لینڈ، بہاماز، وینزویلا، یونان، امریکہ،
نورو، برازیل، چلی، کولمبیا، کیوبا، ارجنٹائن، جمیکا، میکسیکو، گریناڈا

- ✎ غیر ممالک سے رقم بھجوانے کے لئے ”وقاص شاہ“ کے نام کا ڈرافٹ بنوائیں۔
- ✎ پاکستان کے علاوہ دوسرے ممالک وی پی نہیں جاتی، رقم پہلے بھجوانی ضروری ہے۔
- ✎ کتابوں پر ڈاک خرچ خریدار حضرات کے ذمہ ہوگا۔
- ✎ خط و کتابت اور بدلہ اشتراک روانہ کرتے وقت خریداری حوالہ نمبر لکھنا ضروری ہے۔

نوٹ: تبدیلی پتہ کی اطلاع مہینے کی چندہ تاریخ سے پہلے دیجئے۔

26- پٹیا لہ گراؤنڈ، لنک میکلوڈ روڈ، لاہور۔ فون: 042-37356541



ہمیں قائد اعظمؒ کا پاکستان چاہئے!

کابینہ کا اجلاس تھا، اسے ڈی سی نے پوچھا۔ ”سر اجلاس میں چائے سرو کی جائے یا کافی؟“ چونک کر سر اٹھایا اور سخت لہجے میں فرمایا: ”یہ لوگ گھروں سے چائے کافی پی کر نہیں آئیں گے۔“ اسے ڈی سی گھبرا گیا۔ آپ نے بات جاری رکھی۔ ”میں وزیر نے چائے کافی پینی ہو وہ گھر سے پی کر آئے یا پھر واپس گھر جا کر پیئے۔ قوم کا پیہ قوم کے لئے ہے، وزیروں کے لئے نہیں۔“

اس حکم کے بعد جب تک وہ برسر اقتدار رہے، کابینہ کے اجلاسوں میں سادے پانی کے سوا کچھ سرو نہ کیا گیا۔ گورنر جنرل ہاؤس کے لئے ساڑھے 38 روپے کا سامان خریدا گیا۔ آپ نے حساب منگوا لیا۔ کچھ چیزیں محترمہ فاطمہ جناح نے منگوائی تھیں، حکم دیا۔ ”یہ پیسے ان کے اکاؤنٹ سے کاٹے جائیں۔“ دو تین چیزیں ان کے ذاتی استعمال کے لئے تھیں فرمایا۔ ”یہ پیسے میرے اکاؤنٹ سے لے لئے جائیں۔“ باقی چیزیں گورنر جنرل ہاؤس کے لئے تھیں، فرمایا۔ ”ٹھیک ہے یہ رقم سرکاری خزانے سے ادا کر دی جائے لیکن آئندہ احتیاط کی جائے۔“

برطانوی شاہ کا بھائی ڈیوک آف گلوسٹر پاکستان کے دورے پر آ رہا تھا۔ برطانوی سفیر نے درخواست کی۔ ”آپ اسے ائرپورٹ پر خوش آمدید کہہ دیں۔“ فس کر کہا۔ ”میں تیار ہوں لیکن جب میرا بھائی لندن جائے گا تو پھر برٹش کنگ کو بھی اس کے استقبال کے لئے ائرپورٹ آنا پڑے گا۔“ ایک روز اسے ڈی سی نے ایک وزیٹنگ کارڈ سامنے رکھا۔ آپ نے کارڈ پھاڑ کر پھینک دیا اور فرمایا۔ ”اسے کہو آئندہ مجھے شکل نہ دکھائے۔“ یہ شخص آپ کا بھائی تھا اور اس کا قصور صرف اتنا تھا اس نے اپنے کارڈ پر نام کے نیچے ”برادر آف قائد اعظم محمد علی جناح گورنر جنرل پاکستان“ لکھوا دیا تھا۔ زیارت میں سردی پڑ رہی تھی، کرنل الہی بخش نے نئے موزے پیش کر دیئے۔ دیکھے تو بہت پسند فرمائے، ریٹ پوچھا، بتایا۔ ”دورو پے۔“ گھبرا کر بولے۔ ”کرنل یہ تو بہت مہنگے ہیں۔“ عرض کیا۔ ”سرا یہ آپ کے اکاؤنٹ سے خریدے گئے ہیں۔“ فرمایا۔ ”میرا اکاؤنٹ بھی قوم

کی امانت ہے، ایک غریب ملک کے سربراہ کو اتنا عیاش نہیں ہونا چاہئے۔“ موزے لپیٹے اور کرنل الٹی بخش کو واپس کرنے کا حکم دے دیا۔

زیارت ہی میں ایک نرس کی خدمت سے متاثر ہوئے اور اس سے پوچھا۔ ”بہنی! میں تمہارے لئے کیا کر سکتا ہوں؟“ نرس نے عرض کی۔ ”سر! میں پنجاب سے ہوں، میرا سارا خاندان پنجاب میں ہے، میں اکیلی کوئٹہ میں نوکری کر رہی ہوں، آپ میری ٹرانسفر پنجاب کرادیں۔“ اداس لہجے میں جواب دیا۔ ”سوری، بہنی! یہ محکمہ صحت کا کام ہے، گورنر جنرل کا نہیں۔“ اپنے طیارے میں رائیجنگ ٹیکل لگوانے کا ارادہ کر دے دیا۔ فائل وزارت خزانہ پہنچی تو وزیر خزانہ نے اجازت تو دے دی لیکن یہ نوٹ لکھ دیا۔ ”گورنر جنرل اس قسم کے احکامات سے پہلے وزارت خزانہ سے اجازت کئے پابند ہیں۔“ آپ کو معلوم ہوا تو وزارت خزانہ سے تحریری معذرت کی اور اپنا حکم منسوخ کر دیا اور رہا بھانگ والا قصہ تو کون نہیں جانتا، گل حسن نے آپ کی گاڑی گزارنے ک لئے ریلوے کا بھانگ کھلوادیا تھا، آپ کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا۔ بھانگ بند کرانے کا حکم دیا اور فرمایا۔ ”اگر میں ہی قانون کی پابندی نہیں کروں گا تو پھر کون کرے گا؟“

یہ آج سے 68 برس پہلے کا پاکستان تھا، وہ پاکستان جس کے سربراہ محمد علی جناح تھے لیکن پھر ہم ترقی کرتے کرتے اس پاکستان میں آ گئے جس میں بھانگ تو ایک طرف رہے سربراہ مملکت کے آئے سے ایک گھنٹہ پہلے سڑکوں کے تمام سٹپل بند کر دیئے جاتے ہیں۔ دونوں اطراف ٹریفک روک دی جاتی ہے اور جب تک شاہی سواری نہیں گزرتی، ٹریفک کھلتی ہے اور نہ ہی اشارے اور مریض ایسولینس میں ٹپ ٹپ کر مرتے رہتے ہیں۔ سربراہ مملکت وزارت خزانہ کی اجازت کے بغیر جیلوں میں بانچ بانچ کروڑ روپے کا اعلان کر دیتے ہیں۔ وزارت خزانہ کے انکار کے باوجود پورے پورے جہاز خرید لئے جاتے ہیں جس میں صدروں اور وزیراعظموں کے احکامات پر بیٹکروں لوگ بھرتی کئے گئے، اتنے ہی لوگوں کے تادلے ہوئے، اتنے لوگ نوکریوں سے نکالے گئے اور اتنے لوگوں کو ضابطے اور قانون توڑ کر ترقی دی گئی جس میں موزے تو رہے ایک طرف بچوں کے پوڑے تک سرکاری خزانے سے خریدے گئے۔ آج ایوان صدر اور وزیراعظم ہاؤس کا بجٹ کئی ہزار کروڑ روپے ہے جس میں ایوان اقدار میں عملا بھائیوں، بھتیجیوں، بھانجیوں، بہنوں، بہنوئیوں اور خاوند کا راج رہا جس میں وزیراعظم ہاؤس سے سیکرٹریوں کو فون کیا جاتا تھا اور کہا جاتا تھا کہ ”میں صاحب کا بہنوئی بول رہا ہوں۔“

جس میں امریکہ کے نائب وزیر کے استقبال کے لئے پوری پوری حکومت انرپورٹ پر کمزری دکھائی دیتی ہے اور جس میں چائے اور کافی تو رہی ایک طرف کالے کھانسی میں پورا لٹخ، پورا ڈنر سرور کیا جاتا ہے اور جس

میں الیوان صدر اور وزیراعظم ہاؤس کے مچن ہر سال کروڑوں روپے پیٹ پوجا میں اڑا دیتے ہیں۔
 یہ پاکستان کی وہ ترقی یافتہ شکل ہے جس میں اس وقت 20 کروڑ غریب لوگ رہ رہے ہیں۔ جب
 قائداعظم کورنر جنرل ہاؤس سے نکلتے تھے تو ان کے ساتھ پولیس کی صرف ایک گاڑی ہوتی تھی، اس گاڑی میں
 صرف ایک انسپکٹر ہوتا تھا اور وہ بھی غیر مسلح تھا اور یہ وہ وقت تھا جب گاندھی قتل ہو چکے تھے اور قائداعظم کی جان
 کو سخت خطرہ تھا۔ قائداعظم اس خطرے کے باوجود سیوریٹی کے بغیر روز کھلی ہوا میں سیر کرتے تھے لیکن آج کے
 پاکستان میں سربراہ مملکت ماڈرن بلٹ پروف گاڑیوں، گاڑیوں اور انتہائی تربیت یافتہ کمانڈوز کے
 بغیر ایک کلومیٹر کا فاصلہ طے نہیں کر سکتے۔ ہم اس ملک میں مساوات رائج نہیں کر سکے، ہم اسے ایک خوددار،
 باوقار اور ایماندار قیادت بھی نہیں دے سکے، یہ نہ دیں، ہم اسے جدید، ترقی یافتہ اور نڈامن ملک نہیں بنا سکے، نہ
 بنائیں لیکن ہم اسے 1948ء تک تو لے جاسکتے ہیں۔ ہم اسے 68 برس پرانا پاکستان تو بنا سکتے ہیں جو
 کرپشن، اقربا پروری اور لوٹ کھسوٹ سے پاک ہو۔

کوئی ہے جو ہم سے یہ ترقی، یہ خوشحالی اور یہ عروج لے لے اور ہمیں ہمارا پس ماندہ، غریب اور غیر ترقی یافتہ
 پاکستان واپس کر دے، جو ہمیں قائداعظم کا پاکستان واپس کر دے کہ اس ملک کے 20 کروڑ عوام کو 2015ء
 کے بجائے قائداعظم کا پاکستان چاہئے۔

میاں محمد طاہر ابراہیم

حقیقت نگار قلم کار میاں محمد ابراہیم طاہر کی شاہکار کتابیں

1947ء کی داستان خود چٹکاس

آزادی کی قیمت

(ترجمہ و اضافہ ڈی ٹی این)

موصول پاکستان کی راہ میں سکھ ریاست کیور تھلہ اور
پٹیالہ میں مسلمانوں کے قتل عام کی دلخراش داستانیں

قیمت
250/-

ترجمین آسٹریا و ترجمہ و اضافہ کے ساتھ

حالی سفر نامہ

تاریخ
1947ء

جرمن، امریکہ، افغانستان اور
دیگر ممالک کا چشم کشا سفر نامہ

قیمت
406/-

جی دار لوگوں کی سر زمین

(دوسرا ایڈیشن)

جرمنی

جرمنی کی ترقی کاراز اور انتہائی دلچسپ سفر نامہ

قیمت
300/-

جاز مقدس کے روح پرور اور ایمان اطرو سفر نامہ مکمل

سفر حج

صفحہ 25، وہ ہے کے ذاک گفت حج کطلب کریں

ہدایت نامہ سفر کرنے والی ناقابل فراموش داستان

شکستہ قلم کار

ایک ہندو خاتون کشمیری جی داستان جس نے دیوی
دیوتاؤں کو گھوکھ کر کر کر یکساں پاکستان میں بھر پور رکھ لیا۔

قیمت
256/-

قیمت
250/-

سفر نامہ

امریکہ

نائن الیون سے پہلے اور بعد
21 ویں صدی کا سب سے بڑا سفر
جس نے دنیا کی تاریخ کا رخ بدل دیا

قیمت
344/-

قیمت
350/-

شاہکار

میاں محمد ابراہیم طاہر

لیپ مرلے

لکچر پاکستان

54700/205 ماڈل ٹاؤن، لاہور
فون 0300-4154083

125- ایف، ماڈل ٹاؤن، لاہور

26- پٹیالہ گراؤنڈ، لنک میٹرو روڈ، لاہور
فون 042-37356541

برق گرتی تھی مسلمانوں پر

امریکہ اپنے مفادات کے لئے ہر ایسا قدم اٹھانے کی پالیسی پر عمل پیرا ہے جس سے مسلمانوں کو کمزور کیا جاسکے یا جس سے مضبوط ہونے والے مسلمان ممالک کی طاقت توڑنے کی منصوبہ بندی پر عمل کیا جاسکے۔

- آپس میں دست و گریباں مسلمان
- امریکہ اور اسرائیل کی نئی حکمت عملی
- مشرق وسطیٰ پر قبضے کا اسرائیلی خواب
- شام میں 2 لاکھ ہلاک، 65 لاکھ بے گھر اور 30 لاکھ پناہ گزین
- شیعہ سنی اختلافات کو وسیع پیمانے پر بھڑکایا جا رہا ہے
- او آئی سی کا کردار نہایت مایوس کن ہے
- القاعدہ، طالبان، داعش، حزب اور دوسری تنظیمیں دشمن کا کام آسان کر رہی ہیں
- پاکستان اور سعودی عرب میں خانہ جنگی کی کوشش

جنگ عظیم ختم ہونے کے بعد امریکہ دنیا میں دوسری ایک نئی فوجی طاقت کے طور پر سامنے آیا۔

1960ء کی دہائی میں دوسری سپر پاور کے طور پر روس بھی امریکہ کے بمقابلہ آن کھڑا ہوا۔ دونوں سپر طاقتوں کی جنگ جسے ”سرد جنگ“ سے یاد کیا جاتا ہے، عرصہ 35،

36 سال تک رہی۔ اس دوران کسی بھی خطہ میں ہونے والی لڑائی میں ایک طرف امریکہ کھل حمایت کے ساتھ کھڑا ہوتا تو دوسری طرف روس لڑنے والے ملک کو

بھرپور اسلحہ کی فراہمی کا ذمہ لیتا نظر آتا۔ 1980ء کی دہائی میں دو انتہائی اہم واقعات رونما ہوئے۔ پہلا واقعہ تو امریکہ کے خطہ میں سب سے مضبوط مہرے ایران کے

شاہ رضا شاہ پہلوی کے طویل اقتدار کو ختم کی طرح اڑا کر رکھ دینے والے اسلامی انقلاب کا تھا۔ دوسرا واقعہ دوسری سپر پاور روس کے افغانستان میں اپنی باقاعدہ فوج داخل

کرنے کا تھا۔ یعنی جنوب مشرقی ایشیائی خطہ اور اس کے ہمسایگی میں مشرق وسطیٰ کے دروازہ ایران میں امریکہ کھل طور پر آؤٹ ہو چکا تھا۔

ایران میں امریکہ کے بڑے مہرے شاہ ایران کے اقتدار سے علیحدہ ہونے سے بھی بڑا اور اہم ترین واقعہ وہاں عوام الناس کا لایا ہوا انقلاب تھا جس نے امریکہ کے علاوہ غیر مسلم قوتوں کو بھونچکا کر کے رکھ دیا تھا۔

دوسری طرف افغانستان میں وہاں کے فریڈیم فائٹرز کی روس کے خلاف جدوجہد اور ہمسایہ ملک پاکستان میں قائم جہاز نیاہ حکومت کی ان کو ہر طرح کی مالی و فوجی مدد نے

بھی حالات کا زرخ بدل کے رکھ دیا تھا۔ امریکہ اپنے نمبر بنانے کے لئے روس سے ویت نام کا بدلہ چکانے اور خود بھی افغانوں کی مدد کے لئے کود چکا تھا۔ بہر حال روس کو

ان دونوں قوتوں کی مدد سے نہی طرح شکست دی جا چکی تھی لیکن چند سال افغانستان میں اقتدار کی رس کشی کی وجہ سے طالبان نامی گروپ پاکستان کی مدد سے کابل کا قبضہ

اپنے ہاتھوں میں لے چکا تھا۔ امریکہ نے جن افغانوں کی ہر قسم کے اسلحہ سے جو مدد کی تھی اب یہی افغانی طاقتور بن کر حکومت بنا چکے تھے۔ اس دوران پوری دنیا میں

القاعدہ نامی تنظیم بھی امریکہ دشمن کارروائیوں اور اپنا نیٹ ورک پھیلا کر دنیا کی نظروں میں آ چکی تھی۔ ابھی امریکہ

اس تنظیم پر ہاتھ ڈالنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر دہشت گردی کا خوفناک واقعہ سامنے آ گیا جس میں اس کے بھرتل مسلمان مذہبی عسکریت پسند ملوث پائے

گئے۔ ساتھ ہی وہاں مسلمان تنظیموں کے علاوہ مسلمان ممالک پر امریکہ نے لشکر کشی شروع کر دی۔ افغانستان کے بعد عراق پر بھی فوجی دھاوا بولا گیا۔ دوسری طرف

القاعدہ کا نیٹ ورک بھی پوری دنیا میں تباہ کر کے اس کی طاقت توڑی جا چکی تھی۔

پاکستان میں جنرل ضیاء الحق کے دور سے شیعہ سنی گروپوں کا ایک دوسرے کے گلے کاٹنے کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ نائن الیون کے بعد امریکہ کے افغانستان میں

آپریشن کے نتیجہ میں امریکہ کا ساتھ دینے لیکن اصل میں اپنے آپ کو محفوظ رکھنے والے پاکستان میں چند مذہبی سر

بھرے پاکستانی طالبان یا دوسرے کئی گروپوں کے نام پر بم دھماکوں میں ملوث ہو چکے تھے۔ غیر ملکی طاقتوں

امریکہ، انڈیا نے بھی مذہب کے نام پر ملت اسلامیہ کو نقصان پہنچانے والے ان گروپوں جن کا زیادہ تر تعلق قبائلی علاقوں سے تھا، کی بھرپور مدد کی اور آج 14 سال

سے پاکستان دھماکوں سے گونج رہا ہے۔ امریکہ نے یہی حربہ مشرق وسطیٰ میں بھی آزمانے کا فیصلہ کیا کہ مسلمان مذہبیت کی آڑ میں یا شریعت کا نعرہ لگا کر برسر اقتدار طبقہ کو

برسر اقتدار طبقہ سے نبرد آزما ہو چکے تھے۔ ان میں سے اکثر گروپ اسلام اسلام کے نعرے تو بلند کر رہے تھے لیکن ان کو جدید اسلحہ اور مالی امداد کون فراہم کر رہا تھا؟ بھرپور جنگ کے لئے گولہ بارود کے علاوہ دیگر وسائل کی فراہمی کہاں سے ہو رہی تھی، اس سے مسلمانوں کو لڑانے کی سازش بے نقاب ہو چکی تھی۔ مصر، یمن، لیبیا، شام اور عراق کے ممالک تباہی و بربادی سے دوچار ہو چکے ہیں اور اقتدار کی رس کشی کا یہ سلسلہ ابھی جاری ہے۔

مشرق وسطیٰ پر قبضہ کا اسرائیلی منصوبہ

سابق امریکی وزیر خارجہ ہنری کسنجر جو ماضی میں دو امریکی صدور رچرڈ نیکسن اور جerald فورد کے ساتھ بھی کام کر چکے ہیں نے ایک مجریہ امریکی اخبار "ڈبلی لینڈ سکیپ" کو انٹرویو دیتے ہوئے مشرق وسطیٰ میں امریکی پالیسی سے پردہ اٹھایا۔ ہنری کسنجر کے مطابق امریکہ نے مشرق وسطیٰ میں امریکی افواج اس لئے روانہ کی تھیں کہ عرب خطہ کے سات ممالک پر اپنا قبضہ مستحکم کیا جاسکے۔ ان ساتوں ممالک پر کنٹرول کے بعد صرف ایران ہی ایسا ملک رہ جاتا ہے جس کو مناسب وقت پر ہدف بنا کر اس کی طاقت توڑی جاسکتی ہے لیکن اس منصوبہ پر عملدرآمد کرتے وقت دوسری طاقتیں چین اور روس باہر نکلیں تو دنیا خوفناک عالمی جنگ کی صورت اختیار کر سکتی ہے اور اس کے بعد دنیا میں دو طاقتیں ہی میدان میں رہ سکتی ہیں امریکہ اور اسرائیل۔ اسرائیل اس جنگ میں اپنی تمام تر جنگی قوت کے ساتھ عربوں کو تباہی سے دوچار کر سکتا ہے۔

ہنری کسنجر اپنے انٹرویو میں اپنے مذموم عزائم کا اظہار کرتے مزید کہتا ہے کہ ہم نے یعنی امریکہ، یورپ والوں نے اپنے جوانوں کی اس جنگ کے لئے خوب تربیت کی ہے اور انہیں جس وقت حکم دیا جائے گا وہ مشرق

شریعت کے نفاذ کے نام پر مسلح جدوجہد شروع کر دی جو بالآخر کٹل فرائی کی حکومت کے علاوہ ان کے ہی خاتمے کا باعث بن گئی۔

اس کے بعد سے حکومت سنبھالنے والے اور حکومت کے مخالفین کے درمیان خوفناک جنگ شروع ہو گئی جس نے پورے ملک کو تباہی سے دوچار کر کے رکھ دیا۔ مذہبی گروپ کا شریعت کے نفاذ کے لئے برسر اقتدار طبقہ سے جنگ و جدل کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ عین اسی وقت شام میں بھی وہاں کے صدر حافظ الاسد کے خلاف انہیں حکومت سے علیحدہ کرنے والی تحریک شروع ہو چکی تھی۔ 2013ء میں اس تحریک میں انٹی تیزی آ چکی تھی کہ یہ ملک کے ہر شہر اور علاقہ میں پھیل چکی تھی۔ تحریک کو کچلنے کے لئے شامی صدر نے بھی انتہائی سخت حربہ استعمال کرنا شروع کیا اور اپنے خلاف اٹھنے والی اس تحریک کو کچلنے کے لئے ٹینک، توپیں حتیٰ کہ فضائیہ تک استعمال کرتا پڑی۔ دوسری طرف بشارۃ الاسد کو اقتدار سے علیحدہ کرنے والے باغی بھی پوری طرح جدید اسلحہ سے لیس تھے۔ گویا مسلمانوں کے ملک میں ایسی خوفناک جنگ شروع ہو گئی جس نے ان کے اپنے ملک کی تباہی کے علاوہ قوم کی بربادی انتہا تک پہنچا دی۔

غیر مسلم طاقتوں کے لئے آسانی

جس طرح سے افغان جنگ کے بعد مسلمانوں کے ہی کئی گروپ امریکہ کی حمایت اور مخالفت میں آپس میں لڑنا شروع ہو گئے، کئی گروپوں نے مذہبیت کا لبادہ اوڑھ کر پاکستان جیسے ایسی قوت کے حامل ملک میں ہجرت دھماکوں کا سلسلہ شروع کر کے۔ امریکہ، اسرائیل اور انڈیا جیسے مسلمانوں کے مشترکہ دشمنوں کا کام آسان کر دیا۔ اسی طرح سے لیبیا، شام، مصر، یمن، عراق میں بھی مسلمانوں کے گروپ اسلامی نظام کے نفاذ کا نعرہ لگا کر

ترکی النسل گردہی دولت اسلامیہ کی مخالفت میں اس خانہ جنگی میں کود پڑے۔ یعنی یہ تمام مسلمانوں کے ہی مسلح گروپ ہیں جو آپس میں بے دردی سے جنگ و جدل میں مصروف ہیں اور ایک دوسرے کے گلے کاٹنے میں ایک دوسرے سے بڑھ کر کارروائیاں کر رہے ہیں۔ صرف چار سال کے مختصر عرصہ تک جاری رہنے والی اس خانہ جنگی میں دو لاکھ انسانی جانوں کو موت کے گھاٹ اتارا جا چکا ہے۔ 65 لاکھ سے زائد افراد بے گھر ہو چکے ہیں اور 30 لاکھ افراد ترکی، لبنان وغیرہ میں پناہ لینے پر مجبور ہو چکے ہیں۔ پورا ملک کھنڈر بن چکا ہے۔ اہم عمارتیں، ہسپتال، سکول تباہ و برباد ہو چکے ہیں۔ یہ مسلمانوں کے ہی کر قوت ہیں جو آفت بن کر مسلمانوں پر ہی نازل ہو رہے ہیں۔ اس خانہ جنگی میں ہزاروں کی تعداد میں معصوم بچے بھی مارے جا چکے ہیں اور ہزاروں کی تعداد میں بچے والدین کی شفقت اور گھریار سے محروم ہو چکے ہیں۔

تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں کو جتنا نقصان مسلمانوں نے پہنچایا غیر مسلم نہیں پہنچا سکے۔ مسلمانوں کی تنظیم او آئی سی کیا مسلمان حکمرانوں اور عسکری تنظیموں کو ایک ہی میز پر بٹھا کر مسلمانوں کو اپنی ہی تباہی و بربادی سے روکنے کے لئے اقدامات نہیں کر سکتی؟ اگر مسلمان ممالک پر مشتمل تنظیمیں یہ کام انجام نہیں دے سکتی تو اس پلیٹ فارم کو بنانے کا فائدہ ہی کیا؟ اس کے علاوہ مسلمان ممالک سے جید علماء اور مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے مقدس ترین مقامات میں امام کے درجہ پر فائز شخصیات اس خانہ جنگی کے لئے اپنا کردار ادا کرتے نظر آتے تو ہزاروں مسلمانوں کے گلے کاٹنے کے عمل کو روکا جاسکتا تھا۔

شرم کا باعث ہے کہ مسلمان ممالک کی بجائے اقوام متحدہ اور غیر مسلم ممالک اس خانہ جنگی کو روکنے کے لئے سرگرم عمل ہیں۔ ایک ہی ملک میں مسلمانوں کے تین چار گروہ آپس میں برسرِ پیکار ہیں تو ان کو اسلحہ و گولہ بارود

وسطی کی شاہراہوں پر نکل کر مذہبی دیوانوں "یعنی مجاہدین اسلام" کے خلاف ہمارے احکامات کی تکمیل کر کے انہیں راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کر دیں گے۔ یہودی نژاد سابق امریکی وزیر خارجہ مزید کہتے ہیں کہ ایران اصل میں روس اور چین کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہو گا جسے امریکہ اور اسرائیل مل کر ٹھونک دیں گے اور اس کے بعد دونوں بڑی طاقتوں (چین، روس) کو موقع فراہم کیا جائے گا کہ وہ اپنی قوت ضائع ہونے کے خطرے سے بچنے کی خاطر امریکہ کی اطاعت کرنے پر مجبور ہو جائیں اور یوں دنیا میں امریکہ کی "عالمی حکومت" وجود میں آ جائے گی۔

یہ تو معروف سابق امریکی اعلیٰ عہدیدار کے خیالات تھے لیکن دنیا کی سب سے طاقت کے درجے پر فائز امریکہ عرصہ دراز سے اسی قسم کے جنگی منصوبوں پر عملدرآمد کر رہا ہے اور ایسے منصوبوں پر عمل کرنے کے جس پردہ انہی مقاصد کا حصول ہے جو ہماری سمجھ کے امریکی اخبار کو انٹرویو دیتے وقت بیان کئے تھے۔ مصر میں امریکہ مخالف جمہوری حکومت کی برطرفی، لیبیا میں کرنل قذافی کی ہلاکت، عراق میں امریکی مخالف صدر صدام کی پھانسی، ایران پر مسلسل پابندیوں جیسے واقعات اسی پالیسی کا تسلسل ہیں۔

شام میں خوفناک خانہ جنگی

دو لاکھ ہلاکتیں، 65 لاکھ بے گھر، 30 لاکھ بیرون ممالک پناہ گزین۔ شام میں برسرِ اقتدار صدر بشار الاسد کو ہٹانے کی تحریک 2011ء میں شروع ہوئی جو خانہ جنگی میں تبدیل ہو گئی۔ 2013ء میں ایک نئی تنظیم جو دولت اسلامیہ کے نام سے میدان میں آئی شامی صدر کے خلاف تحریک میں شامل ہو گئی اور شامی فوجوں اور دولت اسلامیہ دونوں ہی جدید اسلحہ سے لیس ہیں۔ اس دوران



جوڑ سے بے نیاز ہمارے زیادہ مضبوط

اتلس

پاکستان میں سب سے پہلے بنائے والے



اتلس والیگیل برائے

کچن سینک

واش بیس

لیبارٹری باؤل

سٹیل سٹیل

مین ہول کور



HUSSAIN STEEL INDUSTRIES

Office:
Bazar Kharadan, Gujranwala, Pakistan.
Ph: 0092-55-4216865, 4222947 Fax: 0092-55-210945
E-mail: info@atlassinks.com Web: www.atlassinks.com

Factory:
Opp. Global Village Hotel;
G. T. Road, Gujranwala Cantt, Pakistan.
Ph: 0092-55-3862462, 3861174-75, Fax: 0092-55-361176

غصہ عقل کو کھا جاتا ہے

ایک جذباتی شخص کسی سے جھگڑ پڑا اور اول فول بکنے لگا۔ مہ مقابل نے اسے خوب مارا اور اس کا لباس تار تار کر دیا۔ اس کا یہ حال دیکھا تو ایک دانا شخص نے کہا۔ ”اگر تو عقل سے کام لیتا اور اپنی زبان کو قابو میں رکھتا تو تیرا یہ حال نہ ہوتا۔ ٹو اگر غصے کی طرح اپنا منہ بند رکھتا تو پھول کی طرح دریدہ دامن نہ ہوتا۔“

یاد رکھنا چاہئے کہ ایک کم عقل اور گھبرایا ہوا شخص ہی جینی بھارت اور اس کے نیچے میں نقصان اٹھاتا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ آگ سر تباہ زبان ہی زبان ہے۔ بھڑکتی ہے، چمکتی ہے، لپکتی ہے لیکن پانی کی تھوڑی سی مقدار بھی اسے بجھا دیتی ہے۔ غصہ بہر حال نقصان پہنچانے والی چیز ہے اور کمزوری کی حالت میں غصہ آنے تو وہ تو اور بھی تباہ کرتا ہے۔ یہ اتنی بُری چیز ہے کہ قرآن مجید میں اس پر قابو پانے کی تاکید بطور خاص کی گئی ہے۔

(حکایات سعدی)

اور یہ دونوں ممالک کو ایک ریاست میں ضم کرنے کے لئے کوشاں ہے۔ اس کے عراق میں جنگجوؤں کی تعداد 20 ہزار کمانڈوز پر مشتمل ہے اور اسے سنی مسلک کے کئی گروپوں اور القاعدہ کے انصرہ فرنٹ کی حمایت بھی حاصل ہے۔ یہ تنظیم بیک وقت عراق اور شام دونوں ممالک میں مسلح سرگرمیوں میں مصروف ہے۔ چند روز قبل ایرانی فوج کے عراق میں داخل ہونے کی خبر بھی منظر عام پر آئی۔ ایرانی فوج کے سربراہ بریگیڈیئر جنرل احمد رضا بوردستان نے دعویٰ کیا کہ ان کی پانچ بریگیڈ فوج عراق کی سرحد سے چالیس کلو میٹر اندر دہشت گردوں کے خلاف کارروائیوں میں مصروف ہے۔

فوج کی عراق میں موجودگی کا مقصد دولت اسلامی

اور مالی وسائل امریکہ، روس اور چین ہی فراہم کر رہے ہیں اور چند مسلمان ممالک بھی ہر گروپ کے پیچھے ہیں۔ گویا مسلمان گروپ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے غیر مسلم سے مدد لینے پر مجبور ہو چکے ہیں اور اگلے مسلمانوں کے ہی کٹ رہے ہیں۔ صرف 2014ء میں ہی ریکارڈ 76 ہزار شامی باشندے اور مخالف گروہ کے افراد موت کے منہ میں جا چکے ہیں۔ 22 ہزار سے زائد حکومتی فوجی اور اس کے حمایتی لیبیا باغی بھی اسی خانہ جنگی کا شکار ہو چکے ہیں۔

دولت اسلامیہ یا داعش جنگجو گروپ

امریکی فوج کے عراق میں داخل ہونے کے بعد سے شروع ہونے والی خانہ جنگی ابھی تک جاری ہے۔ امریکی فوج تو عراق چھوڑ کر جا چکی اب مسلمانوں کے کئی گروپ اقتدار کی خاطر اور اپنے اپنے عقائد کے تحفظ کی خاطر آپس میں دست و گریباں ہیں۔ عراق میں شیعہ سنی تنازعہ شروع سے ہی رہا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے صوبہ کردستان میں عیلامی کی تحریک بھی عرصہ دراز سے جاری ہے۔ اس دوران ایک نئی تنظیم جو شام میں اسلامی خلافت کے لئے حکومت ہے جنگ میں مصروف ہے عراق میں بھی انہی مقاصد کے لئے مسلح جدوجہد کر رہی ہے۔ یہ تنظیم ”داعش“ کے نام سے مشہور ہے۔ داعش چار حروف کا مرکب ہے جو ”دولت اسلامیہ عراق و شام“ کا مخفف ہے۔ انگریزی میں اسے ISIS کے نام سے جانا جاتا ہے۔

اسامہ بن لادن کے قتل سے متاثر افراد نے اس تنظیم کی بنیاد 2006ء میں بغداد میں رکھی۔ داعش کے قیام کا مقصد عراق اور شام کے کچھ علاقوں پر مشتمل ایک اسلامی ریاست کا قیام ہے۔ اس تنظیم کے مطابق 1932ء میں عراق اور شام کی قائم کردہ حدود سے معنی ہیں

کنٹرول کرنے کے اجلاس کی صدارت کی اور بعد میں ایک نیوز کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ امریکہ کی قیادت میں اتحادی افواج کے فضائی حملوں کے نتیجے میں داعش کا زور ٹوٹ رہا ہے۔ ہم نے ہزاروں کی تعداد میں ان جنگجوؤں کو مار بھگا یا اور ان کے 50 فیصد رہنما بھی مارے جا چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے سینکڑوں ٹینک اور فوجی گاڑیاں بھی تباہ کر دی گئی ہیں۔ ہم نے عراق اور شام میں ان کی پیش قدمی روک دی ہے اور دو ہزار کلومیٹر فضائی حملے کر کے زمینی افواج نے ان سے سات سو مربع کلومیٹر علاقہ بھی آزاد کرا لیا ہے۔ امریکہ کے فضائی حملوں سے پہلے دولت اسلامیہ کے پاس 91 ہزار کلومیٹر علاقہ زیر قبضہ تھا۔ اس کانفرنس میں آسٹریلیا، برطانیہ، قطر، سعودی عرب، بلجیم، بحرین، ڈنمارک، چین، کینیڈا، ناروے، اردن، نیدرلینڈ، ترکی اور متحدہ عرب امارات، جرمنی اور اٹلی کے نمائندوں نے شرکت کی۔

افسوس ناک بات یہ ہے کہ مسلمان ممالک کو مذہبی تنظیموں سے نجات حاصل کرنے کے لئے بھی امریکہ یورپ کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ امریکہ اپنے مفادات کے لئے ہر ایسا قدم اٹھانے کی پالیسی پر عمل پیرا ہے جس سے مسلمانوں کو کمزور کیا جاسکے یا جس سے مضبوط ہونے والے مسلمان ممالک کی طاقت توڑنے کی منصوبہ بندی پر عمل کیا جاسکے۔ عراق اور شام میں بھی مذہبی طاقتوں کی طاقت توڑنے کے لئے اپنے مخالفین سے بھی ان پر حملے کرانے یا ٹکڑی کرانے سے امریکہ گریز نہیں کر رہا جو بالآخر مسلمانوں کی طاقت پر ہی ایک کاری ضرب ہے۔

سنی شیعہ ممالک کی تقسیم نا اتفاقی کا نتیجہ

عراق، شام، یمن وغیرہ ایسے ممالک میں جہاں مسلمانوں کے دونوں فرقے شیعہ سنی کافی تعداد میں موجود ہیں۔ ایران، عراق اور شام میں کھلم کھلا شیعہ حمایتی

”داعش“ کی ایران کی جانب پیش قدمی کتنا نا ہے۔ ایرانی فوج کے سربراہ نے یہ انکشاف بھی کیا کہ پچھلے سال (2014ء) میں جولائی میں ایرانی فوج اس وقت عراق میں اتاری گئی جب داعش کی ایران کی طرف پیش قدمی کا خطرہ پیدا ہوا تھا۔ دوسری طرف امریکہ کے علاوہ عرب ممالک نے بھی عراق میں ایران کی بڑھتی ہوئی مداخلت پر گہری تشویش کا اظہار کیا ہے۔

دوسری طرف اسی ملک میں ہی مگر دمسلمان داعش کی بیخ کنی کے لئے سرگرم عمل ہیں اور گرد سنی العقیدہ مسلمان ہونے کے ناطے ایران کے بھی سخت مخالف ہیں۔ گویا شام کی طرح عراق میں بھی چار پانچ مسلح گروہ ایک دوسرے کی گردنیں کاٹنے میں مصروف ہیں اور شیعہ سنی فرقوں میں تقسیم ہونے کی وجہ سے عراق کی تقسیم کے خدشات بھی موجود ہیں۔

شام اور عراق میں امریکی کردار

امریکہ پر پاور ہونے کے ناطے دنیا کے ہر خط کے ممالک میں ٹانگ اڑانے کی پالیسی پر ابھی تک گامزن ہے۔ اس کے پٹن پردہ اس کے اپنے سیاسی اور فوجی مفادات ہیں۔ امریکہ ہمیشہ اسی حکومت یا اسی غیر حکومتی گروپ کا ساتھ دیتا ہے جو اس کی ہاں میں ہاں ملاتا نظر آئے۔ امریکی پالیسیوں کی حمایت کرتا دکھائی دے۔ شام میں امریکہ برسر اقتدار بشارة حکومت کے مافیوں کی ہر طرح سے مدد کرتا نظر آ رہا ہے لیکن ساتھ ہی شام اور عراق میں القاعدہ کی طرز پر بستی ہوئی طاقتور تنظیم داعش کے پر کانٹے کے لئے پورے یورپ کے ہمراہ سرگرم عمل ہے۔

امریکہ کے وزیر خارجہ جان کیری نے حال ہی میں برطانیہ کے دارالحکومت لندن میں 21 ممالک کے اعلیٰ عہدیداران کے شام اور عراق میں دولت اسلامیہ کو

کرنے کے لئے اسلامی ممالک میں مداخلت کر کے یا مختلف گروپوں کی حمایت کر کے اپنی طاقت میں اضافہ کر رہا ہے اور اس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ جو کام کئی عرب ممالک نہیں کر سکتے وہ تنہا اسرائیل کے خلاف یہ کام پایہ تکمیل تک پہنچائے گا۔ ایران اتحادی ممالک کی طرف سے سخت اقتصادی اور فوجی پابندیوں کا شکار بھی ہے۔ حال ہی میں امریکہ نے بعض مصلحتوں کے تحت ایران پر یہ پابندیاں نرم کرنے کے علاوہ ایک جوہری معاہدہ کرنے کا بھی عندیہ دیا ہے جس میں ایران کو یورینیم کی افزودگی کی اجازت مل جائے گی لیکن یہ افزودگی اس حد تک ہی ہوگی کہ پُر امن مقاصد کے لئے استعمال کی جا سکے اور اس سے ایٹمی ہتھیار نہ بنائے جاسکیں۔ امریکہ، برطانیہ، چین، جرمنی اور روس ایران کے جوہری پروگرام کو روکنے کے لئے ایک جوہری معاہدہ کر کے اقتصادی پابندیوں کو نرم کریں گے۔

سعودی عرب نے اس ممکنہ معاہدہ پر شدید احتجاج کیا ہے۔ شہزادہ ترکی الفیصل نے متنبہ کیا ہے کہ ایران کے جوہری پروگرام پر معاہدے سے خطے کے دیگر ممالک بھی جوہری ہتھیار حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ اگر ایران کے ساتھ امریکہ کا ایسا کوئی جوہری معاہدہ ہوتا ہے تو سعودی عرب بھی اور پاکستان سے بھی اس فیلڈ میں تعاون حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ ایران غالباً اس غلط فہمی کا شکار ہے کہ وہ اپنی فوجی اور جوہری طاقت مضبوط بنا کر اسرائیل کے مقابل آن کھڑا ہوگا۔ یہ اس کی بھول ہوگی۔ امریکہ سرکار یہ سارا کچھ ایران کو عرب ممالک کے مقابل کھڑا کرنے کے لئے کر رہی ہے کیونکہ تقریباً سارے عرب ممالک میں شیعہ سنی کا مسئلہ کھڑا کر کے عربوں اور ایران کے درمیان فرقہ واریت کے نام پر ایک نازک اور دبے ہوئے مسئلے کو چنگاری دے کر آگ لگادی گئی ہے جو مسلمانوں کو ان کے ممالک میں مسلمانوں

گروپوں کی حمایت کر رہا ہے یا براہ راست جنگ میں ملوث ہے۔ ایسے نازک وقت میں جبکہ اسلام دشمن عناصر مسلمان کو مسلمان سے لڑا کر اپنے مذموم عزائم حاصل کرنے کے لئے سرگرم عمل ہیں۔ مسلمانوں میں شیعہ سنی کی تفریق میں تقسیم ہو کر ایک دوسرے کے خلاف جنگ و جدل کرنا مسلمانوں کی تھوڑی بہت طاقت کو مزید پارہ پارہ کر دے گی۔ افسوس کا مقام ہے کہ سعودی عرب، یمن، ترکی بھی سنی مسئلہ پر ایک ہو چکے ہیں اور ان معاملات پر ان ممالک کا پاکستان سے بھی رابطہ ہے۔

حالات کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمان ممالک کسی دوسرے مسلمان ملک میں کسی قسم کی مداخلت نہ کریں اور ان ممالک کو اپنے داخلی مسائل خود ہی حل کرنے دیں۔ ہاں ثالثی کے طور پر یا مسلمان ممالک میں خانہ جنگی روکنے کے لئے ان ممالک کو اپنا کردار ادا کرنا چاہئے۔ حالات اس حد تک پہنچ چکے ہیں کہ سعودی فوج کو یمن کے باغیوں کے قلع قمع کے لئے بھی یمن میں فوجی کارروائی کرنا پڑ رہی ہے جس میں مسلمان ممالک کا الیہ ہے کہ چند سر پھرے مذہبی گروہ شریعت کا نعرہ لگا کر عسکری کارروائیوں کا آغاز کر دیتے ہیں اور یہ کارروائیاں ملک کے تمام عوام کو ایک دوسرے سے برسرِ پیکار کر دیتی ہیں اور لاکھوں کی تعداد میں مسلمان آپس میں لڑ کر ہی بے سوت مارے جاتے ہیں۔ القاعدہ، طالبان، داعش، حزب اللہ اور اس قسم کی تنظیمیں آپس کی لڑائی میں اسلام دشمن قوتوں کا کام آسان کر رہی ہیں۔ جو کام ان طاغوتی طاقتوں کو کرتا چاہئے وہ ہم ”مسلمان“ اپنے ہی ہاتھوں اللہ سے کر اپنی تباہی کا خود سامان پیدا کر رہے ہیں۔

ایران امریکہ ممکنہ ایٹمی معاہدہ

ایران عرصہ دراز سے امریکہ کا خطے میں سب سے بڑا مخالف شمار کیا جاتا ہے اور اپنے تئیں اسرائیل کا مقابلہ

کے ہاتھوں ہی مجسم کر رہی ہے۔

95 فیصد مسلمان ہی دہشت گردی کا شکار ہوئے

امریکی حکومت کے قومی انسداد دہشت گردی کے ادارے (این سی ٹی سی) نے 2011ء میں جو رپورٹ پیش کی اس کے مطابق دنیا میں 95 فیصد مسلمان ہی دہشت گردی کا شکار ہوئے۔ گزشتہ پانچ سالوں میں ہلاک ہونے والے 82 سے 97 فیصد مسلمان ہی ہیں 2004ء سے 2013ء کے درمیان ہونے والے تمام دہشت گرد حملوں میں سے نصف حملے عراق، افغانستان اور پاکستان میں ہوئے اور 60 فیصد ہلاکتیں بھی ان تینوں ممالک میں ہی ہوئیں۔ البتہ ان ممالک میں مرنے والے 95 فیصد مسلمان ہی ہیں۔

یمن میں ایران اور سعودی عرب آمنے سامنے

یمن سعودی عرب کا ہمسایہ ملک ہے ساتھ ہی ایران کی سرحدیں بھی اس سے ملتی ہیں۔ یمن کے جنوبی علاقہ میں حوثی قبائل آباد ہیں جو شیعہ مسلک کے پیروکار ہیں۔ شروع میں کافی عرصہ تک شیعہ مسلک کے پیروکاروں کے ہاتھوں میں یمن کی عتبات حکومت تھی لیکن اب گزشتہ کئی برسوں سے غیر شیعہ مسلک کے حامی افراد برسر اقتدار ہیں جن کو اقتدار سے ہٹانے کے لئے حوثی قبائل نے مسلح جدوجہد شروع کر رکھی تھی جو کھلی جنگ میں تبدیل ہو چکی ہے۔ شیعہ مسلک کی وجہ سے ایران حوثی قبائل کی بھرپور مدد کر رہا ہے۔ دوسری طرف برسر اقتدار حکومت نے ان جنگجوؤں سے بچنے کے لئے سعودی عرب سے مدد طلب کی ہے اور سعودیہ نے بھی مسلح دستے یمنی حکومت کو بچانے کے لئے بھیج دیے ہیں۔ اسی اثناء میں سعودی حکومت نے پاکستانی حکومت سے بھی صورت حال کی سنگینی کی وجہ سے فوجی مدد کی درخواست کی ہے۔

ISO 9001:2008

النورین

رجسٹرڈ

النور الیکٹرک انڈسٹریز 75-B، سال انڈسٹریز اسٹیٹ، جی ٹی روڈ گجرات

053-3530447 , 0300-9702203 , 0345-6333393

<http://www.alnoorfans.com>

چھوڑ رکھی۔ یمن، عراق، شام، تونس، بحرین، مصر ایسے ہی نازک حالات سے دوچار ہیں۔ سعودی عرب میں بھی وقتاً فوقتاً جمہوری حقوق کی آڑ میں ایسے فتنوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی لیکن وہاں کی حکومت نے کمال حکمت عملی سے ان ہتھکنڈوں کو جس سے ملک کا سارا نظام درہم برہم ہو کر رہ جائے، ناکام بنا کر رکھ دیا۔

پاکستان میں مذہبی انتہا پسندوں، قوم پرستوں اور سیاسی گمراہوں کی صورت میں اور فرقہ واریت کے مسئلوں کو ابھار کر عرصہ دراز سے ایسے حالات پیدا کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ مسلمانوں کے گلے مسلمان ہی کاٹ رہے ہیں تاکہ اس ملک میں امن و امان قائم نہ ہو سکے۔ ہم دھماکوں اور ٹارگٹ کلنگ کا نشانہ معصوم عوام بنتے رہے۔ شیعہ سنی کے مسئلہ کی وجہ سے بھی شہریوں کی گردنیں کٹتی رہیں حتیٰ کہ انتہا پسندوں کے معصوم طلباء کو خون میں ڈبو کر کی گئی۔ قوم پرستی کے نام پر اس ملک کے عوام کے خون سے ہی ہولی میل جا رہی ہے۔ سیاست کے نام پر اپنے مخالفین کو راستے سے ہٹانے لیکن اصل میں ملک دشمن عناصر کے مذموم عزائم کی تکمیل کے لئے 150،

200 افراد کو قتل کر کے ملک کے سب سے بڑے کاروباری شہر کراچی میں خانہ جنگی کی کیفیت پیدا کرنے کے پیچھے مسلمانوں کو آپس میں لڑانے اور تقسیم کرنے کا ایجنڈا ہی کارفرما تھا لیکن انہی طاقت کے حامل 18 کروڑ افرادی قوت رکھنے والے دنیا کے اہم ترین مسلم ملک پاکستان کو بچانے کے لئے عوام الناس کے تعاون سے پاکستانی فوج نے ملک و قوم کو محفوظ رکھنے کے لئے ہر قسم کے مذہبی، سیاسی، فرقہ واریت، قوم پرستی میں موٹ دہشت گردوں کے خلاف جو تاریخی آپریشن شروع کیا ہے اس نے ملک دشمن عناصر کے عزائم کو خاک میں ملا کر رکھ دیا ہے۔



وزیراعظم نواز شریف نے اس سلسلے میں سعودی عرب کے دفاع کے لئے پاکستانی فوج سمیت ہر ممکن امداد کا عندیہ دیا ہے لیکن یمن میں پاکستانی فوج بھیجنے کے بارے میں کوئی واضح فیصلہ نہیں کیا جا سکا۔ بہتر تو یہی ہے کہ یمن کی صورت حال وہاں کا اندرونی مسئلہ ہونے کی وجہ سے وہاں کے عوام خود ہی بنائیں تو بہتر ہوگا یا چند اہم ممالک کے علاوہ جید علمائے کرام کو درمیان میں ڈال کر مسئلے کا حل امن و سکون سے کیا جا سکتا ہے تاکہ طرفین کی عداوت کرنے والے ممالک کی طاقت تقسیم نہ ہو سکے بصورت دیگر لڑائی کی صورت میں دونوں کی اطراف مسلمانوں کا ہی نقصان ہوگا۔ بہر حال سعودی عرب نے 1915ء، 1934ء کی جنگ کے علاوہ 1998ء میں انہی دھماکے کے بعد پوری دنیا کی طرف سے پاکستان کی امداد بند کرنے کے باوجود ہر طرح سے پاکستان کی مالی مدد کی اور اربوں روپے کا تیل بھی مفت فراہم کیا۔ درختوں و سیلاب میں بھی سعودی عرب نے پاکستانی عوام کی ریلیف دے دی اور اس پر آئے مشکل وقت میں پاکستانی قوم اپنے سعودی بھائیوں کے شانہ بشانہ کھڑی ہے۔

پاکستان اور سعودی عرب میں خانہ جنگی کی کوشش

چند سال کے عرصہ میں خصوصاً نائن الیون کے بعد دنیا کے اہم مسلمان ممالک کو دہشت گردی کی آڑ میں جس جہس کر کے رکھ دیا گیا۔ عراق اور افغانستان اس کی بڑی مثال ہیں۔ باقی ممالک میں ان التفری، لاقانونیت، مختلف مذہبی اور عسکری گروپوں کی صورت میں خانہ جنگی کی ہی کیفیت پیدا کر دی گئی ہے تاکہ مسلمان منظم ہو کر ایک مضبوط قوت بننے کی بجائے آپس کے جھگڑوں میں الجھ جائیں۔ شریعت کے نفاذ کے نام نہاد دعوے داروں، قوم پرستوں، فرقہ واریت کے مسئلوں کو ابھارنے والوں نے مسلمانوں کا شیرازہ بکھیرنے میں کوئی کسر نہیں

”ہم ایسی کل کتابوں کو قابل مضبوطی سمجھتے ہیں“

☆ سید بدر سعید

متحدہ علما بورڈ 17 برس میں بھی مذہبی منافرت پھیلانے والی کتب کی اشاعت نہ روکا سکا

○ پاکستان میں فلم تو سنسر بورڈ سے منظور ہوتی ہے لیکن کتاب ویسے ہی چھاپ دی جاتی ہے

○ 1997ء سے متحدہ علما بورڈ کے قیام کے باوجود مارکیٹ میں نفرت اور فرقہ واریت پر مبنی کتب کی بھرمار ہے۔

○ ذمہ داروں نے 17 برس میں صرف 287 کتب پڑھیں

○ چند معروف مذہبی شخصیات کی کتب پر بھی پابندی لگائی جا چکی ہے

○ متحدہ علما بورڈ کی تشکیل سے قبل شائع ہونے والی ناقابل قبول کتاب کو دائرہ کار سے باہر قرار دیتے ہوئے پابندی نہیں لگائی گئی

○ اسلام کے خلاف پراپیگنڈا کرنے والے غیر مسلم ایسی کتب کے حوالے دیتے ہیں جن میں ضعیف احادیث اور ناقابل یقین روایات شامل ہوں

○ ہمارے ہاں مذہبی منافرت اور توہین آمیز لٹریچر کی روک تھام کے لئے ترتیب دیا گیا نظام بڑی خامیوں کا شکار ہے

○ 1997ء سے 31 دسمبر 2014ء تک صرف 63 کتب و رسائل پر پابندی لگائی گئی

اس میں دورائے ہیں کہ پاکستان میں فرقہ واریت کے نام پر ہونے والے فساد عبادت گاہوں پر حملے اور علماء کرام کی مارگٹ کلنگ کی تحریک میں اشتعال انگیز تقاریر، سی ڈیز اور کتب کا بڑا ہاتھ ہے۔ سانحہ پشاور کے بعد وطن عزیز میں دہشت گردی کے خلاف واضح فیصلہ کن اقدامات شروع ہوئے ہیں۔ اس بار دیگر اقدامات کے ساتھ ساتھ مذہبی منافرت پھیلانے والے لٹریچر اور اشتعال انگیز تقاریر کے خلاف بھی بھرپور ایکشن لیا جا رہا ہے۔

اگر دیکھا جائے تو مذہبی منافرت پھیلانے والا لٹریچر اور تقاریر ہی فرقہ واریت کے فروغ کا باعث بنتی ہیں اور ایسی ہی حد سے برین واشنگ کی جاتی ہے۔ حکومت کی جانب سے 1999ء میں ہی متحدہ علماء بورڈ بنا دیا گیا تھا جو کتب و رسائل وغیرہ کا جائزہ لیتا ہے اور اپنی سفارشات دیتا ہے۔ اس بورڈ کی سفارشات پر ہی ایسی کتب پر پابندی عائد کی جاتی ہے۔ لیکن فکر یہ یہ ہے کہ 1997ء سے ایسا اہم بورڈ تو موجود ہے لیکن اس کے باوجود مارکیٹ میں ایسی کتب کی بھرمار رہی جو مذہبی منافرت کی فروغ دیتی ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے 1997ء سے لے کر 31 دسمبر 2014ء تک متحدہ علماء بورڈ پنجاب نے صرف 287 کیسز (کتب) برقی سفارشات پیش کی ہیں۔ ان میں سے 2009ء تک 63 کتب کو تو بن آمیز کتب قرار دے کر ان کے خلاف کارروائی کرنے اور ضبط کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ یہاں سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا 17 برس میں صرف 287 کتب شائع ہوئی ہیں؟ اگر ایسا نہیں ہے اور 17 برس میں اس سے کہیں زیادہ کتب شائع ہو چکی ہیں تو پھر ان کا جائزہ کون لے گا؟ یاد رہے کہ ان 287 سفارشات میں سی ڈیز بھی شامل ہیں جو زیادہ تر ایسے بیانات اور خطاب پر مشتمل ہیں جو انتہا پسندی یا مذہبی منافرت کو فروغ دیتے ہیں۔ علماء بورڈ کی ان سفارشات میں متعدد

پاکستان میں فرقہ واریت اور مذہبی منافرت کی وجہ سے ہر سال درجنوں افراد قتل کر دیئے جاتے ہیں۔ تو بن آمیز کتب اور مذہبی منافرت کو ہوا دینے والی کتب، رسائل اور بیانات کی سی ڈیز کی خرید و فروخت کھلے عام ہوتی ہے۔ دوسری جانب 17 برس قبل ہی متحدہ علماء بورڈ تشکیل دیا گیا تھا تاکہ ایسے لٹریچر کی نشاندہی کی جائے۔ بد قسمتی سے اب تک کی کارکردگی کا جائزہ لیں تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ بورڈ مکمل ایمانداری سے اپنا فرض ادا نہیں کر پایا۔ چند کتب پر پابندی لگائی گئی ہے لیکن ایسی کتب میں جن بنیادی کتب کے حوالے دیئے جاتے ہیں انہیں نظر انداز کر دیا گیا۔ پاکستان کے عوام کے لئے تو شاید یہ بھی حیرت کا باعث ہو کہ 1997ء سے علماء کا ایسا بورڈ کام کر رہا ہے جو مذہبی منافرت پر مشتمل لٹریچر اور سی ڈیز کی نشاندہی کر کے سڑاؤں کی سفارشات پیش کرتا ہے۔

پاکستان طویل عرصہ سے دہشت گردی کی لپیٹ میں ہے۔ شیعہ سنی فسادات جس حد تک گئے وہ ہمارے سامنے ہیں۔ مسلکی بنیادوں پر بننے والے عسکری گروپوں نے ایک دوسرے کے خلاف ایک ایسی فضا پیدا کر دی تھی کہ پاکستان کی دیواروں پر ”کافر کافر“ کے نعرے تک لکھے نظر آئے۔ اسی طرح مخالف فرقہ کی مساجد اور امام بارگاہوں پر حملے معمول کی بات بن گئی تھی۔ چند بڑے گروہوں کے سربراہوں کی ہلاکت اور گرفتاریوں کے بعد کسی حد تک صورت حال پر قابو پا لیا گیا اس کے باوجود حال یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ پاکستان سے فرقہ واریت کا مکمل خاتمہ کر دیا گیا ہے۔ گزشتہ سال بھی شیعہ سنی اختلافات قتل و غارت تک نظر آئے۔ علماء کرام کی مارگٹ کلنگ معمول کی بات ہے۔ مخالف فرقہ کے خلاف زہر اگل کر شہرت حاصل کرنا ایک خاص طبقہ کے لئے ”شارٹ کٹ“ بن گیا ہے ایسے افراد ہر مسلک میں نظر آتے ہیں۔

درد و شریف پڑھنے کی فضیلت

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا میں نے دربار رسالت میں عرض کیا۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر کثرت سے درود شریف پڑھتا ہوں (یا کثرت سے پڑھنا چاہتا ہوں) تو کتنا پڑھوں؟ فرمایا تو جتنا چاہے پڑھ۔ میں نے عرض کی جو تھا حصہ درود شریف پڑھ لیا کروں؟ تو فرمایا جتنا چاہے پڑھ اور اگر اس سے بھی زیادہ کرے تو تیرے لئے بہتر ہے۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ اگر زیادہ کرنے میں بہتری ہے تو میں نصف حصہ درود شریف پڑھ لوں؟ فرمایا اگر اس سے بھی زیادہ کرے تو تیرے لئے بہتر ہے۔ عرض کی دو تہائی درود پڑھ لیا کروں؟ فرمایا تیری مرضی اگر اس سے زیادہ کرے تو تیرے لئے بہتر ہوگا۔ عرض کی۔ اے آقا! تو میں سارا وقت ہی درود نہ پڑھ لیا کروں؟ یہ سن کر رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر تو ایسا کرے تو تیرے سارے کام سنور جائیں گے اور تیرے سب گناہ بخش دیئے جائیں گے۔

(ترمذی شریف، مشکوٰۃ شریف)

ماضی کے حالات دیکھیں تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے یہ سب وقتی دباؤ کے تحت کیا جا رہا ہے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ متحدہ علماء بورڈ کو مزید فعال کیا جائے۔ اسی طرح ایسا نظام ترتیب دیا جائے جس میں یہ ممکن ہو کہ جولٹریچر شائع ہو وہ اس بورڈ کی اجازت سے شائع ہو۔ اس سلسلے میں مخصوص وقت کا بھی تعین کیا جائے تاکہ علماء بورڈ بھی لا پرواہی کی بجائے مقررہ مدت میں اپنی سفارشات پیش کرنے کا پابند ہو۔ ہمارے ملک میں فلم تو سنسر بورڈ سے پاس کرائے بغیر سینما میں نہیں چل سکتی لیکن نفرت کے جج بونے اور قتل عام پر

کتب، رسائل و جرائد کے بارے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان پر پابندی کی ضرورت نہیں۔ اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ 17 برس میں پیش کی جانے والی یہ سفارشات صرف تو چین آئیز مواد پر مشتمل رسائل و جرائد پر مبنی نہیں بلکہ ان میں ”کل کتب“ کا احاطہ کیا گیا ہے۔

مجھے موصول ہونے والی فہرست میں آیت اللہ سید عبدالحسین شرف الدین، علامہ احسان الہی ظہیر، مولانا یوسف رضوی نو کے والی سرکار، کوکب نورانی اوکاڑوی، لاہور گرامر سکول اور عبدالستار خان نیازی سمیت دیگر افراد کے نام شامل ہیں جن کی مخصوص کتب اور سی ڈیز کی ضبطی یا مزید اشاعت کی حوصلہ شکنی کی سفارش کی گئی ہے۔ اسی طرح ایک کتاب پر یہ کہتے ہوئے پابندی عائد نہیں کی گئی کہ ”اس کا طرز تحریر منافرت آئیز ہے لیکن چونکہ یہ کتاب 1997ء سے قتل کی شائع شدہ ہے۔ اس لئے بورڈ اس پر پابندی عائد نہیں کرتا البتہ مزید اشاعت کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے۔ یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا جو ناقابل قبول کتاب متحدہ علماء بورڈ کی تشکیل سے قتل شائع ہوئی۔ اسے پابندی سے باور قرار دیا جاسکتا ہے؟ اگر باریک بینی سے جائزہ لیا جائے تو ہمیں اس سارے نظام میں کئی خامیاں اور ایسے سقم نظر آتے ہیں جو باقاعدہ تشریح ہیں۔

سانحہ پشاور اور اکیسویں کریم میں ”مذہب“ کی وضاحت کے بعد بڑا کریک ڈاؤن شروع ہو چکا ہے۔ اشاعتی ادارے خصوصاً مذہبی کتب شائع کرنے والے کئی پبلشرز کی دکانوں اور گوداموں پر چھاپے مارے گئے اور کچھ کو گرفتار بھی کیا گیا ہے۔ دیر آید درست آید کہتے ہوئے ہم اس سارے عمل کی تعریف کرتے ہیں۔ پاکستان سے مذہبی منافرت اور فرقہ واریت کے نام پر قتل و غارت کا سلسلہ ختم کرنے کے لئے تو چین آئیز رسائل و جرائد سمیت سی ڈیز پر سختی سے پابندی عائد کرنا بہت ضروری ہے۔ دوسری جانب موجودہ صورت حال اور

اکسائے والی کتابیں با آسانی شائع کر دی جاتی ہیں۔ اسی طرح یہ بات بھی زیر غور لائی جانی چاہیے کہ مذہبی منافرت اور توہین آمیز کتب پر پابندی مسائل کا حل نہیں ہے۔ ہمارے ہاں اپنے مخصوص نظریات کا پرچار کرنے کیلئے ضعیف احادیث اور ناقابل یقین روایات کو یکجا کر کے بھی لٹریچر چھاپا جاتا ہے۔ ایسا لٹریچر ہی اسلام کے خلاف لکھی جانے والی کتب میں ”حوالہ“ کے طور پر شامل کیا جاتا ہے۔

اس کے لئے علما کرام کا گریڈ بورڈ تشکیل دیا جائے جو مکمل تحقیق کے بعد ناقابل اور غیر مستند روایات کی نشاندہی کرے اور ان کی اشاعت پر بھی پابندی عائد کی جائے۔ مکمل گھرائی کے لئے نہ صرف علما کرام کے بورڈ کی وسعت دی جاسکتی ہے بلکہ مذہبی کتب شائع کرنے والے اداروں کو بھی پابند کیا جاسکتا ہے کہ وہ ذاتی طور پر بھی اپنی کتب کے معیار کو برقرار رکھنے کے لئے کسی مستند عالم دین کی خدمات حاصل کریں۔ یہ کتب اس عالم دین کے جاری کردہ اجازت نامے کے ساتھ متحدہ علما بورڈ کو بھیجی جائیں ان معاملات میں شفافیت لانے کے لئے علما کرام کے ساتھ ساتھ اردو بازار سے متعلقہ تاجروں اور پرنٹر پبلشرز سے بھی بھرپور مشاورت کی جانی چاہیے۔ ہنوبھاد پکڑ دھکڑ کی بجائے ایک مکمل سسٹم وضع کرنا بہت ضروری ہے۔ جب تک اس ”علما سنسر بورڈ“ میں اصلاحات نہیں لائی جائیں گی اور ان کی کارکردگی بہتر نہیں ہوگی تب تک کتب فروش گرفتار ہونے تک توہین آمیز لٹریچر بازار میں نظر آتا رہے گا۔

(تحقیقاتی صفائی سید بدر سعید کی یہ تحریر ”نوائے وقت“ گروپ کے تحت مفت روزہ ”جلی میگزین“ میں شائع ہوئی تھی جسے اس کی اہمیت کے پیش نظر ادارے کے شکر یہ کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے)

طاہرہ

قیمت 120 روپے

یہ ناول بیٹی کے جہیز میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔

خاک کی مدد کی لالہ

دو حصے قیمت 270 روپے

اس کہانی میں آپ پاکستان کی سیاست اور معاشرت کے ذہنی چھپے گوشوں کو بے نقاب ہوتا دیکھیں گے۔ اب بڑے سائز میں خوبصورت رنگین تصاویر کے ساتھ گتے کی مضبوط جلد میں پیش کیا جاتی ہیں۔

بی آری مہتری رے گی

محترم عنایت اللہ کی جلی جلی نگاری کا شاہکار۔ ایک بہادر جرأت مند اور وطن پرست قوم کا افسانہ جو افسانہ نگار اور حقیقت زیادہ سے زیادہ ہے۔

ایک نکتہ حضرات اور قارئین کتاب منگوانے کے لئے خط لکھیں آدھا ڈاک خرچ ہم کریں گے

مکتبہ داستان



انا کی دھول سے بھری آنکھیں جب دھول میں مل جاتی ہیں تو درازہ کھلا ہے۔

منا ابدال پلا

ابھی طے نہیں ہوا کہ برتن پہلے بنتا ہے یا اس کا من میلا ہو، اندر بندے کے دل پہ دھسے ہوں۔ تو بندے سے اچلے کام نہیں ہوتے۔ وہ بندہ اسی الجھن میں الجھا رہتا ہے کہ ”اسے نہیں چھوڑنا“۔ ”اس سے بدلہ لینا ہے۔“ ”اس کی گردن دوپہتی ہے۔“ اس کی ناک رگڑنی ہے، اس کی رگڑوانی ہے۔“ یہ کرتا ہے، وہ کرتا۔ چھوڑنا نہیں۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دینا ہے۔ معاف نہیں کرتا۔“

یہ سب من کے میل کی مختلف صورتیں ہیں۔ اس من جملے کے لاکھ چہرے ہوں۔ چہروں پر ”ظہیر اینڈ لولی“ یا اسی قبیل کی کوئی بھی گورے پن کی کریم استعمال ہوئی ہو۔ لوشن لگا ہو۔ ڈیپ سکن کلیئر لگ چاہے وہ کرا آئے۔ تھریڈنگ کرا لے، چاہے سمندر پار جا کر یہ ہوی نہیں سکتا کہ کوئی اندر سے میلا ہو، اوپر سے اجاڑ کھے۔ لیکن عام آنکھ دھوکا کھا سکتی ہے۔ عام آنکھیں جنہوں نے کبھی کسی سندر من والے کے دل کی جگہ کرتی بتیاں نہ دیکھی ہوں اور آنکھوں کے اندر جیتے انسان کے من کا سکھ نہ دیکھا ہو، نہ جیا ہو۔

مالک کونت نے اندیشے اور وسوسے دیتی رہتی ہے۔ وہ بیخاسر پختا رہتا ہے۔

اسے ہر کام میں دوسرے کی شرارت نظر آتی ہے۔ کبھی وہ بڑوسیوں سے غصہ کرتا ہے۔ کبھی قریبی عزیز داروں سے، کبھی اسے گھروالوں سے شکایت ہوتی ہے۔ کبھی دفتر والوں کے خلاف باتیں کرتے نہیں وہ مکتا۔ اسے ہر حکومت بری لگتی ہے۔ حکومتی کارندوں سے اسے خدا واسطے کا بیر ہوتا ہے۔ کوئی نہ کوئی ضرور اس نے ولن بنا کر رکھا ہوتا ہے۔ اکثر لوگوں نے تو ایک نہیں کئی کئی ولن بنا کر اپنی جان پر حاوی کئے ہوتے ہیں۔

بات صرف اتنی ہوتی ہے کہ اطمینان کی کھوٹی سے اس کی روح اتری ہوئی ہوتی ہے اور وہ بے چین بھنگی ہوئی اس کی روح اس کے پورے وجود میں جانے بناتے پھرتی رہتی ہے۔ ایسے بندے کی ساری زندگی یونہی وسوسوں میں جیتے، وسوسوں کو پھیلاتے گزر جاتی ہے۔

ایک دن اس کا جسم اس کی روح سے علیحدہ ہو جاتا ہے۔

جالا ہائی مکزی اڑ جاتی ہے۔

دکھ کے اللہ میں جلتی جلائی آگ بھی اس وقت ایک طرف سرک جاتی ہے۔ یہ روح کا حصہ ہوتی ہے۔ روح کے ساتھ ہی چلی جاتی ہے۔

اسی حالت میں کوئی جانے والا مطمئن تھا تو روح مطمئن رہتی ہے۔

کوئی دیکھی روح تھی تو دکھ روح کا حصہ بن کر رہنے لگتا ہے۔

جسم بڑی فالتوسی چیز ہے۔ یہ مٹی کا بنا ہوتا ہے۔ مٹی کا ڈھیر مٹی میں پڑا رہ جاتا ہے۔

جو بھی ساری عمر زمین پہ اکڑ کر چلا۔ زمین کا کیا بگاڑ لیا۔

ہاتھ کیا آیا اس کے؟ کچھ بھی نہیں۔

اللہ کی قربت

اللہ کی قربت کا بہترین راستہ عاجزی ہے۔ ایک بیٹھا بول، اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے دکھ ہو۔ درخت اپنے پھل سے اور انسان اپنے قول و فعل سے پہچانا جاتا ہے۔

ایسی آنکھیں کیا کریں۔ ان کی اپنی مجبوریاں ہیں۔ وہ ظاہری بت قد، رنگ روپ اور نظر آتی شان و شوکت سے دھوکا کھا جاتی ہیں۔ ایسی ہی آنکھیں دھوکا بھی دیتی ہیں۔ اس میں سارا کمال آنکھ کا نہیں ہے۔

آنکھ کے اندر جھانک کے من کے پالے کو دیکھنے کا ہے۔

اب آنکھ کی پتلی کے اندر سے ہر ایک ٹھنڈی دھڑکی کے من تک جاتی ہے۔ کہنے کو دل و جان، جسم و روح کی زندگی سے دیتے ہوئے ایک ہی کھڑکی ہے۔

آنکھ کا دروازہ۔

ان کھڑکیوں سے کسی کو اندر جھانکنے کی قوت، طاقت اور توفیق مل جائے تو اس سے کچھ بعید نہیں چھپتے۔ اندر کی ساری کھڈا سے سمجھ آئے لگتی ہے۔

کسی کو غور سے دیکھو۔ آنکھوں کے اندر سے۔

اس کے دل میں مکزی کی طرح وسوسوں نے حال بنا ہوا ہے۔

خود اس نے اپنی روح کو مکزی بنا کر جسم و جان کے ایک کونے میں پھینکا ہوا ہے۔ وہی قیدی، پالی ہوئی اپنی اتا سے، بے چاری مکزی رورو کے اپنے لئے رستے بناتی رہتی ہے۔ کہنے کو ہمیں وہ دھماکے دکھتے ہیں۔ انہی دھماکوں سے وہ مکزی آتی جاتی ہے، اس جسم و جان کے

فرمانِ رسولؐ

میں تمہیں اس آدمی کی پہچان بتاتا ہوں جس پر جہنم کی آگ حرام ہے اور وہ آگ پر حرام ہے۔ یہ وہ آدمی ہے جو نرم مزاج، نرم طبیعت اور خوش اخلاق ہوگا۔ (ترمذی)

نہ اس بات کی پرستش نہ داتے ہیں۔
وہ تو سر عام دوسروں کی جے جے کار کھتے ہیں۔ اپنا
آپ مار کے دوسروں کو زندہ رکھتے ہیں۔
یہ فلاں یا تلوگ ہوتے ہیں۔
یہ اندر سے اچلے لوگ ہوتے ہیں۔
اچلے اور میلے بندے کی اگر ابھی بھی سمجھ نہیں آتی
تو۔ سنو!

اندر سے میلا آدمی زمانے بھر کی ہر چمکتی اعلیٰ نظر
آتی شے چمیں کے صرف اپنے گھر میں بھرے گا۔ وہ
صرف اپنے پیٹ کو پالنے کے لئے ہوتا ہے، ایسے نفس کی
صحت عموماً بڑی قابلِ رشک ہوتی ہے۔ دو تین آدمیوں
کے برابر اس کی خوراک ہوتی ہے۔ اس کا گھر بھی بڑا سا
ہوگا، ہوگا بھی کسی مہنگے محلے میں۔ اس کی گاڑی چوڑی بھی
ہوگی اور اس کا ہارن بھی بڑا کرخت ہوگا۔ وہ پاؤں پھیلا
کے بیٹھے گا۔ زمین پہ زور دے گا۔ اس کی گفتگو بڑی عامیانہ ہو
گی۔ گالیاں دینے کو وہ نکیہ کلام کہہ کے ٹال دیتا ہوگا۔ اس
کے کان بڑے موثر ہوتے ہیں۔ جہاں کہیں اسے اپنے
منافع کی بات دکھائی دے گی۔ وہ ادھر سرک جائے گا۔
ایسے شخص کی نہ دوستی چکی ہوگی نہ دشمنی۔

وہ صرف اپنی ذات کا دوست ہوتا ہے۔

دوست بھی اندھا۔

اس لئے کہ اس کی ذات کی آنکھیں نہیں ہوتیں۔

”ہاں اگر دوسو سے اور اندھے نہیں ہیں تو سکون رہ
گیا۔ سکون رہ جائے تو سکون سے بائٹھا چاہئے۔
کہنے کو ان دوسو کے جالے بنتی دھکی، زمین پہ
اکڑ کے چلنے والی ہستیوں اور ان کی روجوں کے لاکھ مسئلے
سہی۔ کوئی اسے ذاتی پر ابلم کہے گا کوئی غیر ذاتی مسئلہ۔
اصل میں ان کے اندر چلنے والی ٹکڑی جب ”انا“ کی
نا جائز پردش سے مونے دھاگے بنانے لگتی ہے تو مسئلے
پیدا ہوتے ہیں۔ خود بھی برس برس کی خود پرستی سے اس
نے اپنی ذات پہ ایسا رنگ و روغن چڑھایا ہوتا ہے کہ اسے
”اپنی ذات“ کی اصل شکل تو نظر نہیں آتی۔ اپنی ”انا“
کی ٹکڑی ہوئی صورت ہی دکھتی رہتی ہے۔ ٹکڑی انا
بندے کو معاشرے میں رہتے ہوئے بھی اکیلا کر دیتی
ہے۔

شہر اور بستیوں سے دور لے جائے کسی دیوان غار
میں جا بٹھاتی ہے۔

نتیجتاً بندہ، بندے سے کٹ جاتا ہے، علیحدہ
الگ، اس میں اجتماعی سوچ نہیں ہوتی۔ ذاتی مفاد کے
بھرے غریب اور ذاتی انا کا سانپ رہ جاتا ہے۔
معاشرے کے دکھوں کو سوچتا اور ہوتا ہے۔

دوسروں کے غموں کو اپنا غم بنانا اور طرح کا کام
ہے۔ بڑا مقدس کام ہے یہ۔

اس قسم کے رفاہی اور اعلیٰ نسل کاموں میں انسان
کے اندر کی ”انا“ کمزور ہوتی ہوئی غائب ہو جاتی ہے۔
پھر وہ ”مٹو“ کے فقرے پہ کام کرتا ہے۔ اسے اپنے پیٹ
بھرنے کی فکر نہیں ہوتی۔ دوسروں کا بھلا چاہنے سے اسے
سکھ ملتا ہے۔ اسے خود اپنی منزل کی طرف دوڑ لگانے کی
ضرورت نہیں پڑی ہوئی۔ وہ پکڑ پکڑ کے دوسروں کو ان کی
منزلوں پہ پہنچاتا ہے۔ ایسے لوگ سکھ لوگ ہوتے ہیں۔
وہ نہ شکوہ کرتے ہیں نہ شکایت۔

”وہ انا کا بت نہیں بناتے۔“

پسندیدہ زمین پر لاکھ گھنٹوں کے بل گراتا ہے۔
یہ سب باتیں تو ہو گئیں ان کے لئے جنہیں اپنی
ذات کے علاوہ دوسروں کے غم، دکھ، درد نظر نہیں آتے۔
جنہیں اپنے سے کم تر لوگوں پر رحم نہیں آتا۔ مگر خدا کی
بنائی، سچائی یہ ہستی بڑی منظم ہے۔ یہاں ایک ”دکھ کو فتح“
کرنے والا لاکھوں کے دکھی دلوں کو فتح کر لیتا ہے۔
صرف اتنی سی بات سے کہ وہ اپنے من کا سارا میل،
سارے دھبے نکال کے دوسروں کے سامنے رکھ دیتا ہے۔
خود کو دھول گھاٹ پہ لے آتا ہے اندر باہر سے اس کی
دھلائی ہوتی ہے۔ جب اسے اگلے من کی نعمت مل جاتی
ہے تو وہ اس کی آنکھوں میں اچلی، روشن اور پوتر خیر اثر
آتی ہے۔ پھر اس کی یہی اپنی آنکھیں ہر طرف خیر پانٹنے
پہ مامور ہو جاتی ہیں۔

جدھر وہ نگاہ اٹھا کے دیکھتا ہے خیر کا ہونا نکل آتا
ہے۔

امید کے باغ لگ جاتے ہیں۔

شہر آباد ہو جاتے ہیں۔

ملک منور جاتے ہیں۔

ایسے ہائے آج بھی ہر گلی، ہر محلے میں ہیں، آپ
غور سے دیکھیں، وہ نگہ نیچی کئے، اپنے میلے پن کو یاد
کرتے کرتے قدم اٹھاتے ہیں۔ شرمندہ شرمندہ۔ کسی کی
طرف اس لئے دیکھنے سے ستراتے ہیں کہ کوئی ناچاہتے
ہوئے بھی اپنی حاکمیت کے راج پہ لکھی اچلے پن کی ان کی
راجیہ نہ پڑھ لے۔ ان اچلے لوگوں کو سن کا اجلا پن بھی
توفیق الہی سے ملتا ہے جو مانتا ہے اسے دیا جاتا ہے۔ انا
کی وصول سے بھری آنکھیں جب وصول میں مل جاتی ہیں
تو دروازہ کھلتا ہے۔ گیلی آنکھوں سے دو ہوند آنسوؤں
سے اس کے من میں خیر کے پھول پھلنے پھولنے لگتے
ہیں۔



صرف دانت ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ بات بات پہ
دانت چباتے ہیں۔ غصے سے منھیاں پھینچتے ہیں۔
بات کرنے پہ آئیں تو دو منٹوں میں پورے شہر کیا
پورے ملک کی قسمت پہ فتوے دے دیں گے۔ جہاں ذرا
ان کا ذاتی مفاد دمس آیا ان کے منہ سے جھاگ نکلے لگتی
ہے۔ ان پہ ہڈیانی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ جہاں
انہیں فائدہ ملا یہ اسے اپنے باپ دادا کا مال سمجھ کے چپکے
سے جیب میں ڈالیں گے اور ادھر ادھر دیکھیں گے کہ
باقی کہاں ہے؟ کئی زمانوں سے ایسے لوگوں کا یہاں راج
ہے۔

آج کل ایسے لوگ غرور کو دانشور کے نام سے بھی
منوانے کے چکر میں ہیں۔ بھولے بھالے لوگوں کو
پریشان کرنا مگر اہر کرنا، ڈرانا ان کا پسندیدہ کام ہے۔ اکثر
وہ اپنے اس کام میں اتنے ماہر ہوتے ہیں کہ ہر عام لوگ
انہیں ”ماہرین“ کے نام سے پکارتے ہیں۔ ان کی ”ملک“
کی قلمی اور سمولی ہوتی ہے۔ یہ مصنف سناپ کی طرح اور
زبان نکال کے اپنے سامنے آئے شکار کو دوپونے سے
پہلے اس سے کھینچتے ہیں۔ مزے لیتے ہیں۔
یہ لوگ ناقابل اصلاح نہیں ہیں۔

ان کی اصلاح کے لئے خدا وہی کرتا ہے، جو وہ
مجبزی قوموں کے لئے کرتا آتا ہے۔ انہیں پہنچے ہی نہیں
چتا کب ان کے آزار بندوں سے بندگی ہوئی ان کے
بقول ان کی اپنی محنت اور تنگ ودد کی کمائیاں ایک لمحے
میں فنا ہو جاتی ہیں، کسی کو اپنی کھو بڑی پہ مان ہوتا ہے۔
اسے فالج کی بیماری آ جاتی ہے۔ کوئی اپنی سوئی شکل پہ خود
عاشق ہو رہا ہوتا ہے۔ اسے لقوہ ہو جاتا ہے۔ کوئی اپنی
آواز کو حرف آخر کے طور پر استعمال کی عادت بنا چکا ہوتا
ہے۔ اس کا گلا اپنا کام چھوڑ جاتا ہے۔ کسی کو اپنی سلطنت
کی عظمت کا گمان ہوتا ہے۔ اس کے حصے میں ایک بند
غار آتی ہے۔ خدا کا عجیب قانون ہے، وہ فرعون کو اس کی

ٹیکارام کی بیوی جواب شرف الدین کی بے نکاحی بیوی تھی، کی راہنمائی
اور عملی مدد سے شرف الدین انتہادرہے کا خطرناک جرائم پیشہ رہزن بن گیا۔

واربرٹن کون تھا؟



☆ دیر حسین رضوی (ریٹائرڈ) انسپکٹر پولیس

لوگوں پر دہشت طاری کر رکھی تھی۔ یہ گروہ پولیس کے ہاتھ نہیں آتے تھے بلکہ اکثر پولیس ان کے ہاتھ آ جاتی اور نقصان اٹھاتی تھی۔ جان واربرٹن نے انہی جرائم پیشہ گروہوں کی سرکوبی میں نام پیدا کیا تھا۔ زہر خورانی کے ذریعہ قتل، رہزنی اور ڈکیتی کے عادی مجرمان کے 70 مقدمات اُس کی ذاتی کاوشوں سے کامیابی کے مراحل سے گزرے اور خطرناک گروہ کیفر کردار کو پہنچے تھے۔

پنجاب میں شیخوپورہ اور ننکانہ صاحب کے درمیان واربرٹن نام کا ایک ریلوے سٹیشن ہے۔ اس مقام کو یہ نام انگریزی حکومت نے اپنے ایک پولیس آفیسر جان واربرٹن کے اعزاز میں دیا تھا جسے لوگ انگریز سمجھتے رہے لیکن حقیقت کچھ اور تھی۔ 1870-80ء کے درمیان وہ ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس ضلع لاہور تھا۔ اس دور میں رہزنیوں، ڈاکوؤں اور قتلوں کے گروہوں نے

اختیار کی اور وہ آگرہ پولیس میں بھرتی ہو گیا۔ نیکارام ایک بار پھر پکڑا گیا اور اٹھائیس سال کی سزا پر کرٹیل چلا گیا۔ شرف الدین کو پتہ چلا تو وہ نیکارام کے گھر گیا۔ وہ اس کی بیوی کو پہلے سے جانتا تھا۔ اُس نے اس عورت کو اپنی دوستی کے جال میں پھانس لیا اور اسے اپنے ساتھ آگرہ لے گیا۔ زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ اُس نے آگرہ پولیس کی نوکری ترک کر دی اور نیکارام کی بیوی کے ساتھ اپنے گاؤں کا تھان ضلع ہوشیار پور واپس آ گیا۔ نیکارام کی بیوی بڑی دلیر عورت تھی اور پختہ کار مجرم۔ اس کی اعانت سے شرف الدین نے چودہ مجرموں کا ایک گروہ بنالیا اور زہری اور ذکیٹی کی وارداتیں کرنی شروع کر دیں۔ نیکارام کی بیوی جو اب شرف الدین کی بے نکاحی بیوی تھی، کی راہنمائی اور عملی مدد سے شرف الدین انتہا درجے کا خطرناک جرائم پیشہ بن گیا۔ وہ کئی بار پولیس کے تعاقب اور گھیرے سے بچ کر نکل گیا۔

پھر اس نے نقل مکانی کی اور وہ نیکارام کی بیوی اور اپنے گروہ کے ساتھ اودھ کے جنگلوں میں چلا گیا جو ریزلی کے لئے اور روپوش ہونے کے لئے موزوں تھے۔ اس نے پوری زبان بولنے کی مہارت حاصل کر لی۔ اس علاقے کی شاہراؤں پر اس نے مختلف بھیس بدل کر زہر خورانی کی وارداتیں شروع کر دیں۔ وہ دھتورہ اور افیم کھانے کی چیزوں میں ملا کر مسافروں کو کھلا دیتا اور انہیں بے ہوش کر کے لوٹ لیتا تھا۔ شرف الدین کے گروہ کے آدمی مسافروں کو نشیات ملی ہوئی خوراک کھلانے سے پہلے دیسی شراب خوب پلاتے تھے تاکہ زہر خورانی کی علامات دب کر رہ جائیں۔ بے ہوش مسافروں پر باقی ماندہ شراب چھڑک کر خالی بوتلیں اُن کے پاس پڑی جھوڑ دیتے تھے تاکہ معلوم ہو کہ شراب پنی پی کر انہوں نے یہ حال بنالیا ہے۔ واردات کا ارتکاب کر کے یہ جرائم پیشہ

جان دار برٹن کا نام سنتے ہی ایک جرائم پیشہ گروہ کا سرغنہ، شرف الدین یاد آتا ہے۔ وہ اپنے فن کا اتنا ہی ماہر اور دلیر تھا جتنا وار برٹن اپنے فن کا استاد تھا۔ شرف الدین خوش زد جوان، ضلع ہوشیار پور کا رہنے والا تھا۔ اُس نے بالغ عمری کو پہنچتے ہی ایک حسین لڑکی کو اغوا کر لیا جس کا نام دلاپتاں تھا۔ اس کو وہ ساتھ لئے پھر اور اس کے زیورات اور قیمتی پارچات بیچ بیچ کر وقت گزارتا رہا حتیٰ کہ تلاش ہو گیا۔ یہ اُس کا پہلا جرم تھا۔ پاس پلے کچھ نہ رہا تو وہ محنت مزدوری پر گزارا کرنے لگا۔ اس کو اپنی محبوبہ دلاپتاں کی وفاؤں پر شبہات پیدا ہوتے چلے گئے۔ آپس میں جھگڑے ہونے لگے۔

ایک دن غیظ و غضب سے مغلوب ہو کر شرف الدین نے دلاپتاں کی ناک کاٹ ڈالی اور بھاگ نکلا۔ تھوڑے دنوں بعد ہی پولیس کے ہتھے چڑھ گیا اور سزا پا کر جیل چلا گیا۔ جیل میں اُس کی ملاقات نیکارام نامی ایک قیدی سے ہوئی جو عادی مجرموں کے ایک گروہ کا لیڈر تھا۔ اس کے ساتھ شرف الدین کی دوستی ہو گئی۔ جیل میں یہی ایک حوالہ ہے کہ نئے قیدی عبرت حاصل کرنے کی بجائے پختہ کار مجرموں سے تربیت حاصل کر لیتے ہیں۔ وہ جب قید پوری کر کے رہا ہوتے ہیں تو وحشی طور پر مجرم بن چکے ہوتے ہیں۔ شرف الدین نے بھی نیکارام کی دوستی سے جرائم کی ترفیب اور تربیت حاصل کی۔ وہ باہر آیا۔ پھر نیکارام کی بھی سزائے قید پوری ہو گئی۔ شرف الدین اور نیکارام مل کر جرائم کے ارتکاب میں سرگرم ہو گئے۔ چند ایک وارداتوں کے بعد دونوں میں جھگڑا ہو گیا اور علیحدہ ہو گئے۔

شرف الدین کو اب نیکارام کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اس نے داؤ پیچ سکھ لئے اور عملی تربیت بھی حاصل کر لی تھی۔ اُس نے اپنا گروہ بنالیا۔ تھوڑے ہی عرصے بعد اُس نے جانے کیا سوچ کر اس گروہ سے علیحدگی

اور اس نے اپنا نام ظاہر نہیں کیا۔ نیکارام نے جیل کے حکام کے ذریعے وارنٹ کو بتا دیا کہ فلاں قیدی دراصل شرف الدین ہے۔ نیکارام انتقام کی آگ میں جل رہا تھا کیونکہ اسے پتہ چل گیا تھا کہ شرف الدین اُس کی بیوی کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

پنجاب پولیس کے افسر نیکارام اور شرف الدین کی پہلی منظور نظر ولایتاں کو ساتھ لے کر کارروائی شناخت کے لئے آگرہ جیل گئے۔ شناخت یوں کی جاتی ہے کہ ملزم کو آٹھ دس آدمیوں کی صف میں کھڑا کر دیا جاتا ہے اور شناخت کرنے والوں سے کہا جاتا ہے کہ وہ ان میں سے اصل ملزم کو شناخت کریں۔ شرف الدین کو اسی طریقہ کار کے مطابق چند ایک قیدیوں میں کھڑا کیا گیا۔ سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا کہ ولایتاں جو لمبے عرصے تک شرف الدین کی داشتہ رہی تھی اور نیکارام جو طویل مدت تک شرف الدین کا ساتھی رہا تھا، شرف الدین کو شناخت نہیں کر سکیں گے۔ مگر دونوں اسے شناخت کرنے میں ناکام رہے۔ اس کی بیوی ایک چھٹی شرف الدین نے ولایتاں اور نیکارام کے ساتھ آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ ملے کر لیا تھا۔ ان دونوں نے کہہ دیا کہ شرف الدین ان آدمیوں میں نہیں ہے۔

شرف الدین کی بد نصیبی یہ تھی کہ پولیس کی جو پارٹی اسے شناخت کرنے کی تھی اس کے تھانیدار اور ہیڈ کانسٹیبل نے اس کی ہسٹری شیٹ میں درج شدہ حلیہ کے نشانات سے اسے شناخت کر لیا اور ثابت کر دیا کہ یہ ہندو سادھو جو آگرہ جیل میں بچھن لاچار رہتا ہے۔ دراصل مشہور رہزن شرف الدین ہے۔

شرف الدین کو پنجاب لایا گیا اور جیل سے نکلوا کر وارنٹ نے براہ راست اپنی نگرانی میں عدم پتہ مقدمات کی بھی تحقیق کرائی۔ شرف الدین نے بالآخر اپنے ہولناک جرائم کا کھلے دل سے اقبال کر لیا اور 1881ء

آدی پور جی جیس اتار کر پنجابی لباس پہن لیتے اور پنجابی بولنے لگتے تھے جس سے اُن کے خلاف اشتباہ نہ ہوتا تھا۔ پولیس کی ملازمت نے شرف الدین کو بڑا چوکس بنا دیا تھا۔ وہ پولیس کے طور طریقوں اور پولیس افسروں کے سوچنے کے انداز سے واقف ہو گیا تھا۔ اس سے اسے واردات کرنے اور پولیس کو گمراہ کرنے میں بہت مدد ملتی رہی۔ پانچ برس تک شرف الدین اور اُس کا گروہ انسانی خون کی ہولی کھیلتے رہے اور لوٹ مار میں مصروف رہے۔ انجام کار شرف الدین کا نیکارام کی بیوی سے جھگڑا ہو گیا۔ جان وارنٹ پنجاب پولیس میں تھا۔ نیکارام کی بیوی اودھ سے فوجی طور پر پنجاب چلی آئی۔ وہ چالاک عورت تھی۔ وہ جان وارنٹ سے ملی اور اسے شرف الدین کے متعلق بتایا کہ وہ کہاں ہے اور وہ کیا کیا وارداتیں کر چکا ہے۔ اس طرح اس جرائم پیشہ عورت نے ایک تیر سے دو شکار مار لئے۔ ایک یہ کہ اُس نے شرف الدین سے جھگڑے کا انتقام لے لیا اور دوسرے یہ کہ اودھ میں کی مجرمہ ہونے کے باوجود بری الذمہ ہوئی۔ وارنٹ نے شرف الدین کو اشتہاری مجرم قرار دلا کر گرفتاری کے لئے پانچ سو روپے انعام مقرر کر دیا جو اس دور میں یہ بے بہا رقم سمجھی جاتی تھی۔

شرف الدین جیس بدلے کا ماہر تھا۔ ہاتھ نہ آ سکتا تھا۔ آخر رہزنی کی ایک واردات میں گرفتار ہو گیا اور اسے سزا ملی۔ اسے آگرہ جیل میں قید کیا گیا۔ اس واقعہ کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ پولیس کو شبہ تک نہ ہوا کہ یہ شرف الدین ہے جس کے ہاتھ بیسیوں انسانوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں اور اس کی گرفتاری کے لئے پانچ سو روپے انعام مقرر کیا جا چکا ہے۔ اس نے اپنا نام کچھ اور بتایا اور وہ ہندو بنا ہوا تھا۔ اس نے واڈھی اور موچیس منڈا دی تھیں۔ نیکارام لاہور جیل میں بند تھا۔ کسی ذریعے سے اسے پتہ چل گیا کہ شرف الدین آگرہ جیل میں قید ہے

ایک نوجوان حسینہ پر حملہ آور ہوا اور اس کو زمین پر گرالیا۔
 واربرٹن نے دوڑ کر کتے کو مارا اور اس حسینہ کو بچالیا۔ کچھ
 دنوں کے بعد اُس کی شادی اسی حسینہ سے ہو گئی۔

جان واربرٹن کا انگریز باپ رابرٹ واربرٹن
 لیفٹیننٹ کرنل تھا۔ اس کی کوشش سے وہ 1864ء میں
 پنجاب پولیس میں اسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس کے
 عہدے پر بھرتی کر لیا گیا۔ وہ ہندوستان کی چیدہ چیدہ
 زبانیں روانی سے بولتا تھا۔ 1872ء میں وہ لدھیانہ میں
 سپرنٹنڈنٹ پولیس تھا جہاں باور یہ قبیلے کے جرائم پیشہ
 گروہ اغوا، ہرنی اور ڈکیتی کی سنگین وارداتوں کا ارتکاب
 کرتے تھے اور انہوں نے اس کو ٹھکانے لگانے میں واربرٹن
 نے بڑا نام پیدا کیا۔

شرف الدین والے گیس میں بے مثال کامیابی
 حاصل کر کے واربرٹن کی شہرت کو بڑھ گئے۔ ”بن
 صاحب، بن صاحب“ کا سارے پنجاب میں شہرہ ہو
 گیا۔ سانس قبیلے کے جرائم پیشہ گروہ کی بھی اس نے بڑی
 تک و دو سے سرکوبی کی۔ وہ ہمیشہ بدلے کا ماہر تھا۔ اس
 طرح وہ خود مجرموں کی سراغ رسانی کیا کرتا تھا۔ مجرموں
 کی ذہنیات کو خوب سمجھتا تھا اور شب و روز اسی ادھیڑ بن
 میں لگا رہتا تھا۔ ایک موقع پر ہندو مسلم تصادم روکنے کے
 لئے مشتعل گیس میں تنہا جا گھسا اور کامیاب رہا۔
 دیانتداری کا پتلا تھا۔ اس کی ناقابل تردید رپورٹ پر ایک
 ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کو رشوت خوری کی بنا پر سزا ملی۔

1900ء میں انڈین پولیس سے ریٹائر ہو کر وہ
 ریاست پٹیالہ میں انسپکٹر جنرل پولیس ہو گیا اور یہیں کہیں
 مر گیا لیکن افغان ماں اور افغان باپ کا یہ بیٹا جسے لوگ
 انگریز سمجھتے رہے آج بھی شوپورہ اور ننگر ناہ صاحب کے
 درمیان ایک ریلوے سٹیشن کے نام سے زندہ ہے۔

✽○✽

میں اس کو لاہور جیل میں بچانسی دے دی گئی۔ اس کے مر
 جانے کے بعد نیکارام کی بیوی کے دل میں شرف الدین
 کی محبت بیدار ہو گئی۔ اس نے شرف الدین اور نیکارام
 کے گروہوں کے پختہ کار افراد کو ساتھ ملا کر انتقام و سبج اور
 ظالمانہ چلانے پر رہنمائی کی وارداتی شروع کر دیں۔
 نیکارام تو لاہور جیل میں قید تھا جہاں اسے ٹھانسی سال قید
 رہنا تھا۔ صوبہ پنجاب سے نکل کر یہ گروہ اودھ کے علاقے
 میں چلا گیا۔ اس گروہ کو جس کی سرغنہ عورت بھی پکڑنے کا
 کام جان واربرٹن کو ہی سونپا گیا۔ یہ کام آسان نہ تھا لیکن
 واربرٹن غیر معمولی عقل اور فہم و فراست کا مالک اور دلیر
 تھا۔ اُس نے اس گروہ کو گھیرے میں لے لیا اور نیکارام کی
 بیوی سمیت گروہ کے کچھ افراد کو پکڑ لیا۔ باقی مقابلے میں
 مارے گئے۔

جان واربرٹن کی اپنی ہسٹری بھی بڑی دلچسپ
 ہے۔ اس کا پورا نام جان پال واربرٹن تھا۔ اُس نے سی
 آئی ای کا خطاب پایا تھا۔ پنجاب کے دیہاتی اُس کو بٹن
 صاحب کہا کرتے تھے۔ اس کی ماں مسلمان تھی جس کا نام
 شاہجہان بیگم تھا۔ یہ ذاتوں افغانستان کے شانی خاندان
 سے تھی۔ اس کی پہلی -اوی سردار فیض طلب خاں سے
 ہوئی تھی مگر جلد ہی یہ طلاق ہو گئی۔ شاہجہان بیگم ایک
 انگریز رابرٹ واربرٹن کی بیوی بن گئی۔ اس وقت
 شاہجہان بیگم کی گود میں ایک دودھ پیتا بچہ تھا جس کا نام
 جہانداد خان تھا۔ شاہجہان بیگم کا دوسرا خاندان رابرٹ
 واربرٹن توپ خانے کا افسر تھا۔ اس نے بچے کا نام
 جہانداد خان سے بدل کر جان پال واربرٹن رکھ دیا۔ انہوں
 ایک افغانی مسلمان کا بیٹا انگریز کا بیٹا بن گیا۔

جان پال واربرٹن کی اپنی شانی کا قصہ بھی بڑا
 رومانی اور ڈرامائی ہے۔ 1863ء میں وہ لدھیانہ میں تھا۔
 صبح سویرے کی سیر کے لئے حسب معمول ایک دن جاتے
 ہوئے اُس نے دیکھا کہ سڑک پر ایک کتا خطرناک طور پر

پنجاب پر سکھوں کا قبضہ کیسے ہوا؟ مغلیہ سلطنت کیسے برباد ہوئی؟

مغلیہ سلطنت

رفیق ڈاکٹر

قسط: 8



جلد بادشاہ کا مراسلہ اور اپنا نوشتہ عماد الملک تک پہنچانا چاہتی تھی لیکن اس کے پاس اپنے آپچی کے لئے کوئی محافظہ دست نہ تھا احمد شاہ ابدالی کی فوجوں کے شاہجہان آباد کے نواح میں پہنچ جانے سے مغلیہ نظم نامود ہو چکا تھا لوگ ادھر ادھر بھاگ رہے تھے اور لیرے بھاگنے والوں کا مال واسباب چھین لیتے تھے۔ طہماس خاں اور عاقل خاں اس سفر کے لئے تیار تھے مگر وہ راستہ کے خطرات سے پریشان تھی آخر اس نے خطرہ مول لینے کا فیصلہ کر لیا اور دونوں کو بلا کر مراسلے ان کے حوالے کر دیئے طہماس خاں کو بتا دیا کہ مراسلہ خاص اس کے کلاہ میں سی دیا گیا ہے شاہجہان آباد پہنچنے کی وجہ سے کلاہ عماد الملک کے سپرد کر دے اور بتا دے کہ ان کی ہدایات پر عمل لازم ہے۔

دن ڈھلے طہماس خاں اور عاقل خاں اس کے ذریعے سے روانہ ہوئے اور غروب آفتاب سے پہلے واپس آ گئے۔ بھاگنے والوں سے راستہ کے خطرات کا ذکر سن کر وہ اپنی جانوں کے لئے پریشان ہو گئے تھے۔ مغلانی بیگم کی مایوسی غصہ میں بدلنے لگی۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے شاہ ولی خاں سے مدد لینے کا فیصلہ کیا اور پیغام بھیجا کہ بادشاہ کا پیغام لے جانے والے اس کے ایلچیوں کی حفاظت کے لئے دست فراہم کیا جائے۔ شاہ ولی خاں خود نظام کے حضور حاضر ہوا اور بتایا کہ اگلے صبح وہ خود دس ہزار فوج کے ساتھ آگے جا رہے ہیں ان کے ایلچی ان کی فوج کے ساتھ محفوظ ہوں گے اور اپنے اگلے کیپ پہنچ کر وہ ان کے ایلچیوں کو شاہجہان آباد پہنچانے کا انتظام کر دے گا۔ بیگم کو یہ انتظام پسند نہیں تھا مگر اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا، مجبوراً اسے شاہ ولی خاں کا مشورہ قبول کرنا پڑا۔

شاہ ولی خاں کا لشکر جنگی ساز و سامان کے ساتھ سفر کر رہا تھا اس وجہ سے اس کی رفتار بہت سست تھی۔ شاہ ولی کو بیگم کی بے چینی اور جلد بازی سے کچھ شبہ بھی رہتا

مغلانی بیگم شمعدان کے سامنے بیٹھی عماد الملک کے لئے بادشاہ سے اپنی ملاقات کی تفصیل لکھ رہی تھی تاکہ اس کی روشنی میں وہ کوئی فیصلہ کر سکے۔

”تمہارے اور مغل بادشاہ کے عزت و وقار کا تحفظ ابدالی پر فوجی فتح میں ہے اگر تم اس کی طاقت نہیں رکھتے تو عزت کا راستہ وہی ہے جو آدینہ بیگ نے اختیار کیا کسی ایسی جگہ چلے جاؤ جہاں افغان فوجیں نہ پہنچ سکیں میں تمہیں احمد شاہ ابدالی کے خط اور تسلی پر پھر دوسرا مشورہ نہیں دوں گی۔ مغل بادشاہ اور شاہجہان آباد والوں کو ان کے حال پر چھوڑ دو اور فرار میں تاخیر نہ کرو۔“ اس نے ملاقات کی تفصیل ختم کرتے ہوئے لکھا اور اپنے ہاتھ سے مراسلہ تہہ کر کے طہماس خاں کی سرخ کلاہ میں سی دیا۔

افغان فوج کے شب بیدار دستوں کے گھوڑوں کے سسوں کی آواز سکوتِ شب کو بار بار توڑ رہی تھی۔ مغلانی بیگم نے شاہجہان آباد کے سفر اور وہاں سے واپسی کے دوران پانی پت کے میدان کا جائزہ لینے کی کوشش کی تھی۔ وہ میدان کے گرد و نواح کے حوالوں کی مدد سے پانی پت میں اب تک لڑی جانے والی لڑائیوں کی تھیکا تھکی منظر کی میں مصروف ہو گئی اس کے لئے سب سے اہم باہر اور ابراہیم لومہی کے درمیان لڑی جانے والی لڑائی تھی جس کے نتیجے میں ہندوستان میں مغلیہ سلطنت قائم ہوئی تھی۔ وہ مغلیہ سلطنت جس نے اس کے اجداد کو عظمت دی تھی اس کی خواہش تھی کہ اسی میدان میں ایک اور جنگ لڑی جائے جس میں ایک دفعہ پھر مغل فوجیں کامیاب ہوں مگر حالات و واقعات سب اس کی خواہشات کے خلاف تھے اسے اپنے داماد کا اور اپنا ذاتی مستقبل کیسے پر مسلط گھپ اندھیرے سے بھی زیادہ تاریک نظر آنے لگا۔

فجر کی نماز کے بعد بادشاہ کا پیامبر خاص عماد الملک کے لئے بادشاہ کا مراسلہ بیگم کے حوالے کر گیا وہ جلد از

کر دو روپیہ دے کر شاہجہان آباد میں داخل ہونے سے روکنے میں درپیش تھی۔ روپیہ کی کمی کی دشواری مغل سلطنت جس کی عظمت اور دولت کے شرق و غرب میں چرچے ہوا کرتے تھے۔ اس کے خزانہ میں اب اتنا روپیہ بھی نہ تھا جتنا اس کے امراء اور وزراء کے ذاتی خزانوں میں بھرا ہوا تھا۔ سلطنت کے زوال پذیر ہونے سے وزراء اور امراء نے شاہی خزانہ کی بجائے اپنا خزانہ بھرنا شروع کر دیا تھا۔ ان سے نہ کوئی پوچھنے والا تھا نہ کوئی انہیں روکنے کی طاقت رکھتا تھا۔ شہنشاہ نے جامع مسجد کے میناروں کے اوپر سے اس روز کے ڈھلنے ہوئے سورج کو دیکھا اور سوچا کیا میری شہنشاہیت کا سورج بھی غروب کی اسی منزل میں داخل ہو چکا ہے؟ وہ سوچتا ہوا برج کی سیڑھیاں اترنے لگا۔

مغلانی بیگم کی طرف سے کوئی نظام موصول نہ ہونے اور افغان فوجوں کے مسلسل شاہجہان آباد کی طرف بڑھنے کی اطلاع کے بعد عماد الملک نے دفاعی انتظامات کا جائزہ لینا شروع کر دیا تھا اور جہان خان کو جتنا کہ وہ آگے میں داخل ہونے سے روکنے کے لئے اپنے ایک مرہٹہ ملٹری سردار منشی نور راؤ کو آگے بھیجا تھا مگر افغان ہراول دستوں نے انہیں مار بھگا دیا تھا۔ عماد الملک نے شہر کی حفاظت کے لئے اپنے شئے تعمیر کرنے کا حکم دیا مگر اس کے لئے بھی خزانہ میں روپیہ نہیں تھا۔ جہان خان کی فوجوں کا راستہ روکنے کے لئے اس نے راج گھاٹ کے سامنے توپیں نصب کروادی تھیں مگر توپوں کے کماندار نے اطلاع دی کہ توپچی دستیاب نہیں ہو رہے۔ عام لوگوں کے بعد اب امراء دربار بھی شہر چھوڑ کر بھاگنا شروع ہو گئے تھے۔ اسے افغان فوجوں کو شاہجہان آباد میں داخل ہونے سے روکنے کی اب کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی تھی۔

شہنشاہ نے قلعہ دار کو طلب کیا اور برجن اور

اس نے طہماس خاں اور عاقل خاں کو سفر کے لئے دست فراہم نہیں کیا، انہیں اپنے لشکر کے ساتھ ہی رکھا۔ شب اول انہیں اپنے فوجی سرداروں کے کیمپ میں ٹھہرایا اور اپنے جاسوس ان کی جانچ پڑتال پر مقرر کر دیئے۔ جاسوسوں نے رات دونوں کی کلاہ تبدیل کر دیں ان کے سرہانے اسی قسم کی کلاہ رکھ دیں کہ انہیں شک نہ مگر رہے جاسوس جانتے تھے کہ خفیہ پیغامات کہاں کہاں چھپائے جاتے ہیں ان کی خوش بختی کہ پہلی ہی کلاہ کھولنے سے بیگم کا مراسلہ مل گیا۔ شاہ ولی خفیہ مراسلہ پڑھ کر ہوشیار ہو گیا۔

طہماس خاں اور عاقل پر مگر ان مقرر کر دیئے اور دست فراہم کرنے کی درخواست بھانے بھانے سے ٹالتا رہا۔

مغل شہنشاہ عالمگیر ثانی اپنے محل کے اونچے برج میں جمنا کھڑا تھا، سامنے جہان خان کی فوج کے خیموں پر افغان پرچم صاف نظر آ رہے تھے، دیوان عام اور لال قلعہ کے برجوں پر کھڑے محافظ اور خدام شاہی بھی انہی پرچموں اور خیموں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ شہنشاہ کو کئی روز سے افغان فوجوں کے شاہجہان آباد کے گرد جمع ہونے کی اطلاع موصول ہو رہی تھی لیکن ان کے وزیر اعظم افغان فوجوں کو دارالحکومت میں داخل ہونے سے روکنے کے لئے کیا کر رہے تھے انہیں کو علم نہ تھا۔ چند روز پہلے عماد الملک نے خواہش ظاہر کی تھی کہ افغانوں کے مقابلہ کے لئے شہنشاہ خود مغل فوج کی قیادت کریں ان کی آمادگی پر جمنا کے اس پار بادشاہ کے لئے خیمہ خاص کے قیام کی تیاریاں بھی شروع ہو گئی تھیں مگر پھر نہ کوئی فوج جمع ہوئی اور نہ ہی بادشاہ کو قلعہ معلیٰ سے نکل کر کسی فوج کی قیادت کی ضرورت پیش آ سکی تھی۔ فوج جمع کرنے میں بھی سب سے بڑی دشواری وہی تھی جو احمد شاہ ابدالی کو دو

ابدالی کا فرض ہے تو اس کے متعلقین کے مقام و مرتبہ کا تحفظ اس کا فرض کیوں نہیں بنتا اسے یہ فرض یاد دلانا وقت کی مصلحت ہے۔ "ملکہ زمانی نے کسی جھجک کے بغیر جواب دیا۔

عالمگیر کے لئے یہ جواب بہت تلخ تھا مگر مغلیہ روایت کی پابندی لازم تھی اس نے کسی قسم کا رد عمل ظاہر نہیں کیا محفل میں موجود دیگر خواتین نے جس انداز سے ملکہ زمانی کی طرف دیکھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بھی اس کی ہم خیال ہیں۔

خاندان تیموری کے جدی ملازم عماد الملک کو ہمارے خاندانی اور گھریلو معاملات میں دخل اندازی سے روکنا شہنشاہ معظم کا فرض ہے ہم سمجھتے ہیں کہ آل تیمور پر عماد الملک کے مظالم سے آگاہ ہوتے ہوئے بھی انہیں اس لئے نظر انداز کیا گیا کہ وہ دراصل ملکہ زمانی کی طاقت خاندان تیموری سے بڑھ گئی ہے۔ ہم مغلیہ سلطنت اور خاندان کی بقا کے لئے عماد الملک کی طاقت کا خاتمہ لازم سمجھتے ہیں۔ "ملکہ زمانی نے کسی خوف کے بغیر کہا۔

"عماد الملک کی خود سری برداشت کرنا وقت کی مصلحت اور مجبوری ہے ہم اس کا تدارک کرنے کی کوشش کریں گے۔ شہنشاہ کا انداز مدافعت میں بدل گیا۔

"سلطنت اور خاندان کے خادم کی خود سری دونوں کے زوال کا سبب بنتی ہے اور ہم نہیں چاہتے خاندان تیموری اور اس کی سلطنت مزید زوال سے بے نظیر ہو اس لئے ہم نے ابدالی کو مراسلہ بھیجنا لازم جانا۔ شہنشاہ عالی مقام محل اور قلعہ کی بیگمات کے جذبات اور رائے سے آگاہ ہوتے تو وہ اس مراسلہ کا ہرگز برا نہ مانتے۔"

"مابدولت بیگم عالیہ کے ارشادات کی بے حد قدر کرتے ہیں اور یقین دلاتے ہیں کہ بیگمات تیموریہ کے مقام و مرتبہ کے تحفظ میں کوئی کوتاہی نہ آنے دیں گے۔ اس فرض کی ادائیگی میں کوتاہی کا احساس دلانے کے لئے

دروازوں کی گمرانی کے انتظامات مستحکم کرنے کا حکم دے کر زمان خانہ میں چلے گئے جہاں قلعہ میں مقیم بزرگ مغلیہ خواتین جمع تھیں۔ شہنشاہ ان خواتین سے ان حالات کے بارے میں بات کرنا چاہتے تھے۔ انہیں بتایا گیا تھا کہ محمد شاہ بادشاہ کی بیوہ ملکہ زمانی نے بھی احمد شاہ ابدالی کے پاس عریضہ ارسال کیا ہے اور ان سے درخواست کی ہے کہ وہ انہیں اور ان کے خاندان کو وزیراعظم عماد الملک کے مظالم سے نجات دلائیں۔ ملکہ زمانی بیگم کے مقام و مرتبہ کا قلعہ معلیٰ کی محفل خواتین میں بہت احترام تھا۔ اپنی قدیم روایت کے مطابق محفل حکمران محل اور قلعہ کی بزرگ خواتین کی رائے اور مشورہ کو خاندانی معاملات میں بہت اہمیت دیتے تھے لیکن زمانی بیگم کا مراسلہ خاندانی معاملات کی بجائے سلطنت کے بیرونی معاملات اور مستقبل سے متعلق تھا اس لئے شہنشاہ کے لئے پریشانی کا سبب تھا۔

"مابدولت کے علم میں لایا گیا ہے کہ معزز بیگمات ہمارے ان انتظامات سے مطمئن نہیں جو ہم نے ان کے مقام و احترام کے تحفظ کے لئے کئے ہیں۔" شہنشاہ نے بزرگ خواتین کے درمیان فرشی نشست پر تکیہ سے ٹپک لگا کر بیٹھتے ہوئے بات شروع کی۔

"خاندان تیموری کے مقام مرتبہ اور عظمت و احترام کا تحفظ اس کے ہر سامع کا فرض ہے اور ہم اس فرض کی ادائیگی میں کوتاہی کا احساس دلانا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔" ملکہ زمانی نے جواب دیا۔

"مابدولت اس کوتاہی کا احساس دلانے کے لئے بیگم عالیہ کے منظر میں اور سمجھتے ہیں کہ انہیں تحفظ فراہم کرنا ہمارا فرض ہے احمد شاہ ابدالی کا نہیں۔" شہنشاہ نے نہایت ادب سے کہا مگر یہ بھی ظاہر کر دیا کہ انہیں ملکہ زمانی کے مراسلہ کا علم ہو چکا ہے۔

"اگر شہنشاہ معظم کی شہنشاہیت کا تحفظ احمد شاہ

ماگ رہا ہے انہوں نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے اور بلند آواز میں آمین! آمین! نیکار نے گئے۔

جس طرح شہنشاہ عالمگیر ثانی اور ان کے وزیر اعظم کو کچھ علم نہیں تھا کہ تقدیر کے کھیل میں ان کے حق میں کیا لکھا ہے۔ شاہجہان آباد کے ہاسی بھی نہیں جانتے تھے کہ کل کیا ہونے والا ہے۔ ان خدام کو بھی کچھ علم نہیں تھا وہ صرف اس خیال سے آمین! آمین! کہہ رہے تھے کہ خطیب جامعہ جو بھی دعا مانگ رہے ہوں گے ملک ملت اور شہر کے حق میں ہی مانگ رہے ہوں گے۔ دعا ختم ہوئی تو خدام گھوڑوں کے ساروزنیں دیکھنے لگے کہ اچھی طرح تو باندھے گئے ہیں۔ مسجد کی بیڑیاں اترنے والے نمازی آہستہ آہستہ چلتے ہوئے راست گھوڑوں اور خدام کو دیکھ کر اور بھی آہستہ قدم اٹھانے لگتے اور سرگوشیوں میں باتیں کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے اور خدام اپنے آقاؤں کا انتظار کرتے رہے۔

نمازیوں کی آمد کا سلسلہ ختم ہو گیا رات کی سیاہی اور بھی تحلیل ہو گئی اور قلعہ معلیٰ کی فصیل بھی آراستہ گھوڑوں اور خداموں کو دیکھ کر برجوں سے سرگوشیاں کرنے لگی جب ان کے آقا سیر میوں کی طرف سے نمودار ہوئے تو امام جامعہ بھی ان کے ساتھ چلے آ رہے تھے۔ آخری میزمری پر سے امام نے ہر ایک سے مصافحہ کیا۔ ”اس سفارت میں ہماری دعائیں آپ کے ہمراہ ہوں گی۔“ ان کے الوداعی الفاظ تھے جو خدام نے سنے وہ رکاب میں تھام کر کھڑے ہو گئے۔

سنہری بھینوں اور عماموں کو سنبھالتے شاہجہان آباد کے امراء گھوڑوں پر سوار ہوئے اور لگا میں وزیر اعظم کی حویلی کی طرف موڑ دیں، خدام گھوڑوں کے ساتھ ساتھ بھاگنے لگے، امام دیر تک کھڑے نہیں دیکھتے رہے۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو چکے تو امام اپنے حجرے کی طرف چلے گئے وہ سر جھکائے آہستہ آہستہ چلے جاتے

ہم نیکم عالیہ کے شکر گزار ہیں۔“ شہنشاہ آداب کے لئے ہاتھ سر تک لے گئے۔

جامع مسجد کی میز میوں سے ذرا فاصلے پر درجن بھر خادم آراستہ گھوڑوں کی لگا میں تھامے کھڑے اپنے آقاؤں کا انتظار کر رہے تھے جو نیند سے بوجھل آنکھیں جھپکتے صبح کی نماز باجماعت ادا کرنے گئے تھے اور ابھی واپس نہیں آئے تھے۔ گھوڑوں کی تیاری سے اندازہ ہوتا تھا وہ کسی اہم سفر پر روانہ ہونے والے ہیں۔ رات کی سیاہی کی پھیلتی چادر میں سے قلعہ معلیٰ کی پُر شکوہ فصیل آہستہ آہستہ سر نکال رہی تھی۔ اس سے پرے قلعہ معلیٰ سے آگے راج گھاٹ پر مرہٹہ فوج کے سردار اور سپاہی اشنان میں مصروف تھے۔ یہ سردار رات بھر عباد الملک کو ابدالی سے آخری معرکہ کے لئے تیار کرنے کی کوشش کرتے رہے تھے۔ عباد الملک کے اپنے عزیز اور شیر بھی اسے قائدانی عزت اور وقار کی خاطر میدان جنگ میں اترے براۓ آمادہ کرتے رہے تھے۔ صرف عباد اللہ کشمیری نے اسے حقیقت پسندی سے کام لینے اور ابدالی کے اپنی بابورام کھتری کے پیغام پر عمل کرنے کا مشورہ دیا تھا۔

اب تک احمد شاہ کے پاس جتنے بھی سفیر بھیجے گئے تھے سب ناکام لوٹے تھے۔ شاہ نے نصیحت رائے کے نتیجے بابورام کھتری کو آخری پیغام دے کر بھیجا تھا کہ عالمگیر اور عباد الملک بذات خود ان کی خدمت میں حاضر ہو کر مصالحت کی بات چیت کریں رات بھر سے غور و فکر کے بعد عباد الملک نے عباد اللہ کشمیری کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے دو ہزار سوار اور پیادہ لشکر کے ہمراہ ابدالی کے حضور پیش ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

امام نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو ”آمین“ کی آواز صحن مسجد سے گزر کر گھوڑوں کی لگا میں تھام کر کھڑے خدام تک پہنچنے لگی۔ نہ جانتے ہوئے بھی کہ امام کیا دعا

ہوں گے۔“

”راستہ میں کوئی فوجی دستہ تم نے دیکھا؟“

”احتیاط کے پیش نظر میں اور میرے ساتھی دو مختلف راستوں سے آئے ہیں ہمیں مثل یا مرہٹہ فوجوں کا کوئی دستہ دکھائی نہیں دیا۔“

”تم جاسکتے ہو۔“ شاہ ولی خان نے خیمے کی طرف مڑتے ہوئے کہا اور خادم کو حکم دیا کہ فوری طور پر فوجی سرداروں کو طلب کیا جائے اور فوج کی تیاری کا بھل بھایا جائے۔

دوسرے ہی لمحہ شاہ ولی خاں کے بیس ہزار سوار اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ڈال رہے تھے اور افغان فوجی سردار ان کے قتلے میں تھے۔

”تمام سردار اسکی اپنے اپنے دستوں کے ساتھ روانہ ہو جائیں گے اور کپ سے شاہجہان آباد تک راستہ کے دونوں طرف پھیل جائیں گے۔ وہ راستہ سے اتنے فاصلہ پر رہیں گے کہ وزیراعظم ہند کی فوج کو ان کی موجودگی کا احساس نہ ہو سکے لیکن جہاں سے عمادالملک اور ان کی فوج گزر آئے گی ان کے پیچھے اس انداز میں تعمیرات کر دیا جائے گا کہ اگر کسی مرحلہ پر ان کا ارادہ بدل جائے تو وہ واپس نہ جاسکیں۔“ شاہ ولی خاں نے سرداروں کو ہدایت کی۔

”جب عمادالملک بادشاہ معظم کے حضور حاضری کے لئے آ رہے ہیں تو ارادہ کیوں بدلیں گے۔“ ایک سردار نے پوچھا۔

دوسرے سرداروں نے اس کی بات پر ایسے دیکھا جیسے سب یہی پوچھ رہے ہوں۔

”عمادالملک کمزور اور ناقابل اعتماد حاکم ہے اس کے امراء کسی وقت بھی اسے فیصلہ بدلنے پر آمادہ کر سکتے ہیں جس آدمی کو اپنے آپ پر اعتماد نہ ہو ہم اس کے کسی فیصلے اور اقدام پر اعتماد کرنے کی غلطی نہیں کر سکتے۔“ شاہ

تھے جیسے کسی گہری سوچ میں گم ہوں۔ حجرے کے دروازے کے پاس پہنچ کر مڑے اور قلعہ معلی کے برجوں کو دیکھنے لگے جو اب صاف دکھائی دینے لگے تھے۔ انہوں نے آنکھوں کے پیمانہ سے قلعہ کی تفصیل اور صحن مسجد کا درمیانی فاصلہ ناپا اور سر جھکا کر حجرے میں داخل ہو گئے۔

شاہ ولی خان نماز سے فارغ ہوئے تو خادم نے بابو رام کھتری کے پیامبر کی حاضری کی درخواست پیش کی ”حاضر کرو“ کا حکم دینے کی بجائے وہ جلدی سے پردہ اٹھا کر خیمے سے باہر آگئے اپنی آداب کے لئے جھک گیا۔ ”ہم پیام کو آداب سے زیادہ اہم سمجھتے ہیں۔“ شاہ ولی خاں بابو رام کھتری کا پیغام جاننے کے لئے بے تاب تھے۔

”غلام کو حکم دیا گیا تھا کہ حضور کو وزیراعظم ہند کی آمد کی اطلاع پہنچاؤ۔“ اپنی نے اطمینان سے جواب دیا۔

”کب روانہ ہوں گے وزیراعظم ہند؟“ شاہ ولی خان کے سوال سے محسوس ہوتا تھا جیسے اسے اس اطلاع پر حیرانی ہوئی ہو۔

”عمادالملک طلوع آفتاب کے بعد حضور کے ہاں حاضری کے لئے روانہ ہوں گے۔“

”ان کے ساتھ اور کتنے لوگ ہوں گے؟“

”غلام کی اطلاع کے مطابق وزیراعظم ہند کے ساتھ دو ہزار سوار اور پیادہ فوج اور ہاتھیوں کا ایک دستہ ہو گا۔“

”دو ہزار سوار اور پیادہ فوج اور ہاتھیوں کا دستہ۔“

شاہ ولی نے زیر لب دہرایا اور سوال کیا۔ ”تم وہاں سے کب روانہ ہوئے تھے؟“

”میرے گھوڑے کو یہاں پہنچنے میں چار گھنٹے لگے

آباد کے راستے کی طرف جا چکے تھے اور شاہ ولی خان استقبال کے سفر کی تیاری کر کے منتظر بیٹھے تھے کہ عماد الملک کے اہلی ان کی آمد کا پیام لے کر پہنچ گئے۔ افغان محافظ انہیں بڑے احترام سے شاہ ولی خان کے پاس لے گئے۔ شاہ ولی خان نے پیغام وصول کیا اور ایلچیوں کو انعامات اور تحائف دے کر راستہ خیموں میں پہنچا دیا گیا۔ شاہ ولی خان نے طہماس خان اور عاقل خان کو بلوایا اور اپنے ساتھ لے کر شاہجہان آباد کی طرف روانہ ہو گئے۔ جب وہ سرائے مہر پرور کے پاس پہنچے تو سامنے سے عماد الملک کی فوج آئی دکھائی دی افغان وزیراعظم وہیں رک گئے۔ اپنے دستوں کو استقبالیہ قطاروں میں ترتیب دیا اور انتظار کرنے لگے گھوڑسوار وزیراعظم کے ہمراہی امراء کے جھنڈے بردار سب سے آگے کھڑے تھے۔

عماد الملک نے نصف میل پیچھے اپنی فوج کو روک دیا ہاتھی اور گھوڑسوار دستے ترتیب دیئے وزیراعظم کے بائیں کے دونوں طرف ان کے ساتھی امراء تھے۔ وہ سب گھوڑوں پر سوار تھے ان کے پیچھے ہاتھیوں کا دستہ تھا اور اس سے پیچھے گھوڑسوار فوج اور سب سے پیچھے سلا پیدل دستے رکھے گئے۔ اسی ترتیب سے چلتے ہوئے نفل وزیراعظم قریب پہنچے تو شاہ ولی خان اپنے گھوڑے سے اتر آئے ان کے ساتھی امراء نے بھی اپنے اپنے گھوڑے خدام کے حوالے کر دیئے وہ سب پیدل عماد الملک کے ہاتھی کی طرف چلنے لگے۔ افغان وزیراعظم کو آتا دیکھ کر عماد الملک نے ہاتھی روکنے کا حکم دیا اس کے ساتھی امراء اور فوج بھی رک گئی۔ عماد الملک کو ہاتھی سے اترتا دیکھ کر اس کے امراء بھی گھوڑوں سے اتر آئے اس وقت تک افغان وزیراعظم ان کے بہت قریب پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر عماد الملک سے مصافحہ کیا اور خوش آمدید کہا اور عماد الملک اور ان کے امراء کی سواری کے

ولی خان نے جواب دیا۔
”ہم آپ کے تحکم کی تعمیل کریں گے لیکن اگر وہ فیصلہ بدل کر راستہ بدلنا چاہیں اور تصادم کے لئے تیار ہو جائیں تو ہمیں کیا کرنا ہوگا؟“ ایک اور سردار نے پوچھا۔
”ہم نہیں سمجھتے عماد الملک میں اتنی جرأت ہے کہ وہ ہماری فوجوں کو موجود پا کر لڑائی پر آمادہ ہو جائے گا پھر بھی اگر ایسی صورت ہو تو لڑائی کی اجازت ہے مگر عماد الملک کی ذات کو کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہئے۔“ افغان وزیراعظم نے ہدایت کی۔

”اگر وہ خود اپنا نقصان کرنے پر بے رغبت ہوں تو کیا کریں؟“ اسی سردار نے پوچھا۔
”پھر بھی یہی کوشش کریں اور اپنے سواروں کو جتا دیں کہ عماد الملک دشمن بھی ہے اور دوست بھی اس کے ساتھ دوستی کا برتاؤ کیا جائے گا۔“

”کوئی آدمی دشمن ہوتا ہے یا دوست ہوتا ہے یہ ایک وقت دشمن اور دوست کیسے ہوتا ہے ہم سمجھ نہیں سکتے۔“ ایک سردار نے پوچھا۔

”عماد الملک کے دشمن ہونے کا آپ سب جانتے ہیں؟“ شاہ ولی نے پوچھا۔
”جب قندھار سے چلے تھے اسی وقت سے سب جانتے ہیں کہ ہم عماد الملک کے خلاف لڑنے جا رہے ہیں۔“ اسی سردار نے کہا۔

”عماد الملک مظفانی بیگم کا داماد ہے اور بادشاہ معظم بیگم صلابہ کو دختر عزیز کہہ چکے ہیں اس لئے وہ دوست بھی ہے۔“ شاہ ولی خان نے مجلس برخواست کرنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ہم خود آپ کے پیچھے آ رہے ہیں ہم وزیراعظم ہند کا استقبال کرنے جا رہے ہیں جو سردار فوج کے ساتھ نہیں جا رہے وہ ہمارے ساتھ جانے کی تیاری کریں۔“

افغان سردار اپنے اپنے دستوں کے ہمراہ شاہجہان

پت میں عماد الملک اور شاہ ولی خاں کے خیمے ساتھ ساتھ سوار ہو کر شاہ ولی خاں کے کیمپ کی طرف چلے گئے۔ مغل وزیراعظم کا ہاتھی ان کے ساتھیوں کے گھوڑے اور فوج کے سوار اور پیادے اسی ترتیب سے پیچھے چلے آ رہے تھے۔

شاہ ولی خاں کے کیمپ میں مغل وزیراعظم اور ان کے ساتھیوں کی شاہانہ مہمان نوازی کی گئی تحائف کے تبادلہ کے بعد عماد الملک اور شاہ ولی خاں اپنے اپنے امراء کے ہمراہ مصالحتی امکانات پر غور کرنے لگے۔ عماد الملک جانتے تھے کہ شاہ ولی خاں کا احمد شاہ ابدالی پر بہت اثر ہے اور وہ ان کی رائے اور مشورہ کو بہت اہمیت دیتے ہیں اس لئے وہ ان کے لئے اور ان کے امراء کے لئے بڑے قیمتی تحائف لائے تھے اور ساری سفارتی مہارت ان پر صرف کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

احمد شاہ ابدالی کا اپنا کیمپ پیچھے سوئی پت کے قریب تھا جیسے ہی عماد الملک شاہ ولی خاں کے کیمپ میں پہنچے انہوں نے تیز رفتار سواروں کو بادشاہ کے کیمپ روانہ کر دیا تاکہ وہ شاہ کو عماد الملک کی آمد کی اطلاع کر دیں۔

شاہ ولی خاں نے عماد الملک کو اپنی طرف سے کوئی یقین دہانی کرائے سے معذوری ظاہر کی البتہ بادشاہ معظم کے لطف و کرم اور مغلانی بیگم کے لئے ان کے دل میں عزت و احترام کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ "بادشاہ معظم کے مشفقانہ سلوک پر دشمن بھی ایمان رکھتے ہیں۔"

شاہ ولی خاں عماد الملک کو ساتھ لے کر اسی روز سوئی پت روانہ ہو گئے۔ ان کے ہمراہ افغان سواروں کا دستہ تھا کیونکہ عماد الملک کی فوج کو شاہ ولی خاں کے کیمپ میں ہی روک لیا گیا تھا۔ عماد الملک اور اس کے ساتھی اب عملاً شاہ ولی کی حراست میں تھے عماد الملک کے لئے یہ صورت حال بہت تکلیف دہ تھی مگر شاہ ولی کے مشورہ پر عمل کرنے کے سوا اس کے لئے کوئی چارہ نہ تھا۔ سوئی

پت میں عماد الملک اور شاہ ولی خاں کے خیمے ساتھ ساتھ نصب کئے گئے۔ ان کے امراء اور ساتھی بھی اسی کیمپ میں ٹھہرائے گئے بادشاہ معظم کا کیمپ ذرا فاصلہ پر تھا۔ شاہ ولی خاں کے حکم پر چار ہزار افغان سوار عماد الملک کے کیمپ کے گرد متعین کر دیئے گئے۔ شاہ ولی خاں نے عماد الملک کو یقین دلایا تھا کہ بادشاہ معظم اسی شب انہیں شرف باریابی سے سرفراز فرمائیں گے لیکن احمد شاہ ابدالی نے پیغام بھجوایا کہ آج ان کی حاضری کی درخواست قبول نہیں کی جا سکتی شاہ کے جواب سے عماد الملک کو اور بھی مایوسی ہوئی۔

طہماس خاں نے سوئی پت پہنچتے ہی مغلانی بیگم کو عماد الملک کی آمد کی اطلاع کر دی تھی اور بتایا تھا کہ وہ ان کا اور احمد شاہ ابدالی کا پیغام ان تک نہیں پہنچا سکے تھے۔ بیگم کے لئے دونوں باتیں پریشان کن تھیں اسے امید نہیں تھی کہ شاہ ولی خاں بادشاہ معظم کا پیغام لے جانے والے اچھیوں کو محافظہ دستہ فراہم نہیں کرے گا۔ وہ پریشان تھی کہ بادشاہ کے مراسلہ اور حکم کو جانتے ہوئے اس نے اتنی لاپرواہی کی جرأت کیسے کی؟ وہ شاہ ولی خاں کے رویہ کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے لگی تو اسے شبہ ہوا کہ شاہ ولی خاں کو اس کے خفیہ پیغام کے بارے میں کہیں شک تو نہیں پڑ گیا اس نے طہماس خاں اور عاقل خان کی کلاہ منگوا کر انہیں کھول کر دیکھا تو اس کی پریشانی بڑھ گئی اور اسے یقین ہو گیا کہ شاہ ولی کے جاسوسوں نے ان کی کلاہ بدل دی ہیں اور طہماس خاں کی کلاہ میں چھپایا گیا اس کا مراسلہ بادشاہ معظم تک پہنچ گیا ہوگا۔

وہ رات مغلانی بیگم اور عماد الملک دونوں نے اپنے اپنے خیموں میں جاگ کر گزاری دونوں اپنے اپنے مستقبل کے بارے میں پریشان تھے اگرچہ دونوں کی پریشانی کی وجوہ الگ الگ تھیں۔ مغلانی بیگم نے اپنے مہربان احمد شاہ ابدالی کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی تھی جس کی اس سے امید نہ کی جاتی تھی اور عماد الملک نے ابدالی کی

تو بیگم نے سر ہلا کر اذن باریابی کا اشارہ دیا اور ایک ریشمی تھیلی میں سے کچھ ڈھونڈنے لگی۔ سرفراز آداب بجا لا کر سامنے دست بستہ کھڑا ہو گیا۔

”ہم چاہتے ہیں کہ تم سورج کے فلک پینائی شروع کرنے سے پہلے شاہجہان آباد روانہ ہو جاؤ لمبھاس خان اور عاقل خان بھی تمہارے ساتھ جائیں گے۔“ اس نے ریشمی تھیلی سرفراز خاں کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔
”وہاں بیگم سے ہمارا سلام کہو اور چاہیاں ان کے حوالے کر دو زور دو جہاز جو کچھ وہ تمہارے حوالے کریں جائے معینہ پر محفوظ کر دو اور جب تک ہم خود نہیں پہنچ جاتے حویلی کی پہریداری میں مستعد رہو۔“

”حضور کے حکم کی تعمیل ہوگی۔“ سرفراز خاں نے جھک کر جواب دیا اور خیمے سے باہر نکل گیا۔

بیگم انھی اور خیمے میں ٹھیکے لگی پردے کے پیچھے کھڑی خادمہ نے غور سے دیکھا تو اسے بیگم کا چہرہ شہدائ کی روشنی میں اور بھی زرد دکھائی دیا اس نے آنکھیں جھکا لیں تاکہ بیگم کو اس کی گستاخی کا صدمہ نہ ہو جائے۔

”سرفراز خاں کو حاضر کرو۔“ بیگم کو ٹھیکے ہوئے کچھ یاد آیا۔

سرفراز خاں پریشانی کے عالم میں کمرے میں داخل ہوا۔ ”حضور نے خادم کو یاد فرمایا تھا۔“ اس نے دیکھا کہ بیگم نے اس کے داخلہ اور آداب کا کوئی نوٹس نہیں لیا تھا۔
”ہم نے تم سے عہد الملک سے رابطہ کے لئے کہا تھا۔“ بیگم نے پوچھا۔

”نواب وزیراعظم کے خیمہ پر متعین افغان سپاہی اتنے چوکس ہیں کہ ہوا بھی ادھر کا رخ نہیں کرتی۔“ سرفراز نے جواب دیا۔

”ہم نے ہوا سے نہیں تم سے کہا تھا ہوا کہہ رہی ہے مگر رتی ہے ہمیں یہ جاننے کی ضرورت نہیں۔“ بیگم نے

منہ بولی جینی کو اغوا کر کے اس کے زیر قبضہ پنجاب مغلیہ سلطنت میں شامل کر لیا تھا جس کی اسے معافی ملنا دشوار معلوم ہوتا تھا وہ دونوں اپنے خاندان کے شاندار ماضی کا سفر مکمل کر کے کئی بار اپنے خیموں میں واپس آئے جہاں سے اب وہ اپنی مرضی سے باہر بھی نہیں نکل سکتے تھے۔

احمد شاہ ابدالی کی لشکرگاہ میں نماز فجر کی اذان ہوئی تو شب بیدار ساس اور داماد نے وضو کیا اور اپنے اپنے خیمے میں سجدہ میں سر رکھ کر دعائیں مانگنے لگے دونوں کی دعاؤں کے الفاظ الگ الگ تھے مگر مفہوم ایک ہی تھا ان کی زندگیوں میں شاید یہ پہلا موقع تھا جب وہ ایک ہی مفہوم کی دعائیں مانگ رہے تھے۔

شاہ جہاں آباد کے برجوں کے نیچے دور دور تک افغان فوجوں کے خیمے پھیلے ہوئے تھے۔ عہد الملک کے حلیف مرہٹہ سردار اپنی فوج سمیت سورج مل جلنے کی راہدہائی ستھرا کی طرف بھاگ گئے تھے۔ سلطنت مغلیہ کا وزیراعظم نربلہ کے نواح میں احمد شاہ ابدالی کی لشکرگاہ کے ایک خیمے میں زیر حراست پڑا تھا۔ شاہجہان آباد کا سب سے طاقتور وادعینجب الدولہ اپنی فوج سمیت ابدالی کے ساتھ شامل ہو چکا تھا۔ قلعہ معالی میں شہنشاہ عالمگیر ثانی اور شہر میں کوتوال مغل شہنشاہیت کی دو ہی نشانیاں باقی رہ گئی تھیں۔ علمائے شاہجہان آباد سجدہ ریز پوری میں جمع تھے اور حضرت نظام الدین اولیاء کی درگاہ پر درویش نعرے لگا رہے تھے۔ ”آنے والا آئے گا جانے والا جائے گا۔“

محفل سماع کے شرکاء جھوم رہے تھے اور موسم سرما کا ٹھنڈا ہوا چاند جامع مسجد کے میناروں کے اوپر سے جھک کر احمد شاہ ابدالی کی لشکرگاہ میں جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا جس کے ایک کونے میں مغلائی بیگم اپنے شاندار خیمے میں گاؤں بکری سے ٹھیک لگائے آنکھیں بند کر کے بیٹھی تھی۔ پردے کے پیچھے سے خادم نے سرفراز خاں کی آمد کی اطلاع دی

ناراضگی سے کہا۔

”خادم شرمندہ ہے۔“ سرفراز خاں نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

”یہ جاننا کچھ دشوار نہ تھا کہ بادشاہ معظم کب عماد الملک کو شرف باریابی عطا فرما رہے ہیں۔“ بیگم نے پوچھا۔

”بادشاہ معظم آج رات کسی وقت وزیراعظم ہند کو شرف باریابی بخشنے والے ہیں۔“ سرفراز خاں نے بتایا۔

”ہمارے لئے یہ جاننا لازم ہے کہ بادشاہ معظم نے عماد الملک کے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے اور یہ ہم تمہارے شاہجہان آباد روانہ ہونے سے پہلے جاننا چاہتے ہیں۔“ بیگم نے حکم دیا۔

”خادم کی پوری کوشش ہو گی کہ حضور کے سامنے شرمندہ نہ ہوتا پڑے۔“ سرفراز خاں نے دایاں ہاتھ سینے پر رکھ کر سر جھکا دیا۔

”افغان وزیراعظم کے ساتھی امراء سے معلوم ہو سکے کہ ان سے رابطہ کریں۔“ بیگم نے ہدایت کی۔

”حضور کے ارشاد کی تعمیل ہو گی۔“ سرفراز خاں نے جواب دیا۔

احمد شاہ ابدالی کے دیوان مشاورت کے دروازے کے سامنے افغان سردار دو قطاروں میں کھڑے تھے قدیلوں نے دور تک رات کی سیاہی دھو کر زمین پر سنہری فرش بچھا دیا تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے تیز جھوکے افغان سرداروں کے ڈھیلے ڈھالے لباسوں میں گھسنے کی ناکام کوششیں کر رہے تھے۔ شاہ ولی خان اور عماد الملک کو دور سے آ کر دیکھ کر ایک سردار نے اپنے قریب کھڑے سردار سے سرگوشی کی۔ ”وزیراعظم ہند اور ان کے ساتھیوں کے

لباسوں پر کون سا ہتھیار زیادہ چمکا ہو گا؟“

”ہیرے کی مالا اور سنہری ٹنجر۔“ اس نے سرگوشی میں ہی جواب دیا۔

دونوں سردار مسکرا دیے۔

”ان میں سے کتنے ہیں جو کبھی میدان میں اترے ہوں گے۔“ اس نے دوسرا سوال کیا۔

”صرف ایک۔“

”کون سا؟“

”وہ جو دہائی طرف چلا آتا ہے۔“ اس نے بہادر خاں بلوچ کی طرف اشارہ کیا۔ ”باقی تو قلعہ معلیٰ کے دیوان خاص کے معرکوں کے مجاہد ہی معلوم دیتے ہیں۔“

”شہنشاہ ہند کے امراء دیوان خاص کی جنگ کے بہت دھنی بتاتے جاتے ہیں۔“

”اسی مہارت کی بدولت تو وہ وزیراعظم کے سفارتی دستے میں شامل کئے گئے ہیں۔“

”بادشاہ معظم ان سے مل کر زیادہ خوش نہیں ہو سکتے۔“

”یہ تو چمکا ہو گا ہمیں شاہجہان آباد دیکھنے کا موقع مل جائے گا۔“

”وزیراعظم ہند اور ان کے ساتھیوں کے لباسوں سے یہاں تک ٹپکنے والی خوشبو سے اندازہ ہوتا ہے شاہجہان آباد میں عطر بہت نرس دستیاب ہیں۔“

وہ دونوں مسکرانے لگے۔

شاہ ولی خان اور عماد الملک سرداروں کی قطاروں کے قریب پہنچ گئے تو ان کے ساتھ چلنے والا افغان دستہ رک گیا۔ بادشاہ کے ندیم خاص نے آگے بڑھ کر وزیراعظم ہند کا استقبال کیا اور سرداروں کی قطاروں کے درمیان سے چلتا ہوا انہیں دیوان خاص کی طرف لے چلا۔ نساچی پاشی نے اپنے ہاتھ سے خیمہ خاص کا پردہ ہٹا کر مہمانوں کی آمد کا اعلان کیا تو احمد شاہ ابدالی اپنی نشست

دیتے ہوئے لکھا تھا کہ وہ ان کی طے کردہ شرائط قبول کر لیں گے اور اس مصالحت سے مسلمانان ہند دلی مسرت محسوس کریں گے۔ مغل شہنشاہ نے پنجاب میں سکھوں اور جنوب میں مرہٹوں کی ابھرتی ہوئی قوت کا ذکر کر کے لکھا تھا کہ مسلمانان ہند کے وجود کے تحفظ کے لئے شاہجہان آباد اور قندھار کو ایک دوسرے سے مشاورت اور تعاون سے دین کی دشمن قوتوں کا مقابلہ کرنا چاہئے اور یہ کہ بادشاہ قندھار کی طرف سے مصالحت سے ہند کے مسلمانوں کی قوت میں اضافہ ہوگا اور شہنشاہ ہند دین دشمن قوتوں کو کچلنے کی طرف توجہ دے سکیں گے۔

عرض نیلی ہاشی مراسلہ ختم کر چکا تو بادشاہ نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا، آداب عرض کر کے بیٹھ گیا۔ عماد الملک اور ان کے ساتھی بادشاہ کے چہرے سے ان کے رد عمل کا اندازہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

”مابدولت یہ سن کر خوش محسوس کرتے ہیں کہ شہنشاہ ہند مسلمانان ہند کے وجود اور مفاد کے تحفظ کا احساس رکھتے ہیں۔ افغان فوجیں اس نیک کام میں ان کی ہر طرح سے مدد کریں گی۔“ بادشاہ یہ کہہ کر رک گئے۔ عماد الملک اور ان کے ساتھیوں نے سر جھکا کر بادشاہ کا شکر یہ ادا کیا۔

”شاہجہان آباد کے علماء اور ملت اسلامیہ کا درد کا رکھنے والے امراء نے مابدولت کو مرہٹوں اور جانوں کی اسلام دشمن سرگرمیوں کی تفصیلات لکھ کر درخواست کی تھی کہ ہم خود ان کی مدد کریں مسلمان جہاں بھی تکلیف میں ہوں ان کی مدد کرنا مابدولت اپنا دینی فرض سمجھتے ہیں اور اسی فرض نے ہمیں یہاں آنے پر مجبور کیا ہے۔ افغان امراء اور سپاہی اسی مقصد کے لئے یہاں آئے ہیں یہ سردار اور امراء سنتا چاہیں گے کہ وزیراعظم ہند غازی الدین عماد الملک اور ان کے ساتھی اس بارے میں کیا کہتا

پر کھڑے ہو گئے۔ دربار میں موجود دیگر افغان امراء بھی اپنی اپنی نشستوں کے سامنے مودب کھڑے ہو گئے۔ خیمے کے اندر قدم رکھتے ہی عماد الملک اور ساتھی تعظیم کے لئے جھک گئے۔ چند قدم چل کر خیمے کے درمیان پہنچ کر انہوں نے ایک بار پھر جھک کر آداب عرض کیا مگر بادشاہ کے چہرے پر متانت چھائی رہی عماد الملک نے آگے بڑھ کر ان کے قدموں کو چھونا چاہا تو ابدالی نے اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھا دیا اس نے بادشاہ کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں لے کر چومنا چاہا مگر ندیم خاص نے اشارے سے منع کر دیا اور بادشاہ کی دایمیں طرف کی نشست کی طرف اشارہ کیا۔ عماد الملک افغان دربار کی سادگی سے حیران آہستہ چلتا ہوا نشست پر بیٹھ چکا تو بادشاہ بھی تشریف فرما ہو گئے وزراء اور امراء بھی اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ عماد الملک اور ان کے ساتھ سر جھکائے بیٹھے نئی نظروں سے ماحول کا جائزہ لے رہے تھے۔ ندیم خاص استقبالیہ کلمات ختم کر چکے تو عماد الملک نے عباد اللہ کشمیری کی طرف دیکھا وہ اٹھا اور سنہری جزدان میں لپٹا مراسلہ پیش کرنے کی اجازت چاہی عرض نیلی ہاشی نے ان سے مراسلہ وصول کر کے کھولا اور بادشاہ کی اجازت سے بلند آواز میں پڑھنا شروع کیا۔ احمد شاہ ابدالی شہنشاہ ہند کا مراسلہ بڑے غور سے سننے لگے۔

شہنشاہ ہند عالمگیر ثانی نے ایک بار پھر افغان بادشاہ سے مصالحت کی درخواست کی تھی اور باعزت شرائط قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کی تھی۔ مغلائی حکیم کے اغوا اور پنجاب پر قبضہ پر افسوس ظاہر کرتے ہوئے مغل شہنشاہ نے اپنی طرف سے یقین دلایا تھا کہ مغل دربار کی طرف سے آئندہ کوئی ایسی کارروائی نہیں کی جائے گی جو بادشاہ کا بل و قندھار کے شاہانہ وقار کے منافی ہو اور جس سے دونوں برادر مملکتوں کے درمیان تلخی پیدا ہو۔ شہنشاہ ہند نے اپنے وزیراعظم کو صلح کی شرائط طے کرنے کا اختیار

سے ہم توقع رکھتے ہیں کہ وہ شہنشاہ ہند کی درخواست کو شرف قبولیت بخشیں گے اور اپنے سرداروں اور فوجوں کو واپسی کا حکم دے کر شہنشاہ اور اسلامیان ہند کی قوت کو استحکام بخشیں گے۔

عماد الملک نے ایک دفعہ پھر شکریہ ادا کیا اور اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔

دربار میں خاموشی تھی افغان امراء اور سردار نظریں جھکائے بیٹھے تھے اور عماد الملک کے ساتھی چور نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

”بادشاہ! یہ جان کر ہرگز خوش نہیں ہوئے کہ شہنشاہ ہند کے وزیر اعظم میدان جنگ میں ہم سے ملاقات کرنے کی بجائے ہمارے خیمہ میں حاضر ہیں اور ہم سے واپس چلے جانے کی درخواست کر رہے ہیں۔ کسی وزیر اعظم کے لئے ایسی حاضری اور درخواست باعث تکبریم نہیں ہوا کرتی۔“ بادشاہ نے عماد الملک اور ان کے ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بادشاہ! کیسے یقین کر لیں کہ شہنشاہ ہند کے وہی وزیر اعظم جو کفار کے تعاون سے ہند کی مسلم قوت کو کمزور کرنے میں مصروف ہیں ہمارے جانے کے بعد مسلم قوت کو یکجا کر کے کفار کو چیل دیں گے۔ ہم لفظوں کو نہیں عمل کو دیکھنے کے عادی ہیں۔ شہنشاہ ہند کے وزیر اعظم کے الفاظ ان کے اعمال کی تائید نہیں کرتے بادشاہ! جاننا چاہیں گے کہ وزیر اعظم ہند نے میدان جنگ میں ہم سے مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیوں نہ کیا؟“

بادشاہ کے استفسار پر عماد الملک ایک دفعہ پھر کھڑا ہوا اور فطیما سر جھکانے کے بعد کہا۔ ”بادشاہ! کابل و قندھار اور شہنشاہ ہند کی فوجیں اسلام کی قوت ہیں ہم ان فوجوں کو ایک دوسرے سے لڑا کر اسلام کی وہ قوت کمزور نہیں کر سکتے تھے جو کفار کے خلاف استعمال ہوتا چاہئے۔“

کرنا چاہتے ہیں۔“

احمد شاہ ابدالی نے بات ختم کی تو عماد الملک نے کھڑے ہو کر عرض پیش کرنے کی اجازت چاہی۔

”بادشاہ! افغان امراء اور سردار وزیر اعظم ہند کی عرض سننے کے لئے ہی جمع ہیں اور انہیں اجازت دیتے ہوئے خوشی محسوس کرتے ہیں۔“ بادشاہ نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

عماد الملک نے سر جھکا کر شکریہ ادا کیا اور کہا۔ ”بادشاہ! معظم اور ان کے افغان سرداروں کی غیرت اسلامی کے سب معترف ہیں۔ دوست بھی اور دشمن بھی وجود ہند میں مسلم دشمن طاقتوں کے ناسور پر ان کی فکر مندی اور اسے ختم کرنے کے لئے ان کا جذبہ جہاد اس خطہ کے مسلمانوں کی قوت ہے۔ شاہجہان آباد کے علماء اور امراء کی فکر مندی بلا سبب نہیں ان کی آواز پر حضور عالی مرتبت کا سفر کی صعوبت اٹھانا اس امر کا ثبوت ہے کہ کفار کے مقابلہ میں سب مسلمان ایک ہیں اور بادشاہ معظم کی ذات اور قوت اس اتحاد کی علامت ہے۔“ وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور قوت اٹھا کر چاروں طرف دیکھا۔

احمد شاہ ابدالی اور ان کے امراء اور سردار بڑی توجہ سے اس کی تقریر سن رہے تھے۔

”شہنشاہ ہند اپنی بیوردی روایات کے مطابق اسلامیان ہند کے تحفظ کا عزم رکھتے ہیں۔“ عماد الملک نے کہنا شروع کیا۔ ”شہنشاہ ہند کی طرف سے ہم بادشاہ معظم کو یقین دلاتے ہیں کہ شاہجہان آباد کے عالی مرتبت علمائے کرام اور امراء کے تعاون سے شہنشاہ ہند کفر کے ناسور کو ختم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ بادشاہ معظم اور ان کے امراء اور سرداروں نے اس سفر کی جو صعوبتیں اٹھائی ہیں شہنشاہ ہند کو اس کا احساس ہے وہ اس مہم پر اٹھنے والے اخراجات ادا کر کے خوشی محسوس کریں گے۔“ بادشاہ معظم کی روایتی رحمدلی عالی ظرفی اور شفقت

کا نواب شجاع الدولہ بھی اس سے شادی کرنا چاہتا تھا اس سے علی قلی خان اور شجاع الدولہ کی قوت ہمارے خلاف متحد ہو جاتی جو سلطنت اور خاندان دونوں کے لئے نقصان دہ ثابت ہوتی۔“ عماد الملک اس غیر متوقع صورت حال سے گھبرا گیا۔

”مابدولت حکم دیتے ہیں کہ گناہیگم کو طلاق دے کر مغلانی بیگم کے کیس میں پیش کر دیا جائے مابدولت ان کی دختر کا دکھ ہرگز برداشت نہیں کریں گے۔“ احمد شاہ ابدالی نے حکم دیا۔ ”وزیر اعظم ہند شاہ ولی خاں کے کیس میں رہیں مابدولت نے شہنشاہ ہند کو پیغام بھیجنے کا حکم دیا کہ وہ ہمارے لشکر میں تشریف لائیں تاکہ باہمی مشاورت سے سلطنت ہند کے امور کی اصلاح اور اسلامیان ہند کے تحفظ کے امور طے کئے جائیں۔“ احمد شاہ ابدالی نے کہا اور دربار پر خاست کر دیا۔

افغان وزراء امراء اور سردار سر جھکا کر کھڑے ہو گئے ان کے درمیان میں وزیر اعظم ہند اور ان کے ساتھی اپنے اپنے قدموں پر لگا ہیں بمائے پریشان کھڑے کی سون میں ڈوب گئے تھے۔

بادشاہ عظیم خیمے سے جا چکے تو شاہ ولی خان نے بڑھ کر عماد الملک کو لاسا دیا اور انہیں ساتھ لے کر خیمے سے باہر نکل آئے۔ افغانی امراء اور سردار ان کے دست تک چلتے ہوئے ساتھ گئے اور انہیں روانہ کر کے اپنے اپنے خیموں کی طرف چل دیئے۔

رات کی سیاہی اور بھی گہری ہو گئی تھی۔ عماد الملک گھوڑے پر خاموش بیٹھے تھے۔ شاہ ولی خاں کی سواری ان کے برابر تھی مگر دونوں کو بات شروع کرنے کے لئے موضوع نہیں مل رہا تھا۔ عماد الملک کے ساتھیوں میں عباد اللہ کشمیری زیادہ ہی نڈھال دکھائی دیتے تھے۔ عماد الملک کو احمد شاہ ابدالی کے حضور حاضری پر انہوں نے ہی آمادہ کیا تھا۔

”مابدولت چاہتا چاہیں گے کہ شہنشاہ ہند کی فوج اور قوت پہلے اسلام کی فوج اور قوت کے خلاف کیوں استعمال ہوتی رہی ہے۔“ احمد شاہ ابدالی کا اشارہ عماد الملک کی طرف سے پنجاب پر قبضہ کی کوشش کی طرف تھا۔

عماد الملک نے جواب دیا۔ ”بادشاہ معظم کی شفقت اور ان کے امراء اور سرداروں کی فراہمی سے ہم ماضی کی غلطیوں پر معذرت کرتے ہوئے امید کرتے ہیں کہ ہماری ان غلطیوں سے درگزر فرمایا جائے گا اور یقین دلاتے ہیں کہ آئندہ ایسی گستاخی نہیں ہوگی۔“

”مابدولت چاہتا چاہیں گے کہ حاکم لاہور کی شان میں گستاخی کا مجرم کون ہے؟“

”اس گستاخی کا مجرم بادشاہ معظم کے حضور سزا کے لئے حاضر ہے اور اجازت ہو تو صفائی میں کرنا چاہتا ہے۔“ عماد الملک کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔

”مابدولت نے بھی کسی مجرم کو صفائی کا موقع دینے بغیر سزا نہیں سنائی۔“ احمد شاہ ابدالی کا غصہ الفاظ سے ظاہر تھا۔

عماد الملک نے اس جرم کی سنگینی اور بادشاہ کے غصہ کا اندازہ کرتے ہوئے دو دفعہ عظیم میں سر جھکایا اور کہا۔

”حاکم پنجاب عالی مرتبت حکم عالیہ ہماری والدہ محترمہ کا درجہ رکھتی ہیں وہ ہمارے خاندان کی عزت و ناموس ہیں پنجاب کے حالات اور امراء کی سازشوں سے ان کے سکون اور مقام و مرتبہ کی توہین ہم برداشت نہ کر سکتے۔“

”تم نے اپنی ممانی اور مقام باور پر فائز مغلانی بیگم کی بیٹی سے شادی کے علاوہ علی قلی خان کی بیٹی سے شادی کر کے اپنی والدہ محترمہ کے سکون اور خاندانی عزت میں اضافہ کیا؟ یا نقصان پہنچایا؟“ ابدالی کے غصہ میں اضافہ ہو رہا تھا۔

”گناہیگم سے شادی ہماری سیاسی مجبوری تھی اودھ

کی کوشش کر رہی تھی تاکہ اس کی روشنی میں اپنے اور عماد الملک کے مستقبل کا نیا نقشہ تیار کر سکے۔

”اہل شاہجہان آباد کا خیال ہے کہ بادشاہ معظم احمد شاہ ابدالی مغلیہ تخت پر خود قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ علمائے کرام اس خبر سے خوش ہیں اور آئندہ جمعہ کے خطبہ میں احمد شاہ ابدالی کے نام کا خطبہ پڑھنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ وہ کفار کے خلاف جہاد کا ارادہ رکھتے ہیں اور علمائے کرام جہاد کے حامی ہیں اور مغل شہنشاہ کو پسند نہیں کرتے۔“

”مغل شہنشاہ کو تخت سے اتار کر احمد شاہ ابدالی خود شہنشاہ بن گئے تو وہ اسے پنجاب کی حاکمیت پر بحال کر دیں گے۔ شاہجہان آباد کے علماء نے ابدالی کی مرضی اور خواہش سے ہی ان کے نام کا خطبہ پڑھنے کا فیصلہ کیا ہو گا۔ بیگم کی مایوسی خوشی میں بدل گئی۔ سرفراز خاں ان کی آواز اور الفاظ سے ان کی خوشی کا اندازہ کر کے خود بھی خوش ہونے لگا۔ وہ ان تبدیلیوں کے مستقبل میں سیاسی اور انتظامی اثرات تو نہیں سمجھ سکتا تھا مگر بیگم کی خوشی سے اس نے اندازہ کیا کہ بیگم اور ان کے وابستگان کے لئے یہ تبدیلی اچھی ہی ہوگی۔

”ہم چاہتے ہیں کہ شاہجہان آباد کے حالات کی رپورٹ ہر روز ہم تک پہنچتی رہے۔“ بیگم نے اپنے تربیت یافتہ مخبر کو ہدایت کی۔

”حضور کا نمک خوار حضور کو مایوسی نہیں کرے گا۔“ سرفراز خاں نے سر تسلیم خم کرتے ہوئے کہا۔

”قلعہ معلیٰ کے اندر کی خبریں حاصل کرنے کی کوشش کرو ہم قلعہ کے حالات سے باخبر رہنا لازم جانتے ہیں۔“ بیگم نے ہدایت کی۔

”حضور کے خادم کو اس میں بھی کامیابی ہوگی، قلعہ دار حضور کے مقام و مرتبہ سے مرعوب ہے۔“ سرفراز خاں نے جواب دیا۔

مغلانی بیگم بادشاہ کے لشکر کے ہمراہ وزیر آباد منتقل ہو چکی تھیں۔ عماد الملک کی منصب وزارت سے برطرفی حراست اور اپنے دیور خان خانان انتظام الدولہ کی وزیراعظم ہند کے منصب پر تقرری سے وہ بہت دل گرفتہ تھی۔

”بادشاہ معظم احمد شاہ ابدالی نے نواب نجیب الدولہ کو خلعت عطا کر کے شاہجہان آباد کا انتظام ان کے سپرد کر دیا ہے اور اپنے محافظ دست کو شہر میں لوٹ مار کرنے والوں کو سزا دینے کے لئے شہر میں بھیج دیا ہے۔ ان کے خوف سے فسادیں بھاگ رہے ہیں اور لوگ گھروں کو واپس لوٹ رہے ہیں۔“ سرفراز خاں نے بیگم کو بتایا۔

”ساکنان شاہجہان آباد انتظام الدولہ کے منصب وزارت پر تقرر کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟“ بیگم نے پوچھا۔

”نواب عماد الملک کے مخالف امراء خوش ہیں سلام بلاض ہیں اور عام لوگوں کو اس تبدیلی سے کچھ غرض نہیں۔“ سرفراز خاں نے جواب دیا۔

احمد شاہ ابدالی کی طرف سے خان خانان انتظام الدولہ کو وزیراعظم ہند مقرر کرنے پر علماء و علی کی ناراضگی کی خبر سن کر بیگم کی آنکھوں میں چمک سی آگئی۔ ”نجیب الدولہ اور خان خانان کے باہمی تعلقات کے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟“

”نجیب الدولہ ایک سیاسی ہے اور انتظام الدولہ پیشہ ور درباری نواب نجیب الدولہ پیشہ ور درباری کو پسند نہیں کرتے، وہ کفار کے ساتھ کسی بھی سمجھوتہ کے خلاف ہیں جبکہ انتظام الدولہ ہر قسم کا سمجھوتہ کر سکتے ہیں۔ شہر میں لوگ کہتے ہیں کہ وہ دونوں اکٹھے نہیں چل سکیں گے۔“

”شہنشاہ ہند نجیب الدولہ کو زیادہ پسند کرتے ہیں یا انتظام الدولہ کو؟“ وہ مغل دربار کی نئی گروپ بندی کو سمجھنے

وزیراعظم کے چہرے پر مرکز تھیں شاہ ولی خاں کے آداب کے انداز اور چہرے کے تاثرات سے اسے کچھ حوصلہ ملا۔

شاہ ولی خاں نے اسے زیادہ انتظار کا موقعہ نہیں دیا۔ ”بادشاہ معظم نے حضور کے لئے تحفہ ارسال فرمایا ہے اور مجھے حکم دیا ہے کہ میں خود حضور کی خدمت میں حاضر ہو کر وہ تحفہ پیش کروں۔“

”بادشاہ معظم کی نوازشات نے ہمیں ان کی غلامی کی رنجشوں میں باندھ دیا ہے۔ ہم نہیں جانتے ان کے لطف و کرم اور عزت افزائی کا کیسے شکر ادا کریں۔“ بیگم نے تشکر میں سر جھکا تے ہوئے جواب دیا۔

”بادشاہ معظم نے تحفہ کے ہمراہ اس کی سند بھی عطا ارسال فرمائی ہے۔“ شاہ ولی نے اپنے خادم کی طرف دیکھ کر کہا اور حکم دیا ہے کہ سند بیگم کو با آواز بلند پڑھ کر سنائی جائے۔

بیگم نے مسرت اور حیرانگی کے ساتھ سند حذبات سے ان کی طرف دیکھا۔ خادم نے سند عطا پڑھنا شروع کی۔ ”مابعدولت سماء گنا بیگم دختر علی قلی خاں صاحب ہزاری نواب دربار مغلیہ شاہجہان آباد اپنی دختر عزیز کو برائے خدمت پیش کرتے ہیں۔ گنا بیگم جب تک زندہ رہے ہماری دختر عزیز کی کنیز کی حیثیت میں زندہ رہے گی اور ان کے حکم اور خواہش کے طالع ہوگی۔ سلطنت ہند اور افغانستان میں کسی اور شخص کو گنا بیگم پر کوئی اختیار نہیں ہو گا۔“

بیگم کے چہرے پر خوشیوں کا سیلاب پھیل گیا۔ شاہ ولی کے حکم پر گنا بیگم کو بیگم کے خیمے میں لایا گیا تو خوفزدہ اور سرسیدہ گنا بیگم سر جھکائے چلتے ہوئے بیگم کی نشست تک پہنچی جھک کر ان کے دونوں پاؤں کو ہاتھ لگایا اور ایک طرف کھڑی ہو گئی۔

بیگم نے سر سے پاؤں تک گنا بیگم کو دیکھا اور اس

”ہماری طرف سے اس سے سرپرستی کا وعدہ کرو، تم انعام کا وعدہ کرنے کے لئے مختار ہو۔“

”خادم اس اعتماد کے لئے شکر گزار ہے۔“ سرفراز خان نے سر جھکا دیا۔

”ہم تمہارا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتے کل اسی وقت ہم رپورٹ کے فخر ہوں گے۔“

سرفراز خاں آداب عرض کر کے خیمے سے باہر نکل گیا۔

پردے کے پیچھے کھڑی خادمہ نے اندازہ کیا کہ سرفراز خاں کوئی اچھی خبر سنا کر گیا ہے اس کے چہرے پر بھی خوشی دوڑ گئی۔

افغان وزیراعظم کی آمدی اطلاع پر مغلانی بیگم کو خوشی نہیں ہوئی۔ شاہ ولی خاں کے شان شان مہمان نوازی کا اہتمام کرنے کا حکم دے کر وہ اسی قریب میں گزرے واقعات پر غور کرتی تو اس کی پریشانی بڑھتی جاتی تھی اسے سب سے زیادہ پریشانی عماد الملک کے لئے تھی اسے مراسلہ کے پڑے جانے پر تھی۔ اس نے بادشاہ کے کرم اور وزیراعظم کے اعتماد کو نقصان پہنچا کر بڑے جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ شاہ ولی خاں نے وہ مراسلہ احمد شاہ ابدالی تک پہنچا دیا ہوگا اور اب اس بارے میں بات کرنا چاہتا ہے۔ عماد الملک اس کی حراست میں تھا مگر اس نے بیگم کو آگاہ کرتا بھی پسند نہیں کیا تھا۔ اس نے احمد شاہ ابدالی کا ذاتی مراسلہ لے جانے والے اس کے خدام کو شاہجہان آباد نہیں جانے دیا تھا اور اس کے ایجنٹیوں پر نگران مقرر کر دیئے تھے۔ بیگم کو اس ماضی کا کوئی روشن پہلو نہیں مل رہا تھا۔ کبھی وہ اپنے دل کو تسلی دیتی اور کبھی حالات کا مقابلہ کرنے کے طریقوں پر غور کرنا شروع کر دیتی۔ شاہ ولی خاں ان کے خیمے میں داخل ہوا تو وہ سرو قد کھڑی ہو گئی۔ اس کی نگاہیں افغان

آبادہ نہیں۔ وہ نشست کی طرف مڑی تو گنا بیگم ان کی نشست پر رکھے گاؤں کے درختوں کی طرح تھیں۔ بیگم بیٹھ چکی تو اس نے ان کے جوتے سیدھے کر کے رکھے اور ایک کونے میں سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔

بیگم دیر تک اس کی طرف دیکھتی رہی پھر اشارے سے پاس بلا یا۔ ”آپ کینئر نہیں ہماری بیٹی کی مانند ہیں۔ ہماری کینئریں اور خادماں آپ کا اسی طرح حکم ماننے کی پابند ہوں گی جس طرح ہماری بیٹیوں کا حکم ماننے کی پابند ہیں۔ آپ کو بیٹی کی مانند رہتے دیکھ کر ہمیں خوشی ہوگی۔“

”اب اسٹان در بار شاہی کے مقدر میں شاہوں کے حکم کی تعمیل لکھ رہا ہے۔ بادشاہ وقت کا ہر حکم ماننا ہمارا فرض ہے۔“ گنا بیگم نے خیمے کے تختیوں پر سر رکھا اور گنا بیگم نے کہا۔

”ہم خود بادشاہ معظم کے حکم کے سامنے مجبور ہیں اور جانتے ہیں کہ حاکم اور خادماں میں کیا فرق ہوتا ہے۔“

مغلانی بیگم بھی افسردہ ہو گئی۔

”بادشاہ وقت حکم چلانے کی خدمت سونپیں گے۔ ان کو رہنے کو کہیں ہم ان کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑا تو فرض سمجھتے ہیں اور اس فرض کی ادائیگی میں ہم سے کبھی کوتاہی نہیں ہوگی۔“ گنا بیگم نے قالین کے رنگوں پر غور کرتے ہوئے جواب دیا۔

”بادشاہ وقت نے آپ کو ہمارے حکم کا پابند کیا ہے اور ہمارا حکم ہے کہ ہمارے گھر میں آپ خدام اور خادماؤں کی حاکم ہوں گی، ہم تمہارے دکھ کو محسوس کرتے ہیں۔ تمہیں بلا جرم سزا دی گئی ہے، ہم کوشش کریں گے اس دکھ میں کمی ہو سکے۔“

”بندی حضور کے اس کرم کے لئے شکر گزار ہے۔“

گنا بیگم نے آداب کے لئے سر تسلیم خم کر دیا۔

مغلانی بیگم نے دیکھا کہ اس کی جھیل آنکھوں میں پارے کے قطرے تیر رہے ہیں، وہ اس بارے میں مزید

کرم اور تحفہ کے لئے بادشاہ معظم کا ایک بار پھر شکر یہ ادا کیا۔ ”بادشاہ معظم ہم پر اتنا بڑا کرم کریں گے ہم سوچ بھی نہ سکتے تھے۔ اس بیش قیمت عنایت پر ہماری گردن میں حضور کی غلامی کی زنجیروں کا بوجھ اور بھی بڑھ گیا ہے۔“

بیگم کی نظریں بار بار گنا بیگم کی طرف اٹھ جاتی تھیں جس کے حسن اور رعنائی کا سارے ہندوستان میں چرچا تھا۔ عہدہ بیگم سے شادی کے وقت عماد الملک نے مغلانی بیگم کو قرآن پر حلف لکھ کر دیا تھا کہ وہ گنا بیگم کو حلاق دے دے گا مگر اب تک اس نے یہ وعدہ پورا نہیں کیا تھا۔ اب وہی گنا بیگم بطور کینئر مغلانی بیگم کے سامنے سر جھکائے کھڑی تھی۔ شاہجہان آباد کے امراء کے گھروں میں جس گنا بیگم کے امور سلطنت میں اثر و رسوخ کے تذکرے اور شکوے رہتے تھے آج ان کے گھروں میں کیا کیا تذکرے ہو رہے ہوں گے مغلانی بیگم کا وہی سوالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ عماد الملک کی دربار ابدالی میں حاضری کے بعد سے وہ اس بارے میں بادشاہ معظم کے حکم سے بے خبر تھی اور اپنی خوشی اور حیرانگی چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

شاہ ولی خاں نے گنا بیگم اور بادشاہ معظم کی طرف سے سند عطا پیش کر کے اجازت لی اور آداب عرض کر کے خیمے سے باہر نکلنے لگا تو بیگم نشست سے اٹھ کر دروازے تک اس کے ساتھ گئی۔ ”ہم سمجھتے ہیں آپ ہمارے فرزند عماد الملک کا بھی اتنا ہی خیال رکھتے ہیں جتنا ہمارا۔“

شاہ ولی خاں چلتا چلتا رک گیا۔ ”ہم افغان اپنے مہمانوں کی خدمت میں کبھی کوتاہی نہیں کیا کرتے۔“

اس نے ایک بار پھر آداب کے لئے سر جھکایا اور بیگم کے مزید کچھ کہنے سے پہلے تیزی سے اپنی سواری کی طرف چل دیا۔ وہ اس موضوع پر بیگم سے مزید کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کے رویہ سے بیگم نے محسوس کیا کہ شاہ ابدالی عماد الملک کی غلطیاں معاف کرنے پر

تھی۔

سنگ مرمر کے تازک اندام ستونوں پر تہی متعش
چھت کے نیچے خطیب نے عالمگیر ثانی کے نام کا خطبہ شتم
کر کے نمازیوں کی صفوں کا جائزہ لیا تو اسے کوئی وزیر امیر
اور درباری نظر نہ آیا۔ صفِ اول میں شہنشاہ کے پہلو میں
قلعہ دار اور شہزادے سر جھکائے بیٹھے تھے۔ قلعہ معلیٰ کی
مسجد میں جمعہ کی اتنی کم حاضری کبھی نہ ہوئی تھی۔ شہنشاہ،
شہزادوں اور قلعہ کے حکام پر ایک نظر ڈال کر خطیب نے
بھی نظریں جھکا لیں اور رخ بدل کر محراب میں کھڑا ہو
گیا۔ نماز کے بعد اس نے حسب دستور شہنشاہ کی سلطنت
اور حکمرانی کی برکتوں اور نعمتوں کے سدا جاری رہنے کی
دعا کی مگر اس کا اپنا دل اس دعا کی قبولیت پر یقین نہیں
رکھتا تھا۔ اس کی دعا کے خالی الفاظ کے جواب میں
نمازیوں نے بھی خالی از سوز "آمین!" کہا اور شہنشاہ کے
مردم جمع ہو گئے۔ سلام و آداب پیش کرنے لگے۔ خطیب
خاموش بیٹھا شہنشاہ، شہزادوں اور عمال کے چہروں پر کسی
وقت کی خیریں پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شہنشاہ روادگی
کے لئے اٹھا تو ساتھ چھوٹا سا جلوس بن گیا قلعہ کے
میدانوں پر اوئے نیچے دیوانوں اور برجوں کے سائے قابض
ہو چکے تھے۔ شہنشاہ بار بار نظر اٹھا کر ان دیوانوں کی
طرف دیکھتا، ان دنوں کو یاد کرنا ہوا آہستہ آہستہ چلا جا رہا
تھا۔ جب ان میں بیٹھنے والوں کے نام سے مشرق و
مغرب کے حکمرانوں کے دل کی حرکت تیز ہو جایا کرتی
تھی نماز جمعہ کے بعد امراء، وزراء اور درباری تسبیح خانہ
میں شہنشاہ کے حضور حاضری دیا کرتے تھے، وہ روایت
شہنشاہی کے مطابق تسبیح خانہ میں داخل ہو کر اپنی مخصوص
نشست پر جلوہ افروز ہو چکا تو حاضر عمال ایک بار پھر
روایتی آداب پیش کرنے لگے۔ عبدالاحد خاں دروازے
میں داخل ہوا اور آداب کے لئے جھک گیا۔ بادشاہ نے

گنگو سے گناہ بیگم کا پناہ ممبر چھلکا دیکھنے سے بچنا چاہتی
تھی اسے اپنے برابر نشست پر بیٹھنے کو کہہ کر بیگم نے
رودے کے پیچھے کھڑی کنیز کو اشارہ کیا جو جب سے گنا
بیگم خیمے میں داخل ہوئی تھی بڑے تجسس میں تھی۔
"گل ہنشا کو حاضر کرو۔"

خادمہ آداب عرض کر کے اگلے قدموں باہر نکل
گئی۔

مغلانی بیگم گنا بیگم کی طرف دیکھنے لگی جو نظریں
جھکائے انگلیوں سے قالین کے تاروں میں کوئی درد بھرا
سُر جھڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔

گل ہنشا خیمے میں داخل ہو کر آداب کے لئے جھکی
تو اس کی نظریں پھر بھی گنا بیگم سے الگ نہ ہو سکیں اس
نے شیش محل سے حاکموں کی خدمت شروع کی تھی۔
مغلانی بیگم کی اپنی جوانی دیکھی تھی مگر کسی خاتون کے من
پریشان نے اسے اس طرح کبھی پریشان نہیں کیا تھا۔

"ہماری بیٹی اس جلا وطنی کے دکھ میں شرکت کرنے
ہمارے پاس آئی ہے ہمیں امید ہے کہ اس کے آرام اور
خدمت میں تم سے کوئی کوتاہی نہیں ہوگی۔" مغلانی بیگم
نے گنا کی طرف دیکھتے ہوئے حکم دیا۔

گل ہنشا نے سر جھکا کر گنا بیگم کو سلام کیا۔

"ان کے لئے خیمہ آداب کو دیں اور ضروریات
آرام فراہم کر کے ہمیں اطلاع دیں۔" بیگم نے حکم دیا۔

گنا بیگم بے نیازی سے انھی آداب کے لئے جھکی
اور کسی کی طرف دیکھے بغیر خیمے سے باہر نکل گئی جیسے
مغلانی بیگم ان کا خیمہ گل ہنشا کچھ بھی وجود نہ رکھتا ہو اس
کے اپنے سمیت سب کچھ لے وجود ہو۔

مغلانی بیگم اسے جاتا دیکھتی رہی چند ہی لمحے بعد وہ
گنا بیگم کا غم بھول چکی تھی اور احمد شاہ ابدالی کی طرف سے
عماد الملک کو گنا بیگم کو طلاق دے کر بطور کنیز اسے پیش
کرنے کے شاہی فرمان کے سیاسی اثرات کا تجزیہ کر رہی

”مابدولت یہ نتیجہ اخذ کرنے میں غلطی پر تو نہیں کہ افغان بادشاہ کے نام کا خطبہ پڑھنے کے فیصلہ میں مفتی اعظم اور دیگر علماء سب شریک ہوئے۔“

”دکھ سے کہنا پڑتا ہے کہ حضور والا مقام کا اندازہ درست ہے۔“

”شہر کی دیگر مساجد میں کس کے نام کا خطبہ پڑھا گیا؟“

”غلام کی زبان یہ بتاتے ہوئے لرز جاتی ہے کہ جامع مسجد کے خطیب نے بھی احمد شاہ ابدالی کے نام کا خطبہ پڑھا۔“

”شہنشاہ خاموش ہو گیا حاضرین نظریں فرش پر جمائے بیٹھے تھے۔“

”کچھ دیر مکمل خاموشی رہی دربان کی طرف سے کسی کے حاضری کے لئے آنے کی بھی کوئی درخواست پیش نہ کی گئی تو شہنشاہ کھڑے ہو گئے۔ حاضرین سر جھکائے اپنے اپنے قدموں کی طرف دیکھتے گئے۔ بادشاہ معظم اپنے خدام کے دست کے ساتھ بیچ خانہ سے نکل کر محل سرا کی طرف چل دیئے۔ ان کے جا چکنے کے بعد محل قلعد بھی بیچ خانہ سے نکل کر اپنے اپنے مقام کار کی طرف روانہ ہو گئے۔ کوئی کسی سے بات کرنے کی کوشش بھی کرتا تو دوسرا جواب نہ دیتا۔ وہ از حال ہی سو سالہ مغلیہ عروج کے ورق آخر میں کوائف میں لغتی کوشش کے بھی خلاف تھے۔“

”محل سرا کے دروازے پر رک کر شہنشاہ نے قلعد دار کو حکم دیا کہ ان کے اور ان کے وابستگان کے اندرون قلعد ان کی ذاتی حویلی میں منتقل کئے جانے کا اہتمام کیا جائے۔“

”قلعد دار نے سر تسلیم خم کر دیا۔“

”اسی شب عالمگیر ثانی شہنشاہ ہند کی محل سرا خالی کر گئے۔ مغلیہ دربار کے وزراء امراء اور درباری سب احمد

آداب قبول کیا تو وہ امرائے دربار کے لئے مخصوص نشستوں کی طرف بڑھا اور اپنے مرتبہ کی مخصوص نشست پر بیٹھ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ وزراء، امراء اور درباری آج کہاں ہیں پھر بھی اس نے اپنے ارد گرد خالی نشستوں کا جائزہ لیا۔ ماحول میں افسردگی تھی اور شہنشاہ کے چہرے سے بے چارگی فلک رتی تھی۔“

”نماز جمعہ سے غیر حاضری مقدر کی سیاحتی شہنشاہ معظم اس کے لئے درگزر فرمادیں۔“ عبدالاحد خاں نے عرض کیا۔ ”یہ خاموشی کی مساجد میں احوال کا جائزہ لینے میں مصروف رہا۔ نماز روشن الدولہ کی مسجد میں ادا کی اور حاضری کے لئے پیش ہو گیا۔“

”مابدولت جانتا چاہیں گے کہ شاہجہان آباد کی مساجد میں عبدالاحد خاں نے کیا دیکھا؟“ عالمگیر نے پوچھا۔

”شہنشاہ معظم کی درازی عمر اور اقبال کی بلندی کے لئے شب و روز دعا گو یہ غلام عرض گزار ہے کہ جو دیکھا اس کے بیان کے لئے معاف فرمایا جاوے۔“

”عبدالاحد خاں کی آنکھ نے جو دیکھا اسے زبان پر لاتے ہوئے اس کوئی خوف نہیں ہوتا چاہئے۔“ شہنشاہ نے آواز میں رعب پیدا کرنے کی کوشش کی۔

”غلام یہ اعلان دیتے ہوئے کرب میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ روشن الدولہ کی مسجد میں قاضی ہند نے شہنشاہ ہند کی بجائے افغان بادشاہ کے نام کا خطبہ پڑھا۔“ عبدالاحد خاں اتنا کہہ کر رک گیا۔

”شاہجہان آباد کے مقتدر علماء میں سے اور کس کس نے مفتی ہند کی افتدائیں نماز جمعہ ادا کی؟“ شہنشاہ کی آواز کا رعب کمزور پڑ گیا۔

”مفتی سلطنت اور شاہجہان آباد کے بیشتر علماء نے روشن الدولہ کی مسجد میں نماز ادا کی۔“ عبدالاحد خاں نے بتایا۔

اور وزراء نے بادشاہ کے دربار میں اپنے اپنے مقام و مرتبہ کے تحفظ اور حصول کی دوڑ میں لگے ہوئے تھے اور احمد شاہ ابدالی کے حضور پیش ہو کر اپنی وفاداری کا یقین دلانے کی کوششوں میں مصروف تھے۔

سرفراز خاں نے رکوع ادب سے سراٹھا کر بیگم کو مراسلہ پیش کیا۔ ”بیگم عالیہ عمدہ بیگم نے حضور کو سلام عرض کیا ہے اور یہ مراسلہ ارسال فرمایا ہے۔“ مغلانی بیگم شاہجہان آباد اور قلعہ معلیٰ کے حالات جاننے کو بیتاب تھی۔ بیٹی کا مراسلہ ایک طرف رکھ دیا۔ ”ہم سمجھتے ہیں بادشاہ معظم قلعہ معلیٰ میں داخلہ کی تیاریاں کر رہے ہیں۔“ ”بادشاہ معظم کے سالار اعظم شاہجہان آباد پہنچ چکے ہیں اور بادشاہ معظم کے بیٹوں کے قلعہ معلیٰ میں اترنے کی تیاریوں کی خود نگرانی کر رہے ہیں۔“ سرفراز خاں نے بیگم کے اندازہ کی تصدیق کر دی۔ ”شہنشاہ ہند عالمگیر ثانی کے بارے میں ساراہ اطلاع کیا ہے؟“ بیگم نے سرفراز خاں کی تصدیق پر خوش ہوتے ہوئے سوال کیا۔

”جامع مسجد کے خطیب اور صدر الصدور قاضی کی طرف سے افغان بادشاہ کے نام کا خطبہ پڑھنے کی خبر پا کر مغل شہنشاہ محل سراخانی کر چکے ہیں۔“ بیگم کی خوشی میں اضافہ ہو گیا۔ ”شاہجہان آباد کی کسی مسجد میں عالمگیر ثانی کے نام کا خطبہ بھی پڑھا گیا؟“ ”قلعہ معلیٰ کی مسجد کے علاوہ کسی مسجد سے ایسی خبر نہیں ملی۔“

”شاہجہان آباد کے بازار کھلے ملے یا بند تھے؟“ ”بازار اور منڈیاں کھلی ہیں، خریدار کم ہیں اور اشیائے ضرورت کم تر۔ نجیب الدولہ نے افغان دستوں کی مدد سے شہر میں امن بحال کر دیا ہے۔“ ”قلعہ معلیٰ میں بادشاہ معظم کے اترنے کے اہتمام

ساتھ ابدالی کے حضور حاضر ہو چکے تھے۔ ابدالی نے خان خاں انتظام الدولہ کو جب سے وزیر اعظم ہند مقرر کیا تھا وہ ان کے حضور حاضر رہتے تھے۔ شہر کا انتظام احمد شاہ ابدالی کے مقرر کردہ ناظم شہر کے پاس تھا اور صدر الصدور قاضی اور مفتی نے احمد شاہ ابدالی کے نام کا خطبہ جاری کرنے کا جو فیصلہ کیا تھا جامع مسجد کے خطیب نے بھی اس کی پابندی کی تھی۔ اس کے لئے یہ نتیجہ اخذ کرنا بجا تھا کہ شہنشاہ ہند کی محل سرااب ان کا مقام نہیں رہا۔ وہاں احمد شاہ ابدالی جیسے چاہیں گے داخل کریں گے۔ عالمگیر ثانی نے ابدالی کے حکم سے شہنشاہی محل سے نکالے جانے کی بجائے خود ہی محل خالی کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ انہیں شبہ بھی نہیں گزرا ہوگا کہ صدر الصدور قاضی اور مفتی کو روشن الدولہ کی مسجد میں جمع کر کے ان سے احمد شاہ ابدالی کے نام کا خطبہ پڑھنے کا فیصلہ کرانے والوں میں سب سے سرگرم یعنی عبدالاحد خاں تھا جو انہیں یہ اطلاع دینے آیا تھا کہ علماء شہر نے آج خطبہ جمعہ سے اس کا نام نکال دیا ہے اور شہر سے باہر وزیر آباد میں مقیم افغان بادشاہ احمد شاہ ابدالی کا نام شامل کر لیا ہے۔

عالمگیر ثانی کے محل سراخانی کر جانے کے بعد ہندوستان کا تخت بھی خالی ہو گیا۔ قلعہ معلیٰ اور ہندوستان میں اب کوئی حکمران نہیں تھا، اب ایک قلعہ تھا اور شہر سے باہر مقیم احمد شاہ ابدالی تھا جو ابھی تک اپنے کو بادشاہ کا بل و قدح ہار ہی کہلاتا تھا۔ مرہٹے عماد الملک کی حراست اور وزارت سے علیحدگی پر ناخوش ہوئے تو جات خوش تھے مگر احمد شاہ ابدالی کے خلاف دونوں اب بھی متحد تھے۔ ان کی فوجیں شاہجہان آباد کے نواح میں موجود تھیں۔ جہان خاں نے جہان کے اس پار فرید آباد کے راستہ کی ناکہ بندی کرنا چاہی تو منکیشور راؤ کی فوجوں نے سورج مل کے جاٹ دستوں کے ساتھ مل کر سخت مقابلہ کیا۔ شاہجہان آباد کے علماء اس صورت حال سے خوش نہیں تھے اور امراء

افغان سردار اور شاہجہان آباد کے امراء تھے جو ہندوستان کے لئے کسی مناسب شہنشاہ کے انتخاب میں مشاورت کے لئے آئے تھے۔ ان کے سر جھکے ہوئے تھے اور نگاہیں نیچی تھیں۔ شاہ ولی خاں کی ہدایت پر ندیم خاص نے امراء شاہجہان آباد کو خوش آمدید کہا اور مستقبل کے نظم مملکت کے بارے میں اپنی اپنی رائے کے اظہار کی دعوت دی۔ ”بادشاہ معظم اس بارے میں سب سے پہلے خان خاناں انتظام الدولہ کی رائے جانتا پسند کریں گے۔“

انتظام الدولہ نے کھڑے ہو کر آداب کے مراحل مکمل کئے۔ احمد شاہ ابدالی کے لطف و کرم کے لئے ان کا شکریہ ادا کیا۔ مسلمانان ہند کے وجود کے تحفظ کے لئے ان کی مساعی کا ذکر کیا اور عالمگیر ثانی کی عماد الملک اور امراء کے ہاتھوں سے ہٹی کا ذکر کر کے ان کی جگہ مرحوم احمد شاہ کے بیٹے کو تخت ہند پر بٹھانے کی تجویز پیش کی۔ عبدالاحد خاں نے خان خاناں کی تجویز کی مدد و حمایت کی۔ دیگر امراء نے اسے نو عمر اور ناچختہ قرار دیا اور کہا کہ وہ اتنی اہم ذمہ داریاں پوری کرنے کے قابل نہیں وہ بھی عالمگیر ثانی کی مانند امراء کے ہاتھوں میں کھلونا بن جائے گا جبکہ ہندوستان کو کسی مضبوط شہنشاہ کی ضرورت ہے۔ کچھ امراء نے محمد شاہ کے لڑکے شہزادہ ایچھے میاں کو شہنشاہی مندر پر بٹھانے کی تجویز پیش کی۔ وہ کسی ایک نام پر متفق نہ تھے احمد شاہ ابدالی خاموش بیٹھے ان کے دلائل سنتے رہے۔ جب سب اپنی اپنی رائے دے چکے تو بادشاہ نے نجیب الدولہ کی طرف دیکھا جنہوں نے کسی کی حمایت کی تھی نہ مخالفت۔

”بادشاہ معظم کے حکم کی تعمیل ہم پر لازم ہے۔“ نجیب الدولہ نے بادشاہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ ”اس تعمیل میں اپنی ناچیز رائے دینے پر مجبور ہوں شاہجہان آباد کے علماء اور دانش مندوں نے جس خطرہ کو دیکھتے ہوئے بادشاہ کا بل و قہار سے ادا کی درخواست

میں عمال قلعہ شامل ہیں۔“ بیگم کو یاد آیا کہ اسے عالمگیر ثانی کے عمال کا رویہ جانتا چاہئے۔

”سب اہتمام قلعہ دار کی نگرانی میں ہو رہا ہے۔“ بیگم کو یقین ہو گیا کہ ہند میں آل تیمور کا دور ختم ہونے کو ہے اور شاہ کا بل و قہار بذات خود شہنشاہ ہندو کا بل و قہار بننے والے ہیں۔ خاندان تیموریہ کے زیر سایہ اپنے خاندان کے نصف صدی تک ہندوستان پر حکومت کرنے کے باوجود بیگم کو اس یقین سے خوشی ہوئی۔

”ہم بادشاہ معظم کے جلوس میں شامل ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ شاہ ولی خاں تک ہماری یہ خواہش پہنچا دی جائے، ہمارے خدام بھی ساتھ ہوں گے۔ بادشاہ معظم کے تخت ہند پر جلوہ افروز ہونے پر نذرانہ پیش کرنا ہم پر لازم ہے۔ ہم چاہتے ہیں شاہجہان آباد جاؤ اور عمدہ بیگم اور ہماری طرف سے نذرانہ کے لئے اشرفیوں کی دو تھیلیاں اور سنگ یشب کی دو رکابیاں ہمیں فراہم کرو۔“ سرفراز خاں نے سر جھکایا اور خیمے سے باہر نکل گیا۔

بیگم بنی کا خط پڑھنے لگی، اس نے گنا بیگم کو طلاق دلوانے پر احمد شاہ ابدالی کا شکریہ ادا کیا تھا اور عماد الملک کو منصب وزارت سے ملحدہ کرنے اور حراست میں رکھنے پر گہرا دکھ ظاہر کیا تھا اور اپنی ماں سے اس کی رہائی کے لئے بادشاہ معظم کے حضور عرضداشت پیش کرنے کی درخواست کی تھی۔

مراسلہ تہہ کر کے طشتری میں رکھ کر بیگم بنی کی سادگی پر مسکرا دی۔

احمد شاہ ابدالی کے دائیں طرف شاہ ولی خان اور بائیں طرف ان کی طرف سے مقرر کردہ وزیراعظم ہندوستان خان خاناں انتظام الدولہ بیٹھے تھے۔ سامنے

عالمگیر ثانی سے مابدولت کو کوئی شکوہ نہیں ہے۔ شہنشاہ ہند قلعہ معلیٰ میں موجود ہیں اور اب بھی تخت ہند پر وہی فائز ہیں۔ مابدولت ان پر کوئی الزام نہیں دے سکتے اور الزام اور قصور کے بغیر کسی شہنشاہ کو اس کی سلطنت سے علیحدہ کرنے کا ہمیں کوئی اختیار نہیں۔“

بادشاہ نے بات ختم کی تو امراء اور درباری بادشاہ معظم کے فیصلہ کو سراہنے لگے اور عالمگیر ثانی اور وزیر اعظم خاں خاناں کو ملک و قوم کے مفاد میں ہر قسم کے تعاون کا یقین دلانے والوں میں شامل ہو گئے۔

”بادشاہ معظم نے شہنشاہ عالمگیر ثانی کو تخت ہند پر فائز رکھنے کا اعلان کر دیا ہے۔“ سر فراز خان نے بیگم کوتاڑہ ترین رپورٹ پیش کی۔

بیگم ایسی خبر سننے کے لئے تیار تھیں شاہجہان آباد کے علماء کی طرف سے افغان بادشاہ کے نام کا خطبہ پڑھنے کی اطلاع درست تھی؟“ اس نے اس انداز میں اپنے سفارتی جاسوس سے پوچھا جیسے خطبہ یا عالمگیر کو بحال رکھنے کی اطلاع میں سے ایک خبر اس نے غلط دی ہو۔

”خادم حضور کو غلط خبر پہنچانے کا سوچ بھی نہیں سکتا، وہ اطلاع بھی درست تھی۔“ سر فراز خان نے سر جھکا دیا۔

”ہم یہ یقین کریں کہ بادشاہ معظم نے جس شہنشاہ کے نام کا خطبہ پڑھنے سے منع کیا تھا اسی کو شہنشاہ برقرار رکھا جائے گا؟“

”امراء کی طرف سے مخالفت کے باوجود بادشاہ معظم نے یہی فیصلہ کیا ہے۔“

”امراء نے فیصلہ مان لیا؟“

”کسی نے اختلاف کی جرأت نہیں کی۔“

”اور علمائے کرام؟“

”علمائے کرام بادشاہ معظم سے شہنشاہ ہند بننے کی درخواست کر چکے ہیں۔ افغان امراء کہتے ہیں کہ علماء نے

کی تھی وہ بدستور موجود ہے۔ ہندوستان کی مغلیہ سلطنت کے زوال اور کفر کی طاقتوں کے عروج کا بنیادی سبب امراء اور وزرائے دربار کے باہمی اختلافات اور ملی مفاد کی بجائے ذاتی مفادات کی مصلحت آمیز لڑائی ہے۔ بادشاہ معظم کا لطف و کرم ہے کہ انہوں نے ہم ہندوستان کے باسیوں کو شہنشاہ ہند کا فیصلہ کرنے کو کہا مگر ہم کسی متفقہ فیصلے پر نہیں پہنچ سکے۔ یہ ہماری روایت کے عین مطابق ہے ان حالات میں مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہم بادشاہ معظم سے درخواست کریں کہ وہ سب کی باتیں سن چکے ہیں، سب حالات سے واقف ہیں، وہ اپنی پسند کا فیصلہ کر دیں۔ بادشاہ معظم جس کسی کو بھی ہندوستان کے تخت پر بٹھائیں گے ہم اس سے تعاون کریں گے تاکہ کفار کو نظر آئے کہ ہم سب متحد ہیں، یہ اتحاد کفر کے خلاف لڑائی میں کامیابی کا سبب ہو گا۔“

نجیب الدولہ بات ختم کر کے بیٹھ گئے تو جو امراء کسی ایک کی مخالفت اور دوسرے کی حمایت میں دلائل دیتے رہے تھے نجیب الدولہ کی تجویز کی حمایت میں دلائل دینے لگے۔ افغان امراء، سردار اور امراء سب خاموشی سے سنتے رہے تھے۔ وہ بادشاہ معظم کے فیصلہ کو قبول کرنے کے دلائل پر حیران تھے اور خوش بھی کہ شہنشاہ ہند کے تقرر کا اعزاز بھی ان کے حصہ میں آ رہا ہے۔

”مابدولت نے ہندوستان کے دربار اور امراء کو اپنا شہنشاہ خود مقرر کرنے کو کہا مگر وہ کسی پر شفق نہ ہو سکے۔ ہم ہندوستان کے تخت پر قبضہ کرنے ہندوستان نہیں آئے علماء کرام اور آپ میں سے بعض کی دعوت پر آئے ہیں اور جلد واپس جانا چاہتے ہیں۔“ بادشاہ نے کہا۔ ”ان حالات میں مابدولت عالمگیر ثانی کو اس تخت پر بیٹھا دیکھ کر خوش ہوں گے۔ ہمیں ان سے ذاتی شکایت نہیں، ہم سے معاہدہ کی خلاف ورزی وزیر اعظم عماد الملک نے ہی کی تھی، اسے اس جرم کی سزا دی جائے گی۔ شہنشاہ ہند

میں پوچھا۔
”بادشاہ معظم صاف دل اور صاف گوہر ان ہیں
انہیں اس کی ضرورت بھی نہ ہے۔“ سرفراز خاں نے
آہستہ آواز میں جواب دیا۔

”گزرے واقعات و حالات نے یہی ثابت کیا
ہے تم نے سچ کہا بادشاہ معظم کا عمل ان کی بات پر مہر ثبت
کرتا رہا ہے۔“

”اس فیصلہ سے حضور عماد الملک کے بارے میں
مشکلات بڑھ گئی ہیں۔“ سرفراز نے تردید کے بعد کہا۔
”تمہارا اندازہ دست ہے مگر ہم مشکلات بڑھ
جانے سے عزم کا دامن چھوڑنے کے خلاف ہیں۔“

”خادم کا مطلب یہ ہے کہ یہ نہ تھا، بدلے حالات میں
حضور سے رہنمائی حاصل کرنا مقصد ہے۔“

”شہنشاہ ہند کے بادشاہ معظم کے حضور پیش ہونے
سے پہلے ہمیں کچھ کرنا ہوگا ورنہ یہ کام سرخود دشوار ہو سکتا
ہے۔“

”خادم حضور کا حکم سننے کے لئے بے تاب ہے۔“
”آج کی شب دو اہم کام لازم ہیں عماد الملک تک
ہمارا مراسلہ پہنچانا اور شاہ ولی خاں کو ہماری طرف سے
سلام پیش کرنا۔“ عشاء کی نماز تک مراسلہ تیار ہوگا۔ جتنا
جلد ممکن ہو عماد الملک کو پہنچا دیں اور شاہ ولی خاں کے
جواب سے ہمیں جلد آگاہ کریں۔“

”خادم حضور کے حکم اور مراسلہ کا خطر ہے۔“
سرفراز خاں نے اجازت چاہتے ہوئے کہا۔ ”جب تک
حضور مراسلہ تیار کریں گے خادم اسے پہنچانے کا اہتمام
کرنا چاہتا ہے اور افغان وزیر کے کیمپ سے ان کی
مصرفیات کے بارے میں جاننا چاہتا ہے۔“

”ہم تمہاری کامیابی کے لئے دعا گو ہیں۔“ بیگم
نے اجازت دیتے ہوئے کہا۔
سرفراز خان کے جانے کے بعد وہ فوراً ہی مراسلہ

بادشاہ معظم کی اجازت کے بغیر ان کے نام کا خطبہ پڑھا
تھا اس کے لئے بعض امراء شاہجہان آباد نے انہیں
شورہ دیا تھا۔“

”مرہٹوں سے متعلق بادشاہ معظم نے کیا فیصلہ کیا
ہے؟“

”علماء اور امراء نے مرہٹوں کی سرکشی کا ذمہ دار
حضور نواب عماد الملک کو قرار دیا ہے اور بادشاہ معظم نے
اس سے اتفاق کیا ہے اور فرمایا ہے کہ معاہدہ کی خلاف
ورزی بھی وزیراعظم نے کی تھی۔ شہنشاہ بے تصور ہیں اس
لئے ہم ان کو تخت سے نہیں اتار سکتے۔“

بیگم کے لئے اپنے داماد کے بارے میں علماء امراء
اور بادشاہ کی رائے پریشان کن تھی اس نے موضوع بدل
دیا۔ ”شاہجہان آباد میں بادشاہ معظم کے فیصلہ کو کیسے سنا
گیا؟“

”نجیب الدولہ اس فیصلہ سے خوش نہیں وہ
وزیراعظم اور شہنشاہ دونوں کو سزا دینے کے حق میں تھے۔“
”قلعہ معطلی کے عامل تو خوش ہوئے ہوں گے؟“

”حضور کا اندازہ درست ہے اور میر بخشی شہنشاہ کو
بادشاہ معظم کی لشکرگاہ میں لانے کی تیاریاں کر رہے
ہیں۔“

”بادشاہ معظم کے دربار میں شہنشاہ ہند کی حاضری
کا فیصلہ کس نے کیا؟“

”بادشاہ معظم نے شہنشاہ ہند کے لئے سردار جہان
خاں کو ایک مراسلہ دے کر قلعہ معطلی بھیجا تھا جس میں لکھا
تھا۔ ”مابدولت سلطنت ہند آپ کو عطا کرتے ہیں برائے
ملاقات شاہانہ جلوس کے ساتھ ہماری لشکرگاہ میں شریف
لائیں کہ مابدولت اپنے ہاتھ سے شہنشاہ ہندوستان کو
خلعت پیش کریں تاکہ برادرانہ تعلق محکم ہو۔“

”بادشاہ معظم کا کوئی اور ارادہ تو نہیں؟“ بیگم نے
کافی سوچ بچار کے بعد ارگرد و کچھ کر سرگوشی کے انداز

”تیز رفتار گھوڑوں پر سوار افغانوں کو خان خانان انتظام الدولہ کی ڈیوڑھی پر خوش آمدید کہہ کر بندہ مسرت محسوس کرتا ہے۔“ کماندار نے سواروں کو خوش آمدید کہا۔

”وزیراعظم ہند نواب انتظام الدولہ کی ڈیوڑھی کے خوش اطوار کماندار سے مل کر ہم بے حد مسرور ہوئے ہیں اور ان کی رہنمائی میں نواب شولا پوری بیگم تک ایک اہم پیغام پہنچانا چاہتے ہیں۔“ اسی سوار نے جواب دیا۔

سوار کے جواب سے کماندار نے اندازہ کیا کہ افغان لباس میں اس کے سامنے ترک سوار کھڑے ہیں۔

”آپ کے گھوڑوں کا پسینہ اور آپ کا لباس بتا رہا ہے کہ آپ کسی نازک مشن پر ہیں کیا میں جان سکتا ہوں کہ مشن کیا ہے۔“ کماندار نے پوچھا۔

”ہمیں اس بارے میں کچھ بتانے سے منع کر دیا گیا ہے اور حکم کی پابندی ہمارا پیشہ ہے۔“

”آپ کو اور آپ کے گھوڑوں کو آرام کی ضرورت ہے۔“ کماندار نے ڈیوڑھی کا دروازہ کھولنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ہمارا پیشہ بھی حکم کی پابندی کرتا ہے اندر بیٹھ کر سوچتے ہیں کہ ہم اپنے اپنے فرض کو کیسے پورا کر سکتے ہیں۔“

تینوں سوار گھوڑوں سے اتر آئے خدام نے ان کے گھوڑوں کی لگا میں تمام میں سوار کماندار کے ہمراہ جا چکے تو دروازہ پھر سے بند کر دیا گیا۔

”پیغام تحریر میں ہے یا زبان میں؟“ کماندار نے سواروں سے بیٹھنے کے لئے کہہ کر وضاحت چاہی۔

”تحریر میں پیغام زبان سے وضاحت چاہتا ہے۔“ ایک سوار نے جواب دیا۔

”بیگم عالیہ کو یہ اطلاع دی جائے کہ نواب انتظام الدولہ کے اچھی پہنچے ہیں؟“ کماندار نے پوچھا۔

”ہمیں بیگم عالیہ کی دختر مغلائی بیگم نے ان کو خدمت میں بھیجا ہے۔“ سوار نے بتایا۔

لکھنے بیٹھ گئی وہ اہم معاملات میں کبھی تاخیر نہیں کرتی تھی۔

شاہ ولی خاں کا بھتیجا یعقوب خاں عماد الملک اور شاہ ولی کے درمیان سفارتی اور مصالحتی نامہ و پیام کا فریضہ انجام دیا کرتا تھا۔ شاہجہان آباد کے امراء اور عماد الملک سے اس کے گہرے مراسم تھے۔ وہ بھی عماد الملک اور اپنے چچا کے درمیان تعلقات استوار کرنے میں سرگرم تھا اور اسے عماد الملک کی سفارش کرنے پر رضامند کرنا چاہتا تھا۔ احمد شاہ ابدالی نے ہمیشہ بیگم کی سرپرستی کی تھی۔ شاہ ولی خان اسی وجہ سے بیگم کا احترام کرتا تھا۔ بیگم کی سفارت کاری کی مہارت اور اثر و رسوخ کی وجہ سے اسے خوش رکھنے میں عافیت جانتا تھا۔

خان خانان انتظام الدولہ کی وسیع و عریض حویلی میں شمعیں روشن کر دی گئی تھیں۔ ماگھ کی سردی دہانوں کی کھڑکیوں سے جھانک کر حویلی کے باسیوں کی سرگرمیوں کا جائزہ لینے کی کوشش کر رہی تھی۔ ڈیوڑھی کا بیرونی دروازہ بند کر دیا گیا تھا۔ پہریدارات کا مقابلہ کرنے کی تیاریاں مکمل کر چکے تھے کہ تین گھوڑ سوار نمودار ہوئے۔ ڈیوڑھی کے پہرہ دار ہوشیار ہو گئے سوار دروازے کے سامنے پہنچ کر رک گئے۔ ان کے گھوڑوں کے پسینہ اور نتھنوں سے خارج ہونے والی گرم ہوا سے انہوں نے اندازہ کیا کہ سوار گھوڑوں کو بہت تیز دوڑاتے ہوئے یہاں پہنچے ہیں۔

”اپنے کماندار کو اطلاع دیں کہ ہم افغان لشکر گاہ سے آئے ہیں اور فوراً ان سے ملنا چاہتے ہیں۔“ ایک سوار نے اپنے گھوڑے کو چمکی دیتے ہوئے کہا۔

وزیراعظم انتظام الدولہ افغان لشکر گاہ میں تھے۔ پہریداروں کا سربراہ پیغام کی اہمیت کا اندازہ کرتے ہوئے بھاری دروازے میں بنی کھڑکی کھول کر اندر گیا اور فوراً ہی کماندار کے ساتھ واپس آ گیا۔

دی اور مراسلہ دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر پڑھنا شروع کر دیا۔ مراسلہ ختم کیا تو تہہ کر کے طشتری میں نہیں رکھا۔ خوبہ سرا نے اعزازہ کیا کہ بیگم صاحبہ کو اس کی موجودگی کی ضرورت نہیں وہ آداب عرض کر کے مڑا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ بیگم نے کنیزوں کی طرف دیکھا تو وہ بھی باہر نکل گئیں۔

”ہم یقین کر لیں کہ بادشاہ معظم عماد الملک کے قتل پر راضی ہو گئے ہیں۔“ شولا پوری بیگم کی آواز کانپ رہی تھی۔

”شہنشاہ ہندوستان عالمگیر ثانی نے بادشاہ کا بل و قندھار سے کیا درخواست کی ہے۔“ سرفراز خان نے عرض کیا۔

”بادشاہ احمد شاہ ابدالی کی روایت یہ نہیں کہ ایسی درخواست پر عمل کرنے کا حکم دیں۔“ بیگم نے مرجھائی ہوئی آواز میں کہا۔

”مغل شہنشاہ نے ہندوستان میں مساد کی ساری ذمہ داری نواب عماد الملک پر ڈال کر ایسی درخواست کی ہے شہنشاہ کا خیال ہے کہ عماد الملک کی موجودگی میں حالات درست نہیں ہو سکیں گے اور وہ نواب انتظام الدولہ کے لئے مشکلات پیش کرتے رہیں گے۔“ سرفراز خان نے وضاحت کی۔

”ہمارے بچے نے اپنے بھانجے کے قتل میں شامل ہونا پسند کر لیا۔ ہم یقین نہیں کر سکتے۔“ بیگم کی آواز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بہت گھبرائی ہوئی ہے۔

”مغل شہنشاہ نے یہ درخواست کرتے ہوئے نواب انتظام الدولہ سے یقیناً مشورہ نہیں کیا ہو گا۔“ سرفراز خان نے خیال ظاہر کیا۔

”پھر بھی وزیراعظم کو شہنشاہ کی درخواست میں شریک سمجھا جائے گا ہمارا ایک بیٹا دوسرے کے خون کا ذمہ دار ٹھہرے گا۔“ بیگم نے اس انداز میں کہا جیسے وہ

مغلانی بیگم کا نام سن کر کماندار کچھ سوچنے لگا اس نے کبھی جانا اور سنا نہ تھا کہ مغلانی بیگم کو کبھی اپنی ساس سے ملاقات یا نامہ و پیام کی ضرورت پیش آئی تھی ابھی تک وہ کبھی سمجھ رہا تھا کہ انتظام الدولہ نے اپنی والدہ کے لئے پیغام بھیجا ہے۔

”ہم بیگم عالیہ کے حضور اطلاع بھجوا دیتے ہیں ان کے حکم کی پابندی کی جائے گی۔“ کماندار کہہ کر اٹھا اور قطاروں میں روشن شمعوں کے درمیان سے زناش کی طرف چل دیا۔

نواب شولا پوری بیگم تخت پوش پر غنچیں بکریہ سے ایک لگائے ٹٹھی تھیں اور نہایت آہستہ رفتار سے صبح کے دانے گن رہی تھیں کچھ فاصلہ پر دو کنیزیں سر جھکائے مؤدب کھڑی تھیں خوبہ سرا کے پیچھے چلتا ہوا سرفراز خان کمرے میں داخل ہوا آداب کے لئے جھکا اور نظریں جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

”ہم سمجھتے ہیں ہماری دختر افغان لشکر میں خیریت سے ہیں۔“ نواب شولا پوری بیگم نے پُر وقار انداز میں اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”حضور کی دختر ذاتی طور پر بالکل خیریت سے ہیں۔“ سرفراز خان نے جواب دیا۔

”ذاتی طور پر۔“ سے شولا پوری بیگم چونکیں پر ان کی انگلیوں کی رفتار تھوڑی سی بڑھ گئی۔ سرفراز خان نے مراسلہ پیش کرنے کی اجازت چاہی تو خوبہ سرانے مراسلہ کھول کر بیگم صاحبہ کو پیش کیا اور دور ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

بیگم نے تہہ شدہ مراسلہ کھولا اور شع دان کے قریب کر کے پڑھنا شروع کیا۔ سرفراز ان کے چہرے کے تاثرات پڑھنے کی کوشش میں فرش کی طرف جھکی آنکھیں اٹھا کر کبھی کبھی ان کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا۔ بیگم نے آدھا مراسلہ پڑھا ہو گا کہ صبح پاس رکھی طشتری میں رکھ

کس سے مخاطب ہیں وہ سوچنے لگی۔

خادمہ کو اپنے سامنے سر جھکائے کھڑا دیکھ کر عمر رسیدہ نواب شولا پوری بیگم نے اپنے حواس پر قابو پانے کی کوشش کی۔ ”عریفہ نویس کو فوراً حاضر کریں ہمیں اپنی مہر خاص کی بھی ضرورت ہوگی۔“

جب سورج قلعہ معلیٰ کی مشرقی فصیل پر سنہری کندیں پھینک رہا تھا تو شہنشاہ ہندوستان عالمگیر ثانی کا جلوس قلعہ سے برآمد ہو رہا تھا۔ تیز رفتار گھوڑوں پر سوار منادی کرنے والے شہنشاہ کے جلوس کے آگے منادی کرتے جا رہے تھے۔ سقوں کی فوج راستہ میں چمڑکاؤ کر رہی تھی تاکہ گرد کا کوئی ذرہ شہنشاہ ہندوستان کے جسم یا لباس تک پہنچ کر اس کا تقدس مجروح نہ کر سکے۔ راستہ کے دونوں طرف افغان سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔ شہنشاہ کی سواری کے دائیں بائیں جہان خاں کے خصوصی دست کے سوار تھے۔ شہنشاہ کے جلوس میں شاہجہان آباد کے امراء میں سے چند ایک ہی شامل تھے۔ نجی خان، سید نثار خان اور مصمصام الدولہ میر بخشی کے علاوہ کوئی بھی اہم شخصیت جلوس میں دکھائی نہیں دیتی تھی۔ شہنشاہ ہندوستان کے جلوس کی حفاظت احمد شاہ ابدالی کے جرنیل جہان خان خود کر رہے تھے اور ہندوستان کے مغل شہنشاہ افغان بادشاہ کی کوئی کی حفاظت میں ان سے سند شہنشاہیت حاصل کر کے ان کی لشکرگاہ جا رہے تھے پھر بھی شہنشاہ کے جلوس کی منادی سن کر لوگ راستہ چھوڑ کر ایک طرف کھڑے ہو جاتے اور شہنشاہ کی سواری پر نظر پڑتے ہی ادب سے سر جھکا لیتے تھے۔

افغان وزیراعظم شاہ ولی خاں نے شاہی لشکرگاہ سے باہر نکل کر شہنشاہ ہندوستان کا استقبال کیا۔ افغان امراء اور سرداروں کے علاوہ استقبال کرنے والوں میں افغان بادشاہ کی طرف سے ہندوستان کے لئے مقرر کردہ

کمرے میں سرفراز خاں کی موجودگی بھول گئی ہو۔ ”ہم یہ کیسے برداشت کر سکیں گے؟“

سرفراز خاں خاموش کھڑا رہا۔
”ہم یہ کبھی برداشت نہیں کر سکیں گے ہم یہ ہرگز برداشت نہیں کر سکیں گے۔“ بیگم کے ہاتھ کاپٹنے لگے۔
”حضور کی دختر بے چکن ہیں اور خاندان کے خون اور فساد کے غم سے غم حال ہیں۔“

”ہم مظانی بیگم کے دکھ کا اندازہ کر سکتے ہیں، ہم اس فساد کو روکنے کی کوشش کریں گے۔ ہم ہرگز فساد نہیں پھیلنے دیں گے۔ ان شاء اللہ تھوڑی دیر میں تمہیں ہمارا مراسلہ مل جائے گا، ہدایت پر عمل کرو اور حکم کی پابندی کرو۔“
سرفراز خاں آداب عرض کر کے کمرے سے باہر نکل گیا۔

شولا پوری بیگم کو دیوان کی چھت اور دیواروں پر بنے سنہری نقش و نگار روشنی پردے، عقیلیں، قالین اور روٹنی شمع دان سب بے معنی نظر آنے لگے۔ اس کا ایک بیٹا نکل کر بیٹھا جانے کا اور دوسرا اس کا قاتل قرار پائے گا۔ خون پر خون کا الزام آئے گا جس سلطنت میں اس کے ایک اشارے پر بڑے بڑے مجرموں کی سزائیں معاف ہو جایا کرتی تھیں اسی میں اس کا اپنا بیٹا اتنی بڑی سزا پائے گا۔ ہندوستان کے ایک وزیراعظم کی بیوہ ایک وزیراعظم کی بیوہ ایک وزیراعظم کی والدہ اور ایک وزیراعظم کی نانی بیگم شولا پوری نے بے بسی کی حالت میں ”ہم یہ نہیں ہونے دیں گے“ اتنی بلند آواز میں کہا کہ پردے کے پیچھے کھڑی خادمہ پریشان ہو کر اندر آ گئی۔

شولا پوری بیگم نے جب کبھی ”ہم یہ نہیں ہونے دیں گے“ کہا تھا اس عزم پر عمل ہوا تھا۔ آج اسے بلند آواز میں ”ہم یہ نہیں ہونے دیں گے“ کہتے سن کر خادمہ پریشان ہو گئی کمرے میں اور کوئی نہ تھا۔ بیگم صلابہ

کرتے ہیں کہ شہنشاہ معظم مبارکباد قبول فرما کر ہمیں سرفراز فرما دیں گے۔“

عالمگیر نے تاج شہنشاہی والا سر جھکا کر کہا۔ ”مابدولت کے دل میں بادشاہ معظم کے کرم کی قدر ہے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔“

حاضرین نے بادشاہ کا بل و قدح اور شہنشاہ ہندوستان کے الفاظ اور انداز کے فرق کو محسوس کرتے ہوئے احمد شاہ ابدالی کی طرف دیکھا۔

”مابدولت حضور عالی کے مہمان ہیں اور چند روز بعد واپس اپنے ملک چلے جائیں گے۔ حضور عالی کا ملک حضور کو مبارک ہو۔“ احمد شاہ ابدالی نے عالمگیر کو ان کی سلطنت کی اور اپنی فوج کی واپسی کا مزید یقین دلانے کے لئے کہا۔

”مابدولت اپنے مقتدر مہمان کی میزبانی پر خوش ہیں اور امید کرتے ہیں کہ وہ ہمیں طلحہ معطر میں میزبانی سے سرفراز فرما دیں گے تاکہ ہم اپنی تیموری روایت میزبانی و خلوص کا نذرانہ پیش کر سکیں۔“ عالمگیر ثانی الفاظ کی نشست و برخاست پر توجہ دینے کی پوری کوشش کر رہے تھے۔

”شہنشاہ معظم کی دعوت افغانوں کے لئے سرفرازی ہے مابدولت خوشی قبول کرتے ہیں۔“

”مابدولت بادشاہ معظم کے مشکور ہیں کہ انہوں نے ہماری درخواست قبول فرمائی۔“

عالمگیر کے جواب اور شکریہ کے بعد شاہجہان آباد کے علماء اور امراء کے خطوط اور عداوت کا ذکر کر کے احمد شاہ ابدالی نے پنجاب پر قبضہ کا حوالہ دیا اور کہا کہ انہیں مجبوراً شاہجہان آباد آنا پڑا ہے اور وہ جلد اپنے وطن واپس جانا چاہتے ہیں۔ احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں اور جانوں کی بڑھتی ہوئی شورش اور قوت پر تشویش ظاہر کی۔

عالمگیر ثانی خاموش بیٹھے سنتے رہے۔

وزیر اعظم خان خانان انتظام الدولہ اور افغان کیمپ میں موجود دربار مغلیہ کے امراء بھی شامل تھے لشکر گاہ کے راستے میں افغان فوج کے سوار اور پیدل فوجی کھڑے تھے آسمانوں کے مسافر نے شہنشاہ ہندوستان کا یہ ادب و احترام دیکھا تو آنکھیں سفید بالوں سے ڈھانپ لیں۔

احمد شاہ ابدالی نے اپنی خیمہ گاہ کے دیوان خاص کے دروازے پر شہنشاہ عالمگیر ثانی کو خوش آمدید کہا اور اپنی نشست خاص تک ان کے ساتھ چلنے رہے اور عالمگیر ثانی کے تشریف فرما ہو چکنے کے بعد اپنی نشست پر بیٹھے۔ امراء اور سردار سامنے نصف دائرہ کی صورت میں فرشی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ عالمگیر ثانی بھی افغان بادشاہ اور دربار کی سادگی پر حیران تھے۔ احمد شاہ ابدالی کے دیوان خاص میں مغلیہ دربار کی شان و شوکت تھی نہ ان کے دربار جیسے اٹھنے بیٹھنے کے آداب و روایات کی پابندی کی جاتی تھی۔ افغان بادشاہ کے لباس اور اطوار سے بھی کسی قسم کی برتری اور شاہیت کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔

احمد شاہ ابدالی شہنشاہ ہندوستان سے خیریت مزاج اور سکون سر کے بارے میں پوچھ چکے تو ندیم خاص نے کھڑے ہو کر چند سادہ الفاظ میں بادشاہ کی طرف سے شہنشاہ ہندوستان کی آمد پر خوشی کا اظہار کیا اور بادشاہ معظم کی طرف سے انہیں تخت ہند پر برقرار رکھنے کا اعلامیہ پڑھ کر سنایا جس میں امید ظاہر کی گئی تھی کہ شہنشاہ ہندوستان مسلمانان ہند کے وجود کے تحفظ میں کامیاب ہوں گے اور خان خانان انتظام الدولہ ان کی رہنمائی میں کفار کی قوت اور خطرہ کا مقابلہ کر کے ہندوستان میں نظم و سلطنت مستحکم کر سکیں گے۔

ندیم خاص اعلامیہ ختم کر کے بیٹھ گیا تو احمد شاہ ابدالی نے شہنشاہ ہندوستان کو مبارکباد پیش کی۔ ”مابدولت اپنے بھائی کو تخت و تاج ہندوستان کے لئے مبارکباد پیش کرتے ہوئے دلی مسرت محسوس کرتے ہیں اور امید

نا قابل فہم تھا۔ امراء شاہجہان آباد اور افغان سرداروں کو بادشاہ معظم کے جواب سے یہی اندازہ ہو سکا تھا کہ عالمگیر ثانی نے عماد الملک کے جرائم اور سازشوں کی وجہ سے اس کی جان مار دینے کی درخواست کر رکھی تھی۔ دربار خاص میں موجود سب امراء اور سردار محسوس کرنے لگے کہ عالمگیر ثانی بادشاہ معظم کے اس اعلان پر خوش نہیں مگر فاتح بادشاہ کا ہر لفظ مجبور شہنشاہ کے لئے حکم کا درجہ رکھتا تھا۔ شہنشاہ ہندوستان نے بادشاہ افغان کا یہ فیصلہ بھی خاموشی سے قبول کر لیا۔

شہنشاہ نے دوپہر کا کھانا افغان بادشاہ کے ساتھ تناول فرمایا دوپہر افغان لشکر گاہ میں آرام کیا۔ دن ڈھلے وہ قلعہ معلیٰ واپس روانہ ہوئے گئے تو احمد شاہ ابدالی نے ان کے ساتھی امراء کو قیمتی تحائف پیش کئے۔ استواری تعلقات برقرار نہ کی خاطر احمد شاہ ابدالی نے اپنی پگڑی سر سے اتار کر عالمگیر ثانی کو پہنا دی جس کے جواب میں عالمگیر ثانی نے اپنی پگڑی احمد شاہ ابدالی کے سر پر رکھ دی۔

احمد شاہ ابدالی کی طرف سے عالمگیر ثانی کو پیش بہا سنہری ٹوپی جس پر عقاب کے پروں کی کلفی لگی تھی۔ سونے چاندی اور جواہرات سے مزین چڑ اور پیش قیمت خلعت پیش کئے گئے اور انہیں سونے کے ٹکڑوں سے بھرا ہوا قہال نذرانہ پیش کر کے ان کی شہنشاہیت کو مستحکم کر دیا۔ ہندوستان کے لئے مقرر کردہ وزیراعظم خان خاناں انتظام الدولہ کو بھی احمد شاہ ابدالی کی طرف سے خلعت پیش کیا گیا۔

احمد شاہ ابدالی شہنشاہ ہند کی سواری تک ان کے ساتھ چل کر گئے اور بڑے عزت و احترام کے ساتھ انہیں شاہجہان آباد روانہ کیا جرنیل جہان خاں کی سرکردگی میں افغان محافظہ دستے شہنشاہ کے ہمراہ شاہجہان آباد تک گئے۔

امراء شاہجہان آباد نے بادشاہ معظم کی تشویش کے حوالہ سے مرہٹوں سکھوں اور جاٹوں کی باغیانہ قوت جمع ہونے کے اسباب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عماد الملک کو اس کا مجرم ٹھہرایا پنجاب پر قبضہ اور مظانی بیگم کے اغوا کی ذمہ داری بھی اسی پر ڈال دی تھی۔

”عماد الملک کے ظلم اور زیادتی سے قلعہ معلیٰ کے پاس بھی محفوظ نہ رہ سکے بادشاہ کاٹل وقت حار کی منہ بولی بیٹی بھی ان کے ہاتھوں رسوا ہوئیں ان کے بارے میں مابدولت کی تجویز ذاتی نہیں ملتی مفاد کے لئے ہے۔“ عالمگیر ثانی نے عماد الملک کو قتل کرنے کی اپنی درخواست کی طرف اشارہ کیا۔

”مابدولت عماد الملک کی جان کی سلامتی کی ضمانت دے چکے ہیں اور اپنے وعدہ سے انحراف ہمارے لئے ممکن نہ ہوگا۔“ احمد شاہ ابدالی نے جواب دیا۔ شہنشاہ عالمگیر ثانی کو یقین تھا کہ عماد الملک کے جرائم اور زیادتیوں کو دیکھتے ہوئے احمد شاہ ابدالی ہرگز اسے معاف نہیں کریں گے اور ان کی درخواست پر لازماً عمل کریں گے۔ بادشاہ کا جواب ان کی توقع کے خلاف تھا۔

”مابدولت بادشاہ معظم کے وعدہ اور فیصلہ کی قدر کرتے ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ ہندوستان کے مسلمانوں اور سلطنت کو عماد الملک کی سازشوں سے محفوظ رکھنے کے لئے بادشاہ معظم اسے اپنے ساتھ افغانستان لے جانا پسند فرمائیں گے۔“ عالمگیر ثانی نے تجویز پیش کی۔

”مابدولت یقین رکھتے ہیں کہ عماد الملک شہنشاہ ہندوستان کے ہر حکم اور خواہش کا دل سے احترام کرے گا اور نافرمانی کر کے بدعتی کو دعوت نہیں دے گا۔“ ابدالی نے جواب دیا۔ عماد الملک کے سب گناہ معاف کر دینا عالمگیر ثانی کے علاوہ امراء شاہجہان آباد کے لئے بھی

مہمان کی طرف دیکھ کر کہا۔

”حضور کی خوشی شاہ ولی خاں کا سکون اور حضور کا دکھ ان کا ذاتی غم ہے، ہم نے جو کچھ کیا اپنے لئے کیا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”عماد الملک حضور کے فرزند اور اس خادم کے برادر مکرم ہیں۔ بادشاہ معظم نے ان کی آزادی اور حضور کے ہاں حاضری کا حکم دیا ہے۔“

”بادشاہ معظم کے احسانات کا شمار ہمارے بس میں نہیں، انہوں نے ہمیشہ ہماری امید اور توقع سے بڑھ کر ہم پر احسان کیا ہے ایسا کرم اور احسان کوئی افغان ہی کر سکتا ہے۔ مغل یا ترک نہیں کر سکتا۔“ بیگم اس غیر متوقع خوشی پر سنبھلنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”نئی زندگی اور اس کے نئے دور میں قدم رکھنے سے پہلے ہم مادر مکرم سے پرانے دور کی گستاخیوں اور کوتاہیوں کے لئے دست بستہ معافی کے خواستگار ہیں اور امید کرتے ہیں کہ وہ مادرانہ کرم سے کام لیتے ہوئے ہمیں معاف فرمادیں گی اور زندگی کا نیا حوصلہ دیں گی۔“ عماد الملک نے کسی مجرم کی مانند بیگم کے سامنے ہاتھ باندھ کر کہا۔ ”مغل“ یا ”ترک“ سے ان کے دل میں کئی تیر پوٹ ہو گئے تھے۔

”ماں بچوں کو معاف کرنے کے سوا اور کر ہی کیا سکتی ہے۔ خالق حقیقی نے اسے پیدا ہی معاف کرنے کے لئے کیا ہے۔ ہم اس پیدا ہی تقاضا سے انحراف نہیں کر سکتے۔ بیٹے کی نئی زندگی ماں کی بھی نئی زندگی ہے۔“ بیگم کی آواز میں یاس کا عنصر محسوس ہو رہا تھا۔

باتیں کرتے ہوئے بیگم مسلسل عماد الملک کے چہرے پر کچھ تلاش کرنے کی کوشش کر رہی تھیں آخری دفعہ جب وہ بٹے تھے تو عماد الملک سلطنت ہند کا خود مختار اور خود سر وزیر اعظم تھا اور امراء اور وزراء اور مودب درباریوں کے ایک جلوس کے ساتھ ان کے ہاں حاضر ہوا تھا پھر وہ وزیر اعظم سے قیدی بنا شہنشاہ ہند اور مسلمان ملت

افغان سواروں کا دستہ مغلانی بیگم کے ڈیرے میں داخل ہوا تو پہریداروں نے انہیں پہچاننے کے لئے مشعلیں اونچی اٹھالیں اور نظریں اٹھاتے ہی سلامی کے لئے جھک گئے۔ دو افغان سوار آگے بڑھے۔ مشعل بردار ۱۱ کے آگے آگے چلے گئے باقی سپاہی وہیں رک گئے۔ مغلانی بیگم کے خیمے کے سامنے پہنچ کر سواروں نے باگیں کھینچ لیں تو مشعل برداروں کے قدم وہیں جم گئے۔ خیمہ کی پہرہ ڈیوٹی پر خدام نے سواروں کو سلامی دی اور بیگم کو اطلاع دینے کے لئے تھوڑے چلتے ہوئے محوم گئے، سوار وہیں کھڑے رہے۔

”تشریف لائیں حضور مختار ہیں۔“ ایک خادم نے خیمے سے برآمد ہو کر اطلاع دی سوار کھڑوں سے اتر آئے ایک خادم نے آگے بڑھ کر خیمے کا پردہ اٹھا دیا۔ مغلانی بیگم اپنی نشست سے اٹھ کر خیمے کے درمیان میں کھڑی تھیں۔ ایک مہمان نے جھک کر بیگم کے پاؤں چھونے کی کوشش کی۔ وہ خاموش کھڑی رہی پاؤں چھو کر وہ بیگم کے سامنے سر جھکا کر کھڑا ہو گیا بیگم بار بار اسے سر سے پاؤں تک دیکھ رہی تھی۔ محسوس ہوتا تھا اس کے الفاظ کا خزانہ مغل شہنشاہ کے فرمانے کی مانند خالی ہو چکا ہے، اس کا ساتھی دروازے کے پاس کھڑا مسکرا رہا تھا۔

”اس خوشی نے ہمیں لفظوں سے محروم کر دیا ہے۔“ بیگم نے نشست کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”خداے بزرگ دیر تر کے بعد مادر محترمہ کا شکر ہم پر واجب تھا۔“ پاؤں چھونے والے نے جواب دیا۔

”اس کرم کے لئے ہم خداے بزرگ کا جتنا شکر ادا کریں کم ہے، بادشاہ معظم نے ہم پر لطف کیا، ہم ان کے بھی شکر گزار ہیں اور شاہ ولی خاں کے بھی جنہوں نے ہمارا دکھ ہٹانے اور ہمارے بیٹے کی جان بچانے میں مشکلات اور خطرات کی پروا نہ کی۔“ بیگم نے دوسرے

”ماں اور بیٹے کا ایک ساتھ شاہجہان آباد میں داخلہ ہم مناسب نہیں سمجھتے۔“ بیگم نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔ ان کے ڈیرے میں گنا بیگم بھی موجود تھی اور وہ بھی ان کے ہمراہ شاہجہان آباد جانے والی تھی۔ ”ہمارا ہاتھی اور سوار موجود ہیں، ضرورت ہو تو آپ لے جاسکتے ہیں۔“

عماد الملک کی حراست کے دوران ان کے ہمراہ آنے والے ہاتھی گھوڑے سوار اور پیدل سب منتشر ہو گئے تھے۔

”ہمارا افغان دستہ عماد الملک کے ساتھ شاہجہان آباد جائے گا۔“ شاہ ولی خاں نے بیگم کا اشارہ سمجھتے ہوئے کہا۔

پردے کے پیچھے کھڑی کنیر نے مداخلت کے لئے معافی کی درخواست کی اور دستہ خزان بچانے کی اجازت چاہی۔ خدام میوے اور قبوہ چن چکے تو بیگم نے ایک بار پھر موضوع بدلنا چاہا۔ وہ بادشاہ معظم کے ارادوں اور نئے نظم سلطنت کے بارے میں جاننا چاہتی تھی مگر شاہ ولی خاں ٹالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ”بادشاہ معظم شاہجہان آباد میں قیام کے دوران شہنشاہ ہندوستان سے تحریری معاہدہ کی رسم پوری کریں گے اس کے سوا حضور اور کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ بادشاہ معظم کے سوا کوئی نہیں جانتا۔“

”ہم سمجھتے ہیں حرم شاہی بھی بادشاہ معظم کے جلوس کے ہمراہ شاہجہان آباد جائیں گے؟“ مظاہر بیگم نے پوچھا۔

شاہ ولی خاں بیگم کے سوال کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ ”بادشاہ معظم جہاں قیام فرمائیں ان کے حرم وہیں قیام پذیر ہوتے ہیں، اس روایت پر عمل ہوگا۔“

”جانوں اور مرہٹوں کی سرکشی چکنا لازم ہے بادشاہ معظم کی فوجیں تھر اور آگرہ کی طرف چڑھائی کا ارادہ

کاسب سے بڑا مجرم قرار دیا گیا۔ شہنشاہ ہند نے اس کے جرائم کے لئے موت کی سزا تجویز کر دی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ بادشاہ شہنشاہوں کی خواہشات مسترد نہیں کیا کرتے انہیں یقین تھا کہ بادشاہ کا مل وقتہ ہار شہنشاہ ہند کی اپنے قومی مجرم کو سزا دینے کی درخواست مسترد نہیں کریں گے۔ اب عماد الملک نہ وزیر اعظم تھا نہ قیدی اور نہ مجرم، بیگم اسے نئے روپ میں نئے انداز سے سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

شاہ ولی خاں کبھی عماد الملک کے چہرے پر نئی تحریروں کے معانی نکالتا اور کبھی بیگم کی باتوں سے اس کے دل کی حالت کا اندازہ کرنا شروع کر دیا۔

”ہم سمجھتے ہیں بادشاہ معظم شاہجہان آباد کے مغلیہ ایوانوں کو قدم پوسی کا موقع دے کر سرفراز فرمانے کا ارادہ رکھتے ہیں؟“ بیگم نے شاہ ولی سے پوچھا۔

”بادشاہ معظم نے شہنشاہ ہند کی دعوت قبول فرمائی ہے۔“ شاہ ولی خاں نے جواب دیا۔

”ہماری خواہش ہے کہ ہم بھی بادشاہ معظم کا شاہجہان آباد میں استقبال کریں۔“ بیگم نے کہا۔

”بادشاہ معظم حضور کی ہر خواہش کا احترام کرتے ہیں۔“ شاہ ولی خاں نے رضامندی ظاہر کر دی۔

”ہم کل دن ڈھلے شاہجہان آباد روانہ ہونا چاہتے ہیں۔ بادشاہ معظم تک ہماری درخواست پہنچ جائے تو ہم ممنون ہوں گے۔“ بیگم نے شاہ ولی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”خادم حضور کے حکم کی پابندی کرے گا۔“

”بادشاہ معظم کے کرم سے حضور کے من فرزند کو بھی شاہجہان آباد روانہ ہونے کی اجازت مل گئی ہے۔ حضور موقع دیں تو فرزند کو مادر محترم کے زیر سایہ سفر کے مسرت ہوگی۔“ عماد الملک نے بیگم کے شاہجہان آباد روانگی کے ارادہ کو جان کر درخواست کی۔

اس رات طلوع آفتاب تک گناہِ بگم کے خیمے میں
شع نہیں جلی۔

شاہجہان آباد کی گلیوں اور بازاروں میں ڈھنڈور بجی
اعلان کرتے پھر رہے تھے "بادشاہِ معظم احمد شاہ ابدالی کا
جلوس پُشکوہ کل بروز جمعہ شہر میں درود فرمائے گا۔ اہالیان
شہر اپنے کرم فرما کا خلوص دل اور احسان مند آنکھوں سے
استقبال کریں گے اور جن راستوں سے شاہی جلوس
گزرے گا ان سے دور رہیں گے۔" لوگ کھڑکیاں کھول کر
اعلان سننے اور گھروں کے دروازے بند کر لیتے ان کے
دلوں پر ابھی تک افغان سپاہیوں کا خوف مسلط تھا۔ کوتوال
شہر خود شہر اور شہریوں کا جائزہ لیتے پھر رہے تھے۔ شام ڈھلے
قلعہ معنی کی طرف جاتے ہوئے شیش محل کے قریب پہنچے تو
گھوڑے کی لگام مٹھ لی۔

شیش محل کے ایوانوں اور دالانوں میں شمعیں روشن
تھیں اور بیرونی راستے پر مشعل بردار کھڑے تھے خوفزدہ
خلیہ دار حکومت کی ایک حویلی میں روشنیوں کا شلاب
دیکھ کر وہ گھوڑے سے اتر آیا پہریداروں کے کماندار نے
اس کے پوچھنے سے پہلے ہی آداب عرض کر کے بتایا کہ
وزیرِ اعظم ہند خان خاناں انتظام الدولہ کی والدہ نواب
شولا پوری بیگم شریف لائی ہیں۔ عمدہ بیگم اور دیگر خواتین
بھی ان کے ہمراہ ہیں۔ لوا ل نے حفاظتی انتظامات کے
بارے میں چند سوال پوچھے اور اپنے دست کے ساتھ آگے
چل دیا۔ ابھی چند روز پہلے تک مغلائی بیگم زیرِ حراست
تھیں تو کوئی اس حویلی کا رخ نہیں کرتا تھا۔ آج شاہجہان
آباد کے امراء اس کے حضور حاضری کے لئے بیتاب
ہیں۔ تجربہ کار انقلابات دیدہ کوہا ل نے انقلاب کے
بارے میں سوچنے لگا جو امراء مغلائی بیگم کے انوا میں
مشیر اور معاون رہے وہ سب سے زیادہ پریشان تھے۔
بیگم نے دھمکی دی تھی۔ "احمد شاہ ابدالی میری تو بین

رکھتی ہیں؟" بیگم نے پوچھا۔

"اس کا فیصلہ شہنشاہ ہند کے مشورہ سے ہوگا۔" شاہ

ولی خان نے اس انداز میں جواب دیا جیسے کہہ رہا ہو اس
بارے میں مزید گفتگو مناسب نہیں۔

بیگم اشارہ سمجھ گئی، عماد الملک خاموش بیٹھا قبوہ
چمک رہا تھا۔ اس نے فغان لیوں تک لے جاتے ہوئے
ناک کے قریب رکھ کر کچھ سونگھنے کی کوشش کی اور پھر جلدی
سے لیوں سے لگا لی کہ بیگم کو احساس نہ ہو کہ قبوہ کی خوشبو
اس کی پرانی زندگی کی حسین یادیں تازہ کر رہی ہے۔

ماگھ کی سرد رات تیسری چوتھائی میں داخل ہو رہی
تھی۔ جب شاہ ولی خان نے رخصت کے لئے اجازت
چاہی بیگم نے خادم کی طرف دیکھا۔ "سواریاں حاضر
کرنے اور مہمانوں کو خدا حافظ کہنے کا اہتمام ہو چکا
ہے؟"

خادم آداب عرض کر کے جلدی سے خیمے سے باہر
نکل گیا۔

"شاہ ولی خان رخصت ہونے کے لئے اعلان
عماد الملک نے بیگم کی طرف دیکھا وہ بھی اٹھنے کے لئے
لباس سنبھال رہی تھیں۔ جب وہ نشست سے اٹھ چکیں تو
اس نے جھک کر ایک دفعہ پھر بیگم کے پاؤں چھوئے اور
دروازے کی طرف مڑ گیا۔

بیگم نے خیمے کے پردہ کے پاس انہیں رخصت
کیا۔

عماد الملک نے گھوڑے پر سوار ہونے سے پہلے
مشطوں کی مدد سے روشنی میں خیموں کا جائزہ لیا گھوڑے پر سوار ہو
کر شاہ ولی خان کے پہلو میں چلتا ہوا وہ بار بار اس خیمے کی
طرف دیکھ رہا تھا جس سے روشنی کی کوئی ایک شعاع بھی
نکل کر اسے جاتا دیکھنے کو کوشش نہیں کر رہی تھی۔ ڈیرہ سے
نکل کر وہ آسمان پر چمکتے ستاروں میں مستقبل کا راستہ
حاش کرنے لگا اور روشنی کا دکھ بھول گیا۔

RTM: 71114



سب اچھا لگا مگر
بات ان سے بنی



U.I INDUSTRY

184-C, Small Industries State
Gujrat PAKISTAN.
PH: +92 53 3535901-2, 3523494-5
Fax: 053-3513307
E-mail: nbsfans@gmail.com

طرح محبت کرتی ہے جیسے پہلے کیا کرتی تھی۔ شاہجہان آباد میں ایک فرد بھی خوفزدہ نہیں۔ کوئوال نے دست بستہ جواب دیا۔

”مابدولت راستہ میں کوئی ایک فرد بھی نہ دیکھ سکے۔“ شہنشاہ نے پوچھا۔

”سردار جہان خاں کے حکم پر اہل شہر کو گھروں میں بند رہنے کے لئے کہا گیا تھا۔“ کوئوال کی بجائے انتظام الدولہ نے شہنشاہ کو بتایا۔

شہنشاہ ہند خاموش ہو گئے۔ شاید اپنی آزادی اور

حاکمیت کا جائزہ لینے کے لئے ایلیجیوں نے بادشاہ کا بل و

قدحار کے جلوس کی پہلی جھلک دیکھ کر اطلاع دی تو

شہنشاہ کا استقبالی جلوس ایک بار پھر ترتیب دیا گیا۔ احمد

شاہ ابدالی کا جلوس قریب پہنچا تو شہنشاہ کا باقی جلوس سے

نکل کر افغان بادشاہ کی سواری کی طرف گئے لگا۔ احمد شاہ

ابدالی نے شہنشاہ کو آتا دیکھ کر گھوڑا آگے بڑھا دیا۔ اسی

کے ساتھ ہی فضا توپوں کی آوازوں سے گونجنے لگی۔

افغان سوار اور سردار جلوس کی ترتیب سے نکل کر چاروں

طرف پھیل گئے۔ توپوں کی سلاخی ختم ہوئی تو شہنشاہ اور

بادشاہ کا جلوس قلعہ معلیٰ کی طرف چل دیا۔ شہنشاہ کے

باقی کو مہاروت ہانک رہا تھا جبکہ افغان بادشاہ کے گھوڑے

کی لگا میں بادشاہ کے اپنے ہاتھوں میں تھیں۔ گھروں کے

دروازے اور کھڑکیاں بند تھے اور افغان سردار اور اسراء

مغل دارالحکومت کی عظمت و شان کی کہانوں کا ویران

گلیوں اور بازاروں سے مقابلہ کر رہے تھے۔ مغل

حکمرانوں اور ان کی عظمت و شان کی انہوں نے جو

دستاویں مٹی تھیں۔ ان پر صرف وہ ہاتھی پورا آتا تھا جس

پر مغل شہنشاہ سوار تھے ہاتھی کی سجاوٹ اور چال و حال

میں وہی جاہ و جلال تھا جو اکبر اور جہانگیر کی سواری کے

ہاتھیوں کے سنا کرتے تھے۔

جلوس قلعہ معلیٰ ک قریب پہنچا تو افغان فوج منتشر

ہونے لگی شاہی اور شہنشاہی سواریاں قلعہ میں داخل ہو چکیں تو افغان دستوں نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا اور ابدالی لشکر نے قلعہ کی فسیل کے ساتھ ساتھ اور دروازوں کے سامنے خیمے نصب کر لئے۔

جامع مسجد کے خطیب نے جمعہ کا خطبہ شروع کرنے سے پہلے منبر کے سامنے دو رنگ پھیلے نمازیوں کا جائزہ لیا۔ جن میں افغان سپاہیوں اور سرداروں کی بہت بڑی تعداد بھی تھی۔ انہیں خوشی ہوئی خطیب نے محسوس کیا کہ افغان مسلمانانہ ہند سے زیادہ دور نہیں آئندہ بھی کبھی انہیں کفار سے خطرہ نہ ہوگا تو افغان اسی طرح ان کی حفاظت کے لئے آ موجود ہوں گے لیکن پھر سے عالمگیر ثانی کے نام کا خطبہ پڑھتے ہوئے انہیں کچھ محسوس ہوا گذشتہ جمعہ احمد شاہ ابدالی کے نام کا خطبہ پڑھتے وقت انہیں یقین کامل تھا کہ ابدالی نے شاہجہان آباد میں مستقل قیام کا فیصلہ کر لیا ہے اور زوال پذیر مغل شہنشاہیت اور جاہ برست امراء سے امت مسلمہ کو نجات ملنے والی ہے۔ احمد شاہ ابدالی کے عالمگیر ثانی کو شہنشاہ برقرار رکھنے اور خاں خاناں انتظام الدولہ کو وزیر اعظم مقرر کرنے کے فیصلہ سے علماء کو مایوسی ہوئی تھی۔

شاہجہان آباد کی دیگر مساجد میں بھی اس روز پھر سے شہنشاہ ہندوستان عالمگیر ثانی کے نام کا خطبہ پڑھا گیا قلعہ معطلی کی سوتی مسجد میں اس روز بہت زیادہ حاضری تھی۔ ایک شہنشاہ ایک بادشاہ اور دو ممالک کے امراء، وزراء اور سردار نمازیوں میں شامل تھے اور سب عالمگیر ثانی کے نام کا خطبہ سن رہے تھے۔ نماز کے بعد شہنشاہ متبع خانہ تشریف لے گئے جہاں امراء اور وزراء نے حاضری دی۔ احمد شاہ ابدالی محل سرا میں تشریف لے گئے جو ان کے اور ان کے حرم کے قیام کے لئے خالی کر دیا گیا تھا۔ (جاری ہے)

برداشت نہیں کرے گا وہ جلد شاہجہان آباد آئے گا اور جن امراء نے میری توہین حصہ لیا ہے انہیں ذلیل و خوار کر کے ان سے بدلہ لے گا۔ ان سب کو اس جرم کی سزا بھگتنا ہوگی۔ احمد شاہ ابدالی شاہجہان آباد پہنچ گیا تھا اور وہ امراء اپنی ذلت اور خواری سے بچنے کی کوششوں میں مصروف تھے کوئی نواب شولا پوری بیگم کی سفارش ڈھونڈ رہا تھا تو کوئی عمدہ بیگم کے حضور پیش ہو کر مغلائی بیگم سے سفارش کی درخواست کر رہا تھا۔ کوتوال نے اندازہ کیا کہ خاندان کی خواتین اور بیگم کی ساس اور بیٹی امراء شاہجہان کی سفارش لے کر آئی ہوں گی مگر مغلائی بیگم کس کس کی سفارش منظور کرے گی کس کس کو ذلیل و خوار کروائے گی؟ قلعہ معطلی کے دروازے پر پہنچ کر اس کی سوچ کا دھاگا ٹوٹ گیا۔ جہاں خان اس کے منتظر تھے اور ڈیوڑھی کا کماندار افغان جرنیل کا علم پہنچانے کے لئے بے تاب تھا۔

عالمگیر ثانی کا جلوس ایک ہفتہ میں دوسری بار قلعہ معطلی سے برآمد ہوا۔ شہنشاہ ہاتھی پر سوار تھے وزیر اعظم خان خاں انتظام الدولہ اور امراء شاہجہان آباد کی سواریاں ان کے دائیں بائیں اور پیچھے چلی آرہی تھیں۔ شہنشاہ کا جلوس جدھر سے گزرتا لوگ راستہ چھوڑ کر گلیوں میں چھپ جاتے اور گھروں کے دروازے اور کھڑکیاں بند کر لیتے۔ شہنشاہ شاہجہان آباد کے ماسیوں کی اس حرکت پر حیران ہوئے یہ اہل شاہجہان آباد کی روایت اور عادت نہ تھی۔ مسجد فتح پوری کے قریب پہنچ کر جلوس رک گیا تو شہنشاہ ہاتھی سے اتر کر پہلے سے نصب شاہی خیمہ میں تشریف لے گئے۔ کوتوال شہر کو طلب فرمایا اور پوچھا۔ ”مابدولت جاننا چاہیں گے کہ ہماری رعایا ہمارے جلوس سے خوفزدہ کیوں ہے؟“

”شہنشاہ معظم کی رعایا حضور عالی مقام سے اسی



☆ منتسب: احمد یار خان / تحریر: عارف محمود

گالی دیوی کا داس

یہ مجھے معلوم تھا۔ اس بے چارے کا شیل کو کیا معلوم کہ ان کا پنڈت عورتوں کا شکاری ہے اور اپنی عیاشی کے لئے اپنی گمشدہ جوانی کو دوائیوں کے سہارے قائم رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔

اور انعام دیا کرتے تھے، تعریفی سند بھی دیتے تھے۔ ترقی کا دارو مدار عام طور پر ذہنی اور قلبی کی کامیاب تفسیثوں پر ہوتا تھا۔

ان دنوں ایک انگریز ایس پی مسٹر لسن ہوا کرتا تھا جو تھانیداروں کی جان کو آزار پہتا تھا۔ وہ اچانک کسی بھی علاقے کے تھانے میں بلائے ناگہانی کی طرح نازل ہوتا اور تھانیدار کی کم بختی آجاتی۔ تھانے کے ریکارڈ کے علاوہ وہ متعلقہ تھانے کی غارت، دفتر کی حالت اور عملے کو بھی چیک کرتا۔ اس لئے اس کے ڈر سے تھانیدار اور ماتحت عملہ صاف ستھری استری شدہ وردی پہنا کرتے اور سر کے بال کٹوا کے شیڈ روزانہ بناتا تھا۔

اسی طرح ایک دن مسٹر لسن میرے تھانے کے معائنے کے لئے آگیا۔ پہلے اس نے دفتر اور عملے کا معائنہ کیا اور پھر تھانے کا ریکارڈ چیک کیا۔ گو مجھے اس تھانے میں آئے ہوئے چند ماہ ہی ہوئے تھے مگر میں نے خصوصی توجہ دے کر بعض پرانے کیس بھی قلم کر لئے تھے اور میری تعیناتی کے عرصہ میں کوئی کیس التوا میں نہیں تھا۔ مسٹر لسن نے میری کارکردگی کو سراہا اور مجھے کچھ تجاویز اور مشورے دیئے جو کچھ ایسے کارآمد اور معقول نہیں تھے لیکن وہ حاکم قوم سے تعلق رکھتا تھا اور میرا آفیسر بھی تھا اس لئے میں نے خندہ پیشانی سے مسکرا کر اس کا شکریہ ادا کیا۔

ابھی مسٹر لسن میرے دفتر میں بیضا بات چیت کر رہا تھا کہ باہر سے کچھ لوگوں کے بولنے کی آواز آئی۔ وہ کسی لاش کا ذکر کر رہے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ کسی واردات کی اطلاع آئی ہے اور کچھ لوگ رپورٹ درج کروانے آئے ہیں۔ مسٹر لسن نے یہ شور شراب سنا تو محروالے کمرے کی طرف چلا گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے ہولیا۔ وہاں جا کر دیکھا کہ چار پانچ ویہائی آدمی کھڑے تھے اور ان کے ساتھ دو بچے تھے جن کی عمریں بارہ پندرہ سال کے درمیان ہوں گی۔

ایکا ارتکاب ضروری نہیں کہ صرف جرائم پیشہ جرم لوگ ہی کریں، یہ وقت ضرورت سیدھے سادے لوگ بھی جرم کر گزرتے ہیں۔ وہ کوئی ایسا چھوٹا جرم یا غلطی کر بیٹھتے ہیں جو ان کے لئے گلے کی ہڈی بن جاتا ہے اور پھر اس کو چھپانے کے لئے ایک بڑا جرم کر بیٹھتے ہیں۔ انسان فطرت کے لحاظ سے بڑا عیار اور مکار ہے۔ اپنے اوپر شرافت کا پردہ ڈال کر ایسے ایسے گھٹاؤں سے کام کر جاتا ہے کہ کوئی یقین نہیں کرتا لیکن ایک تجربہ کار اور عقلمند تھانیدار شرافت کے پردے میں چھپے مجرم کو پہچان لیتا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ کیس آپ کو عجیب لگے لیکن ایک تھانیدار اور وکیل کی نگاہ میں کوئی بھی بات عجیب اور حیران کن نہیں ہوتی پھر بھی بعض اوقات کوئی واردات ایسی ہو جاتی ہے جو تھانیدار کو بھی چونکائے پر مجبور کر دیتی ہے۔

ہمارے وقتوں میں ماہر اور تجربہ کار تھانیدار کسی مشتبہ کا چہرہ اور حرکتیں دیکھ کر اندازہ لگا لیتے تھے کہ اس شخص کا واردات سے تعلق ہے یا نہیں لیکن مشکل کام یہ ہوتا تھا کہ مجرم سے اقبال جرم کرایا جائے اور اس کے خلاف قیاس ثابت کیا جائے۔ میں جس واردات کی کہانی سنانے لگا ہوں یہ تقسیم سے پہلے کی ہے۔ ان دنوں میں آگرہ کے ایک ضلعا قیام علاقہ میں تعینات تھا۔ یہ تھانہ شمشاد نگر کے علاقے میں تھا۔ یہاں ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کی ملی جلی آبادی تھی۔ مسلمان اور ہندو زیادہ تھے اور سکھ اقلیت میں تھے۔

حکومت انگریز سرکار کی تھی جو صرف قانون بنانا ہی نہیں جانتے تھے بلکہ اس پر عمل کروانا بھی جانتے تھے۔ وہ خود بھی قانون پر عمل کرتے اور دوسروں سے بھی کروانے تھے۔ آج کی طرح نہیں کہ قانون صرف کمزور کو پکڑتا ہے اور طاقتور کے آگے ہاتھ باندھا غلام بن جاتا ہے۔ اس زمانے میں انگریز آفیسر خود تھانوں کا دورہ کرتے اور تھانے کا ریکارڈ چیک کرتے تھے اور اس کے مطابق ترقی

”ایک بات کا خیال رکھنا مسٹر ملک!“ جاتے جاتے مسٹر لسن نے مجھے مخاطب کر کے کہا۔ ”ہم کو اس ٹیکس کی رپورٹ ضرور بھیجنا، ہم کو لگتا ہے یہ قتل کا معاملہ ہے۔“

یہ دیکھتی لوگ ایک تیل گاڑی پر آئے تھے۔ میں نے اسی وقت موقع پر جانے کی تیاری کر لی اور نمبردار سے کہا کہ وہ کنویں میں اترنے اور لاش نکالنے والے آدمیوں کا انتظام کرے۔ نمبردار نے اپنے ساتھ آئے دو آدمیوں سے کہا کہ وہ جلدی چلے جائیں اور مطلوبہ آدمیوں کو لے کر کنویں پر پہنچیں۔ میں نے کھوجی کو بھی بلوا لیا تھا۔ ہم نے ایک جگہ لے لیا۔ نمبردار بھی ہمارے ساتھ ہی تھا۔ راستے میں میں اس سے باتیں کرتا گیا۔

معلوم ہوا کہ اس گاڑی کے باہر دروازے ان علاقے میں ایک دو کنویں ہیں جو قابل استعمال نہیں اور ان کا پانی سوکھ گیا ہے اور ان کی گہرائی بھی بہت زیادہ نہیں۔ ایسے کنویں کو وہاں کی زبان میں ڈل کہا جاتا ہے۔ سوکھے ہوئے کنوؤں کی دیواروں سے انشیں گر گر کر سوراخ بن گئے ہیں۔ ان سوراخوں میں جنگلی کبوتر اور طوطے اپنے گھونٹنا بنا لیتے ہیں، چونکہ یہ کنویں زیادہ گہرے اور خطرناک نہیں ہوتے، اس لئے اکثر دیہات کے لڑکے ان کنوؤں میں اتر کر کبوتروں اور طوطوں کے بچے نکال لاتے تھے۔ یہ جو دو لڑکے جنہوں نے لاش دیکھی تھی، یہ اس کنویں میں اسی نیت سے اترے تھے کہ ان کو معلوم ہوا تھا کہ یہاں طوطوں کے بچے موجود ہیں، وہ انہیں نکالنے آئے تھے مگر لاش دیکھ کر خوفزدہ ہو کر گاڑی بھاگ آئے۔ میں نے نمبردار سے پوچھا کہ ان کے گاڑی کی کوئی عورت بائو کی لاپتہ تو نہیں ہے۔ اس کے جواب میں اس نے بتایا کہ اگر ایسی بات ہوئی تو سب سے پہلے اس کے علم میں لائی جاتی، اگر ارد گرد کے کسی گاڑی کی کوئی عورت لاپتہ ہو تو کچھ کہا نہیں جاسکتا۔

مسٹر لسن ٹوٹی پھوٹی اردو بول اور سمجھ لیتا تھا مگر ان لوگوں کی دیکھتی بولی اس کی سمجھ سے باہر تھی۔ اس نے مجھے کہا کہ مسٹر ملک ان سے پوچھو کیا مسئلہ ہے اور پھر مجھے بتاؤ۔

میں نے ان لوگوں سے پوچھا کہ وہ کیوں آئے ہیں تو ان میں سے ایک جو اچھے لباس میں تھا اور معزز لگ رہا تھا، وہ آگے ہوا اور اس نے بتایا کہ وہ لوگ ایک گاڑی مڑھی گوپال سے آئے ہیں اور وہ وہاں کا نمبردار ہے۔ وہاں ایک پرانے کنویں میں کسی عورت کی لاش نظر آ رہی ہے۔

یہاں میں یہ بتا دوں کہ یہ کہنے کو تو گاڑی تھا لیکن اصل میں اچھا خاصا وسیع قصبہ تھا۔ یہاں سکول اور ڈسٹری بھی تھی۔

”لاش کس نے دیکھی ہے؟“ میں نے دریافت کیا۔ ”ان دو بچوں نے سب سے پہلے لاش دیکھی تھی۔“ نمبردار نے بتایا۔ ”یہ خوفزدہ ہو کر گھر بھاگ آئے اور اپنے گھر والوں کو بتایا تو انہوں نے آ کر مجھے اطلاع کی۔ میں خود موقع پر جا کر لاش دیکھ کر آیا ہوں۔“

”کچھ پتا چلا کہ لاش کس کی ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”نہیں جنتاب!“ نمبردار نے کہا۔ ”میرا اصل لاش کنویں میں پیٹ کے بل پڑی ہے، اس لئے اس کی شکل نظر نہیں آ رہی۔ یہ تو نکالے جانے کے بعد ہی معلوم ہوگا کہ وہ کون بد نصیب ہے۔“

میں نے نمبردار سے ساری تفصیل معلوم کر کے انگریزی میں مسٹر لسن کو سنادی اس نے مجھے فوری طور پر موقع پر جانے کا حکم دیا اور کہا کہ معلوم کرو کہ یہ عورت کسی غلطی کی وجہ سے کنویں میں گر کر مر گئی ہے یا کسی نے اسے قتل کر کے کنویں میں پھینکا ہے۔

حُسنِ فتنہ خیز

کچھ دیر بعد ہم سوتھ والی جگہ کے نزدیک پہنچ گئے۔ کوچوان نے تانگہ ایک جگہ روک دیا۔ اس سے آگے تھوڑا سا راستہ ایسا تھا کہ تانگہ وہاں نہیں جاسکتا تھا۔ ہم نیچے اتر کر نمبردار کی رہنمائی میں کنویں کی طرف چل پڑے۔ چونکہ گاؤں میں لاش کی خبر پہنچ چکی تھی۔ اس لئے وہاں خاصے دیہاتی مرد اور عورتیں تماشا دیکھنے آ گئے ہو گئے تھے۔ ایک بات کی مجھے حیرانی ہوئی کہ یہ دیہاتی کنویں سے کچھ فاصلے پر کھڑے تھے اور انہوں نے کنویں کے قریب جانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ پھر اس کی وجہ بھی سمجھ میں آ گئی۔ یہ نمبردار کی عقل مندی تھی کہ اس نے وہاں اپنے آدمی مقرر کر رکھے تھے جو لوگوں کو ایک حد سے آگے جانے سے روک رہے تھے۔ نمبردار سمجھتا تھا کہ پولیس کو کنویں کے ارد گرد کی زمین سے کوئی کام کی بات معلوم ہو سکتی ہے اور اگر کسی نے عورت کو قتل کر کے کنویں میں پھینکا ہے تو اس قاتل کے کھرے وہاں مل سکتے ہیں۔ بہر حال میں نے دل ہی دل میں نمبردار کو سراہا۔

بادوری تو تھانیدار اور کانسٹیبلوں کو دیکھ کر وہاں کھڑے لوگوں میں ایک ہلچل سی مچ گئی اور لوگ یہ کہہ کر راستہ چھوڑنے لگے۔ ”شوہنو، پولیس آگئی۔“ میں نمبردار کے ساتھ آگے بڑھا اور ہم نے اس بات کا خیال رکھا کہ وہاں پہلے سے موجود کھروں کے نشان ہمارے قدموں تلے آ کر بر باد نہ ہوں۔ میں نے کنویں کی منڈیر کے قریب جا کر اندر جھانک کر دیکھا۔ وہاں پینٹ کے بل ایک عورت کی لاش پڑی تھی۔ میں نے اپنی تجربہ کار نظروں سے اندازہ لگا لیا کہ یہ عورت نہیں، بلکہ جوان لڑکی ہے۔ اس کا جسم متناسب اور سکرپٹل تھی جبکہ سیاہ گھٹنے بال بھرے ہوئے تھے۔ اس کے جسم پر پھولدار ریشمی لباس صاف نظر آ رہا تھا۔ بہر حال میرے اندازے کی تصدیق تب ہی

ہوئی تھی جب لاش باہر نکالی جاتی۔ میں پیچھے ہٹ کر کنویں کے ارد گرد کھروں کے نشان اور کوئی سراغ ڈھونڈنے لگا۔

جن دولٹروں نے لاش دریافت کی تھی۔ ان کے چھوٹے چھوٹے قدموں کے کھرے الگ سے صاف پہچانے جا رہے تھے۔ اس کے علاوہ ایک مردانہ جوتے کے نشان موجود تھے جو کسی ایسے جوتے کے تھے جو دیہات میں عام استعمال ہوتے تھے۔ میں نے غور سے دیکھا تو ان کھروں کے ساتھ ہی زمین پر ایسے نشان تھے جیسے زمین پر کوئی چیز گھسیٹنی گئی ہو۔ میں اس گھسیٹنے کے نشان کے ساتھ ساتھ چلنے لگا تو پندرہ بیس قدم آگے جا کر وہ نشان ختم ہو گیا اور صرف جوتوں کے نشان باقی رہ گئے۔ میں نے اچھی طرح کنویں کے ارد گرد محوم کر زمین کا جائزہ لیا مگر اور کوئی کھرا نہ ملا یعنی عورت جو لاش کی صورت کنویں میں پڑی تھی، اس کے آنے کا کوئی کھرا وہاں موجود نہیں تھا۔ اس کا صاف مطلب یہی تھا کہ عورت وہاں تک اپنے قدموں سے چل کر نہیں آئی بلکہ وہ قاتل کے کندھوں پر تھی۔ قاتل اسے اٹھا کر یہاں تک لایا تھا پھر مٹا ہوا دھک گیا ہو گا اور اس نے لاش کو نیچے اتارا اور پھر تھوڑے فاصلے تک گھسیٹ کر کنویں تک لا کر لاش کنویں میں گرا دی۔

اس دوران کنویں میں اترنے والے آدمی آگئے۔ تھوڑی دیر بعد کھوئی بھی آ گیا۔ میں نے کھوئی کو کھرے دکھائے اور اپنی رائے سے بھی آگاہ کیا۔ وہ اپنے کام کا باہر تھا۔ اس نے زمین سے بھید لینے کا کام شروع کر دیا۔ لوگ مجھے اور کھوئی کو اس طرح کی حرکتیں کرتے دیکھ کر حیران ہو رہے تھے جیسے ہم جادو منتر کا کوئی عمل کر رہے ہوں اور ابھی قاتل حاضر ہو جائے گا۔ کھوئی اپنے کام میں لگ گیا تو میں نے کنویں میں اترنے والے آدمیوں کو لاش نکالنے کا حکم دیا۔ وہ رسوں کی مدد سے کنویں میں اتر

رہنشی پھولدار سوٹ پہن رکھا تھا۔ ہونٹوں پر سرنی لگا رکھی تھی۔ اس کے گھنے سیاہ بال کھلے تھے۔ یہ ظاہر اس کے جسم پر کسی ضرب کا نشان نظر نہیں آ رہا تھا اور نہ ہی کپڑوں پر خون کا کوئی دھبہ تھا۔ اس کا دوپٹہ اس کی گردن میں موت کا پھندا بن کر لپٹا ہوا تھا۔ لاش کے پاؤں میں جوتی نہیں تھی جو غائبانہ ہیں رہ گئی ہوگی جہاں اسے قتل کیا گیا ہوگا۔ میں نے موقع پر جو کارروائی کرنی تھی، وہ کر لی۔

اب لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے بھجوانے کا انتظام کرتا تھا۔ نمبردار نے ایک چارپائی منگوا کر لاش اس پر رکھوا دی اور اسے ہسپتال تک لے جانے کے لئے وہی تیل گاڑی منگوائی جس پر وہ تھانے آئے تھے۔ اسی وقت گاؤں کی طرف سے چند آدمی اور دو تین روتے دھوتے آ گئے۔ ان میں ایک پنڈت تھا جو سر پر بے بالوں کی بودی اور حلیے سے پہچانا جا رہا تھا۔ وہ ”رام رام یہ کیا ہو گیا“ کا ورد کرتا ہوا آ رہا تھا۔ اس کے پیچھے ایک غریب سا بوڑھا آنسو بہاتا ہوا آ رہا تھا اور تین عورتیں ٹٹن کر رہی تھیں۔ یہ لوگ لاش کے پاس جا کر رونے پینے لگے۔ نمبردار نے مجھے بتایا کہ جو غریب سا بوڑھا آدمی ہے وہ مقتولہ کا باپ ہے اور ساتھ اس کی ماں ہے۔

”مقتولہ کا شوہر نہیں آیا؟“ میں نے نمبردار سے پوچھا۔

”وہ تو پیدا کنی جھلا ہے سرکار!“ نمبردار نے کہا۔ ”وہ دماغی لحاظ سے ٹھیک نہیں ہے مگر پنڈت جی نے لوگوں میں یہ مشہور کر رکھا ہے کہ اس کے بیٹے پر کالی دیوی کا سایہ ہے اور وہ دیوی کا پالاکا ہے۔ اس کے بیٹے کو گاؤں کے سب سے سادے دیہاتی ہندو حنجرک اور کالی دیوی کا اوتار مانتے ہیں۔“

کھوتی اپنے کام سے فارغ ہو چکا تھا۔ اس نے مجھے اشارے سے ایک طرف بلایا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اس نے کیا دیکھا ہے۔ اس نے بتایا کہ لڑکی کو

گئے۔ اندر جا کر انہوں نے لاش کو رے سے باندھ دیا پھر باہر کھڑے آدمیوں نے رسہ کھینچ کر لاش باہر نکال لی۔ ایک بڑا چارخانے کا کھیس زمین پر بچھا کر لاش کو اس پر ڈال دیا گیا۔

سب سے پہلے لاش کی شناخت ضروری تھی۔ میری یہ ضرورت نمبردار نے پوری کر دی۔ اس نے لاش کا چہرہ دیکھتے ہی بے ساختہ کہا۔ ”ارے یہ تو لٹا ہے، پنڈت شکر دیال کی بہو۔“

وہ ایک جوان لڑکی تھی۔ اس کا دوپٹہ اس کے گلے میں پڑا ہوا تھا۔ اسی دوپٹے کو گردن کی پچھلی طرف گروہ لگا کر اس کا گلا گھونٹ کر قتل کیا گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کا منہ کھلا ہوا اور آنکھیں ابلی ہوئی تھیں۔ موت کی کٹنی اس کے چہرے پر نقش ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کے باوجود نظر آ رہا تھا کہ وہ ایک پُرکشش اور حسین لڑکی تھی۔ اس کے گلاڑی رنگ میں ایک عجیب طرح کی کشش تھی۔

آپ بھی کہیں گے کہ یہ اچھا تھانیدار ہے جو ایک لڑکی کی لاش کے قریب کھڑا ہو کر شاعرانہ انداز میں اس کے حسن کے قصیدے پڑھ رہا ہے۔ میں وضاحت کر دوں کہ لاش کا حلیہ بیان کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ قارئین کے ذہن میں رہے کہ ایسی خوب لڑکی کی خاطر انسان کسی کو قتل کر بھی سکتا ہے اور خود بھی قتل ہو سکتا ہے اور بعض اوقات ایسا حسن خود اس کی اپنی جان کا بھی دشمن بن سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس قسم کا حسن فساد پیدا کرتا ہے۔

حسین بیوی، جھلا خاوند

نمبردار کے بعد چند اور لوگوں نے بھی اس بات کی تصدیق کر دی کہ یہ پنڈت شکر دیال کی بہو کی لاش ہے۔ پنڈت اسی قصبے کا تھا اور اس کی بہو قصبے سے ہی بیاہ آئی تھی۔ میں نے لاش کا نظری معائنہ کیا۔ مقتولہ نے بڑا اچھا

بھی ملے ہیں جو مردانہ جوتے کے ہیں۔
 ”یہ کھرے بھی مندر کی طرف جا رہے ہیں۔“
 کھوجی نے بتایا۔ ”اس سے مقتولہ ملنے آئی ہوگی اور دوسرا
 قاتل ہے جس کے کھرے کنویں کی طرف جا رہے ہیں۔
 آئیے، اندر چلتے ہیں۔“

ہم دونوں کھروں کے تعاقب میں مندر کے اندر
 چلے گئے۔ اندر کا ماحول خاصا ڈراؤنا تھا۔ سامنے ہی کالی
 دیوی کی سورتی کھڑی تھی جس کے کئی ہاتھ تھے۔ ایک
 ہاتھ میں انسانی کھوپڑی، دوسرے میں کٹار نظر آ رہی تھی۔
 اس کی آنکھیں سرخ اور لمبی زبان باہر نکلی ہوئی تھی اور
 ہونٹ خون آلود ہندو دھرم میں کالی دیوی کو قہر اور انتقام
 کی دیوی خیال کیا جاتا ہے۔

کالی کے بت کے آگے ایک ہموار چوترہ بنا ہوا
 تھا۔ یہاں چوڑیوں کے ٹکڑے بڑے نظر آ رہے تھے اور
 ایک طرف زنانہ جوتی پڑی ہوئی تھی۔ دونوں پاؤں ادھر
 ادھر بے ترتیبی سے پڑے تھے۔

”دونوں اس چوترے پر بیٹھے تھے“ کھوجی نے
 کہنا شروع کیا۔ ”لگتا ہے یہاں مقتولہ کے ساتھ زبردستی
 کی کوشش کی گئی جس سے اس کی چوڑیاں نوٹ گئیں پھر
 یہاں بے لڑکی اپنے قدموں پر واپس نہیں گئی کیونکہ یہاں
 سے لڑکی کی واپسی کے کھرے نہیں ہیں۔“

کھوجی نے جو نقشہ کھینچا تھا وہ میرے قیاس کے
 عین مطابق تھا۔ چوڑیوں کے ٹکڑے اور جوتی کی بے
 ترتیبی وہی کہانی سنار ہے تھے جو کھوجی نے بیان کی تھی۔
 جہاں زبردستی ہو وہاں چوڑیاں نوٹ جاتی ہیں اور اگر کوئی
 اپنی مرضی سے جوتی اتارے تو دونوں پاؤں ساتھ ساتھ
 رکھتا ہے۔ میں نے چوڑیوں کے ٹکڑے اکٹھے کر کے
 رد مال میں لپیٹ کر جیب میں ڈال لئے اور کھوجی نے
 جوتی اٹھالی۔

”قاتل نے یہاں لڑکی کو اپنے کندھوں پر لا دلیا۔“

کہیں اور قتل کیا گیا ہے اور قاتل لاش کو کندھے پر لا دکر
 یہاں تک لایا۔ تھوڑے فاصلے تک اس نے لاش کھینچی اور
 کنویں میں ڈھیل دی۔

”میں نے خامی دور تک قاتل کا کھرا اٹھایا ہے۔“
 کھوجی نے کہا۔ ”میں نے ایک خاص بات نوٹ کی ہے
 کہ قاتل کی دائیں ٹانگ بائیں سے کمزور ہے اس لئے وہ
 بائیں ٹانگ پر زیادہ وزن ڈالتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ
 کھرے کو غور سے دیکھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ دائیں
 طرف کے جوتے کے ٹکڑے کے اگلی طرف چڑے کا ٹکڑا
 لگا ہوا ہے۔ غالباً جوتے کا ٹکڑا وہاں سے گھس گیا ہوگا اور
 موچی نے چڑے کا ٹکڑا لگا کر برابر کر دیا۔ آپ ذرا
 میرے ساتھ آئیں“ کھوجی نے کہا اور ایک طرف چل
 پڑا۔

میں کھوجی کی رہنمائی میں اس کے ساتھ چل پڑا۔
 کنویں سے تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر ایک شکستہ
 حال مندر کی عمارت تھی جو استعمال نہیں ہوا تھا۔ اس کی
 صرف چھت سلامت تھی اور خستہ حال دیواریں کھڑے
 والی تھیں جبکہ بیرونی دیواریں جانے کب کی گر چکی تھیں۔
 ”یہ دیکھیں جناب!“ اس نے زمین کی طرف
 اشارہ کرتے کہا۔ ”یہاں مقتولہ کے قدموں کے نشان ہیں
 جو گاؤں کی طرف بے آ رہے ہیں۔“ پھر وہ دس بارہ قدم
 بائیں طرف گیا اور پھر نشانیں کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ”یہ
 قاتل کے قدموں کے نشان ہیں۔ یہ بھی گاؤں کی طرف
 سے آیا ہے۔ یہ دونوں نشان مندر کے اندر تک جا رہے
 ہیں۔“

میں نے نیچے بیٹھ کر غور سے دیکھا تو کھوجی کی بات
 ٹھیک لگی۔ وہاں زمین بچی تھی اور قدموں کے نشان بڑے
 صاف نظر آ رہے تھے۔ زنانہ جوتی اور مردانہ جوتے بالکل
 واضح تھے۔ پھر کھوجی مجھے ایک طرف لے گیا اور زمین کی
 طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہاں ایک اور قسم کے کھرے

سے الفاظ بول رہا تھا اور کافی غصے میں لگ رہا تھا۔ پھر وہ مقتولہ کی لاش کے پاس جا کر بیٹھ گیا اور اس کے چہرے پر ہاتھ بھیر بھیر کر رونے لگا، ساتھ ساتھ وہ کچھ کہتا بھی جا رہا تھا جس کی سمجھ مجھے نہیں آ رہی تھی لیکن صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اپنی بیوی کی موت پر غم و غصے کا اظہار کر رہا ہے۔ اسے کسی طرح پتہ چل گیا تھا کہ اس کی بیوی مر گئی ہے۔

جب میرے کہنے پر لاش کو پوسٹارٹم کے لئے لے جایا جانے لگا تو اس جھلے نے جس کا نام مجھے بھوانی داس بتایا کیا تھا، اس نے لاش والی چارپائی کو اٹھانے والے لوگوں سے لڑنا شروع کر دیا۔ اس کی ماں اور چنڈت شکر نے اسے سنبھالنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ کسی کے قابو نہیں آ رہا تھا۔ چنڈت اور اس کی بیوی اپنے جھلے بیٹے کی باتیں سمجھ لیتے تھے اور وہ اس کو سمجھا رہے تھے کہ اس کی بیوی کو ہسپتال لے جا رہے ہیں جہاں ڈاکٹر اسے ٹھیک کر دے گا۔

تھک آ کر چنڈت نے میری طرف اشارہ کر کے بھوانی سے کچھ کہا تو وہ میری طرف خوف زدہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ پھر وہ میری طرف آیا اور ہاتھ جوڑ کر کچھ کہنے لگا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ لاش کی طرف اشارے بھی کر رہا تھا۔ پھر وہ اپنے ہاتھوں سے اپنا گلادبا کر مجھے سمجھانے لگا کہ اس کی بیوی کو گلا گھونٹ کر مارا گیا ہے۔ پھر وہ رونے لگا۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے دلاسا دیا۔ اتنی دیر میں چنڈت دیال شکر نے اس کو پکڑا اور ایک طرف لے گیا۔

میں نے اپنے دو کانشیلوں سے کہا کہ وہ لاش کو پوسٹارٹم کے لئے سرکاری ہسپتال لے جائیں۔ انہوں نے روتے دھوتے لواحقین کو پیچھے ہٹا کر لاش والی چارپائی کو تیل گاڑی پر رکھا اور وہاں سے لے گئے۔

لاش کو بھجوانے کے بعد میں نے اپنی تفتیش کا آغاز کرنا تھا۔ انگریز افسروں نے تھانیداروں کو کہہ رکھا تھا کہ

کھوجی نے کھرے اٹھاتے ہوئے باہر آ کر کہا۔ ”دیکھیں، اب اس کے قدموں کے نشان گھر سے پڑ رہے ہیں۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے بوجھ اٹھا رکھا ہے۔“ کچھ دور جا کر ایک جگہ رک کر کھوجی نے کہا۔ ”یہاں قاتل نے لاش کو کندھوں سے اتار کر زمین پر رکھا اور تازہ دم ہوا۔ یہ نشان دیکھیں، اس نے لاش گھسیٹ کر پھر کندھوں پر اٹھائی اور کتوں سے کچھ پہلے ایک مرتبہ پھر زمین پر رکھی اور پھر اس نے لاش اٹھانے کی بجائے گھسیٹ کر کتوں میں پھینک دی اور واپس اسی طرف چلا گیا جدھر سے آیا تھا۔“

آپ حیران ہوں گے ایک آن پڑھ کھوجی کس طرح اتنی باریک بینی سے زمین کو دیکھ کر حالات بیان کر سکتا ہے۔ یہ اپنی جگہ ایک فن ہے جو سب درنسل منتقل ہوتا خاندان میں آگے بڑھتا رہتا ہے۔ کھوجی اس سے بھی زیادہ حیران کن کارکردگی کا مظاہرہ کر سکتے تھے۔ یہ تو عام سی باتیں تھیں۔ عرب کے کھوجی دنیا بھر میں مشہور تھے۔ کھوجی تھانیداروں کی بڑی مدد کرتے تھے لیکن ایک قباحت تھی۔ عدالت ان کی گواہی نہیں مانتی تھی۔ اب کھوجی معدوم ہو گئے ہیں اور ان کی جگہ سدھائے ہوئے کتے مجرم کا سراغ لگاتے ہیں۔

میں نے کھوجی کو جانے کی اجازت دے دی اور پھر لاش کے پاس آ کر اس کی باہوں کا معائنہ کیا۔ ایک بازو میں تین اور دوسرے میں پانچ چوڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ میں نے جیب سے رو مال نکال کر چوڑیوں کے ٹکڑے مقتولہ کی چوڑیوں سے ملا کر دیکھے، وہ ان چوڑیوں سے مل رہے تھے۔

اسی دوران کسی کے اونچی آواز میں بولنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے اس طرف دیکھا تو ایک نوجوان نظر آیا جو اپنے چلنے سے ہی جھلا لگ رہا تھا۔ ایسے بچوں کو پاکستان میں ”سائیں لوک“ کہا جاتا ہے۔ وہ کچھ مہمل

اور لاش کو کنویں میں ڈال دیا۔۔۔۔۔ یہ سب اس لئے بتا رہا ہوں کہ آپ کو کسی پر شک ہے تو مجھے بتادیں۔“

میری بات سن کر پنڈت کچھ سوچنے لگا۔ پھر اس نے اس طرح سر ہلایا جیسے کسی فیصلے پر پہنچ گیا ہو۔

”ایک آدمی ہے جس پر مجھے شک ہے۔“ پنڈت نے کہا۔

”اس کا نام کمال ہے اور اس کی بڑے بازار میں بچوں کی دکان ہے۔ اس کے بارے میں کسی نے مجھے بتایا تھا کہ یہ شخص تمہاری بہو کو آتے جاتے تک کرتا ہے۔ دراصل اس نے لٹا کو شیشے میں اتار لیا تھا اور وہ اس سے چوری چھپے لئے جاتی تھی۔“

”یہ سوال میں نے پہلے بھی پوچھا تھا پنڈت جی!“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ”لیکن آپ نے صاف انکار کر دیا کہ ایسی کوئی بات آپ کے علم میں نہیں۔۔۔۔۔ اب آپ کہہ رہے ہیں کہ کمال نامی بندے پر شک ہے کہ اس نے آپ کی بہو کو شیشے میں اتار لیا تھا۔ اگر آپ مجھے گمراہ کریں گے تو میں قاتل کو نہیں پکڑ سکوں گا۔ جہاں تک بھکانے کی بات ہے تو صاف صاف کہوں گا کہ مقتولہ کو کوئی بھکا سکتا تھا۔ جس کا خاوند ایسا ہو اس کو بھکانے کے لئے کسی شہزادے کی ضرورت نہیں۔“

”براستہ ماننے کا داروغہ جی!“ پنڈت دیال شکر نے مکارانہ لہجے میں کہا۔ ”آپ مسلمان ہیں اور کمال بھی مسلمان ہے۔ میں نے اس ذمہ سے نہیں بتایا کہ آپ کو برا لگے گا۔ دوسرے وہ ذرا غنڈا بد معاش قسم کا آدمی ہے۔ ہر وقت لڑنے مرنے پر تیار رہتا ہے اسی وجہ سے میں نے کبھی اس سے پوچھنے کی جرأت نہیں کی۔ میری بہو میرے گھر میں بہت خوش تھی اور میں نے اس کو ہر طرح کا عیش و آرام دے رکھا تھا اور اس کو کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔“

”قانون سب کے لئے ایک جیسا ہے پنڈت جی!“ میں نے اس سے کہا۔ ”قانون نہ ہندو ہے نہ مسلمان نہ سکھ۔۔۔۔۔ یہ قانون انگریز سرکار کا بنایا ہوا ہے اور

ہوتی ہیں، کیا تمہارا دیوی کا بالکل اس کے حقوق پورے کرنے کی اہلیت رکھتا تھا؟“

”میں کیا کہہ سکتا ہوں حضور!“ پنڈت شکر دیال نے مکاری سے کہا۔ ”مجھے تو یہ پتہ ہے کہ دونوں میاں بیوی خوش رہتے تھے۔“

”ایک بات کان کھول کر سن لو پنڈت جی!“ میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔ ”جن عورتوں کو اپنے مرد سے خوشی نہیں ملتی وہ خوشی کے حصول کے لئے چور راستے نکال لیتی ہیں اور تمہارا پاگل بیٹا اس قاتل نہیں کہ اپنی بیوی کو خوش رکھ سکتا اس لئے تمہاری بہو نے باہر کسی سے یار اندہ لگا رکھا تھا اور اسی پکڑ میں ماری گئی ہے۔“

میری یہ بات سن کر پنڈت کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اس کا سانولا رنگ سیاہ پڑ گیا۔ میں نے دیکھا، وہ لرز رہا تھا۔

”رام رام۔۔۔۔۔ رام رام!“ اس نے کانپی آواز میں کہا۔ ”یہ ماننے کی بات نہیں ہے داروغہ جی! ضرور آپ کو غلطی لگی ہوگی یا کسی نے آپ کو بہکا یا ہے۔“

”میں کوئی بچہ نہیں ہوں پنڈت جی!“ میں نے کہا۔ ”میرا نو کام ہی بھکا ہے۔ مجھے کون بھکا سکتا ہے۔ آپ کی نظر میں کوئی ایسا بندہ ہے جو آپ کی بہو سے ملتا ہو یا اس میں دلچسپی لیتا ہو۔۔۔۔۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کی بہو خود اس جاتی ہو۔“

”نہیں داروغہ جی!“ پنڈت دیال شکر نے کہا۔ ”میں ایسی کوئی بات نہیں جانتا۔ میں دھارمک (نہی) آدمی ہوں اور گیان دھیان میں لگا رہتا ہوں۔ اگر ایسی کوئی بات تھی تو کم از کم میرے علم میں نہیں۔“

”تو پھر غور سے سن لو پنڈت جی!“ میں نے اس سے کہا۔ ”تمہاری بہو کسی آدمی سے ملنے پرانے مندر میں گئی تھی۔ وہاں اس آدمی اور مقتولہ کے قدموں کے صاف نشان ملے ہیں اور ظاہر ہوتا ہے کہ وہیں اس کو قتل کیا گیا

رشتے کے لئے وہ بڑا پریشان رہتا تھا کیونکہ جہیز کے بغیر ہندو معاشرے میں لڑکی کو بیاہنا بہت ہی مشکل ہے۔ دوسری مشکل یہ تھی کہ اس کی ماں فی بی کے مرض میں خون تھوک تھوک کر مگنی تھی۔ ایک ہی بیٹا تھا جو آوارہ ہو گیا تھا اور بری۔ سائی میں بڑ کر نشہ کرنے لگا تھا۔ رام داس کی تو بڑھاپے میں کمر ٹوٹ کر رہ گئی تھی۔ اس کے پاس جہیز کے نام پر دینے کے لئے ایک تنکا تک نہ تھا اور قرضہ الگ چڑھا ہوا تھا جو واپس کرنا اس کے لئے ناممکن ہو گیا تھا۔

اس کی اس مجبوری سے چنڈت دیال شکر نے فائدہ اٹھایا اور رام داس سے کہا کہ وہ اس کا قرضہ بھی ادا کر دے گا اور بیٹی کی شادی کے لئے اس کو نقد پیسے بھی دے گا۔ اگر وہ اپنی بیٹی کی شادی اس کے بیٹے بھوانی سے کر دے۔ رام داس کو اس بات کا علم تھا کہ چنڈت کا بیٹا بھوانی دماغی لحاظ سے تارل نہیں ہے لیکن وہ بہت ہی مجبور تھا۔ اس نے اپنی بیٹی کی منت سماجت کی کہ وہ اس شادی پر مان جائے۔ لڑکی سمجھتا رہی اس نے اپنے مجبور اور بے کس باپ کی خاطر خود کو بھینٹ چڑھا دیا۔

میں نے رام داس کو رسمی طور پر اس کی بیٹی کو موت پر دلا سہ دیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ اسے کسی دلا سے کی ضرورت نہیں ہے اور بیٹی کی موت پر اس نے جیسے سکھ کا جناس لیا ہے۔

”کیا تمہاری بیٹی اپنے سسرال میں خوش تھی؟“ میں نے رام داس سے پوچھا۔

”ایک پاگل کے ساتھ کوئی عورت خوش رہ سکتی ہے تو وہ خوش تھی۔“ رام داس نے دیکھی لہجے میں کہا۔

”تمہیں پتا تھا کہ بھوانی پاگل ہے۔“ میں نے کہا۔

”تم نے پھر بھی بیٹی کی شادی اس کے ساتھ کر دی۔“ میں نے اس کی شادی ایک پاگل کے ساتھ نہیں کی تھی سرکار!“ رام داس نے کہا۔ ”میں نے اس کی شادی اپنی مجبور یوں کے ساتھ کر دی تھی اور وہ اتنی فرماں بردار

گورے خود بھی اس پر عمل کرتے ہیں اور دوسروں سے بھی کراتے ہیں۔ باقی جہاں تک یہ بات ہے کہ آپ نے بہو کو ہر طرح کا پیش و آرام دے رکھا تھا، ٹھیک ہو گی لیکن آپ کو یہ بھی معلوم ہو گا کہ عورت کو اگر شوہر کا پیار ملے تو وہ دال چٹنی کھا کر بھی خوش رہ سکتی ہے لیکن اگر کسی عورت کا شوہر آپ کے بیٹے جیسا ہو تو اس کو نرم بچھونے بھی کانٹوں کا بستر لگتے ہیں۔ آپ نے اس غریب لڑکی پر بڑا ظلم کیا کہ اس کے بچے اپنا پاگل بیٹا باندھ دیا۔“

”ہونی کو کون روک سکتا ہے داروغہ جی!“ چنڈت شکر دیال نے شرمندہ سے لہجے میں کہا۔ ”میرا خیال تھا کہ شادی کے بعد میرا بھوانی ٹھیک ہو جائے گا لیکن بھگوان کو یہی منظور تھا تو میں کیا کر سکتا ہوں۔“

مجھے اب اس موئے چنڈت پر غصہ آنے لگا تھا اور میرا دل چاہ رہا تھا کہ اس کی ایسی طبیعت صاف ر دوں کہ عقل ٹھکانے آ جائے مگر پھر یہ سوچ کر خود پر قابو پالیا کہ یہ ہندوؤں کو بھڑکانے کا اور بات کو غلط رنگ دے کر اسے اپنے دھرم میں مداخلت قرار دے کر فساد کھڑا کر سکتا تھا۔

میں نے اس سے کچھ اور باتیں پوچھ کر اس کو جاننے کی اجازت دے دی۔

مقتولہ کی پسند کا مرد

اس کے بعد میں نے مقتولہ کے باپ کو بلا لیا۔ اس کا نام رام داس تھا۔ اس کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ اس نے اپنی اچھی بھلی لڑکی کو ایک پاگل کے ساتھ کیوں بیاہ دیا تھا۔ اس لباس کے علاوہ اس کے ایک ایک بے عورت اور مایوسی فلک رہی تھی۔ وہ لا چاری اور مجبوری کی منہ بولی تصویر تھا۔

نمبر دار نے مجھے بتایا تھا کہ مقتولہ کا باپ رام داس موہتی ہے۔ اس کی تین بیٹیاں تھیں۔ دو کی اس نے مانگ تا تک کر شادی کر دی تھی جبکہ تیسری بیٹی (مقتولہ) کے

سکے۔ نمبر دار نے بتایا کہ لڑکے کی عمر پندرہ سولہ سال کے لگ بھگ ہے اور نشے کی لت نے اس کو کھوکھلا کر دیا ہے اور اس میں اتنا دم خم نہیں کہ وہ کسی کو قتل کر سکے۔

یہ بات میرے ذہن میں بھی تھی کہ ایک کم عمر لڑکا جو نشہ بھی کرتا ہو، کسی کو قتل نہیں کر سکتا اور پھر یہ کہ مقتولہ کی لاش کندھوں پر اٹھا کر کنویں میں ڈالنا بھی اس کے لئے ممکن نہ تھا لیکن میں اپنی عادت کے مطابق کسی معمولی سی بات اور امکان کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ غیرت کے جوش میں آ کر کروڑوں انسان کسی کو قتل کر سکتا ہے۔

اس کے بعد میں نے پنڈت دیپال شکر کی بیوی سے پوچھ چمک کی لیکن وہ کوئی کام کی بات نہ بتا سکی سوائے اس کے انہوں نے مقتولہ کو عیش و آرام سے رکھا ہوا تھا اور وہ بہت خوش تھی۔ اس نے باتوں باتوں میں بتایا کہ اس کا بیٹا ہے تو جھلا لیکن اپنی بیوی سے بہت پیار کرتا تھا اور اس کا یہ حال تھا جیسے کسی بچے کو اپنی پسند کا کھلونا مل جائے تو وہ اس کو نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتا۔

”عورت دوسری عورت کی راز دار ہوتی ہے۔“ میں نے اس سے پوچھا۔ ”تمہاری بہو نے یہ تو بتایا ہو گا کہ اس کا خاوند اذہا کی حقوق ادا کرتا ہے یا نہیں؟“

”جی، اس نے بتایا تھا۔“ اس نے مری مری آواز میں کہا۔ ”ایسی کوئی بات نہیں تھی۔“ پھر اس نے کچھ سوچ کر کہا۔ ”وہ دراصل پنڈت جی اپنے بیٹے کا علاج کر رہے تھے اور ان کو امید تھی کہ ان کا بیٹا بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔“

میں نے اب تک کی ساری صورت حال پر غور کیا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ اس دقے کا اہم ترین مشتبہ کمال ہی ہے اور اب اس کو تحقیق کی چکی میں ڈالنا ضروری ہو گیا تھا۔ میں نے نمبر دار کی پیشکش کے بجائے اس کو تھانے بلانے کا فیصلہ کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ تھانے کی اپنی ایک الگ دہشت ہوتی ہے اور ملزم مرعوب ہو جاتا ہے میں وہاں سے تھانے آ گیا اور ایک کاسٹل کی ڈیوٹی لگا دی کہ

”پنڈت جی کا کہنا ہے کہ مقتولہ کا کردار ٹھیک نہیں تھا۔“ میں نے کہا۔ ”وہ ایک مسلمان دکاندار کمال سے چوری چھپے ملنے جاتی تھی۔ کیا یہ بات درست ہے؟“

”وہ بد نصیب مر گئی ہے۔“ رام داس نے کہا۔ ”اسی لئے مجھے جھوٹ بول کر پردے ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ یہ بار میں نے بھی سنی تھی اور لوگ بھی ایسی باتیں کرتے تھے۔ میں کسی کی زبان نہیں پکڑ سکتا تھا۔ سچی بات یہ ہے کہ میں نے ایک روز بیٹی سے بات کی تھی کہ لوگ اس متعلق اس طرح کی باتیں کرتے ہیں تو اس نے صاف صاف مجھے کہہ دیا کہ میں نے آپ کی ساری پریشانی دور کر دی ہے اور قرضہ بھی اتر گیا ہے۔ آپ کی ذمہ داری ختم ہو گئی ہے۔ میں ایک پاگل کے ساتھ ساری عمر اپنی جوانی برباد نہیں کر سکتی۔ کمال مجھے اچھا لگتا ہے اور دوسری پسند کا مرد ہے۔“

رام داس کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ مقتولہ نے باپ کی خاطر ایک پاگل سے شادی کر کے قربانی دے دی تھی لیکن بعد میں انسانی فطرت کے تقاضوں کو دباتی اور اس کی تکمیل کے لئے غلط راہوں پر چل پڑی تھی۔ اس طرح بھی کہا جاسکتا ہے کہ وہ باغی ہو گئی تھی اور اس نے انتقامی رو بہ اپنا لیا تھا۔

”کیا ان باتوں کا علم تمہارے بیٹے کو بھی تھا؟“ میں نے ایک خیال کے تحت پوچھا۔

”جی ہاں!“ رام داس نے کہا۔

”اس نے اپنی بہن سے کچھ نہیں کہا؟“

”وہ تو مرنے مارنے پر اتر گیا تھا حضور!“ رام داس نے بتایا۔ ”بے توپا نشہ باز لیکن آخر جوان خون ہے۔“

میں نے رام داس سے کچھ اور باتیں پوچھ کر اسے بھیج دیا اور نمبر دار کو بلا لیا۔ میں نے اس سے رام داس کے بیٹے کے متعلق معلومات حاصل کیں کہ اس کی عمر کتنی ہے اور کیا وہ اتنی ہمت اور جرأت رکھتا ہے کہ کسی کو قتل کر

مجھے میں کپڑے یا کسی اور چیز کے پھندے کا نشان صاف ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر نے لکھا تھا کہ مقتول قتل سے پہلے جنسی عمل سے گزری ہے اور وہ تین ماہ کے حمل سے تھی۔ قتل کا وقت اندازاً رات آٹھ اور نو بجے کے درمیان لکھا گیا تھا۔

میں نے شام نے چھ بجے کے قریب اسی کانشیل کو دوبارہ بھیجا کہ وہ کمال ڈکاندار کو تھانے میں حاضر کرے۔ کانشیل چلا گیا اور آدھے گھنٹے بعد آ کر اس نے بتایا کہ وہ کمال کو لے آیا ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ کمال کو پیش کرے۔

کمال اندر آیا۔ وہ اچھے قد کا ٹھہ اور چہرے مہرے کا جوان تھا۔ اس کا رنگ گندی تھا مگر چہرے کے نقش و نگار جاذب نظر تھے۔ میں نے اسے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھنے کو کہا تو وہ آگے آ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اسے چلتے دیکھ کر میں چونک گیا۔ اتنا اچھا جوان چلتے وقت بائیں طرف

وہ کمال دکاندار کو تھانے حاضر کرے۔ اس کانشیل نے آدھے گھنٹے بعد آ کر بتایا کہ کمال ڈکان کے لئے سامان لئے شہر گیا ہے اور شام تک واپس آ جائے گا۔

مندرمیں رنگ رلیاں

تھانے آ کر میں نے پہلے کاغذوں کا پیٹ بھرا اور پھر کچھ دیر آرام کیا۔ مجھے پوسٹ مارٹم رپورٹ کا بھی انتظار تھا جس سے مقتول کے کردار کا تعین کرنے میں آسانی ہو جاتی کہ وہ کمال کے ساتھ ناجائز تعلقات میں کس حد تک آگے جا چکی تھی کیونکہ اس کی ساس نے اعتراف کر لیا تھا کہ اس کا بھلا بیٹا ازدواجی حقوق ادا کرنے کے قابل نہیں تھا۔

سہ پہر کے وقت مقتول کی پوسٹ مارٹم رپورٹ آ گئی۔ ڈاکٹر نے موت کی وجہ سانس رک جانا بتائی تھی اور لکھا تھا کہ مقتول کو گلا گھونٹ کر قتل کیا گیا ہے۔ اس کے

R.T.M NO 373738



Moulded Furniture



RELAXO

ہر دل چاہیے

یونائیٹڈ (جنرل) پلاسٹک فرنیچر

کلائمکس آباد جی ٹی روڈ گوجرانوالہ

فون: 055-3857636

”یہ اس کی خواہش ہوتی تھی۔“ اس نے : را
شریلے انداز میں کہا۔ ”وہ کہتی تھی کہ کہیں تنہائی میں ملو۔“
”اور تم اس کی خواہش پوری کرتے تھے۔“ میں
نے طنز یہ لہجہ میں کہا۔ ”تمہاری کوئی مرضی نہیں ہوتی
تھی۔“

”میں اس انکار نہیں کرتا تھا جناب!“ اس نے گھبرا
کر کہا۔ ”اگر میں انکار کرتا تو وہ رونے لگتی تھی اور کہتی تھی
کہ تمہارے بغیر میں مر جاؤں گی۔“

”تم نے پھر خوب بہتی گنگا میں ہاتھ دھوئے۔“
میں نے اسے سختی خیز نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔
”بلکہ گنگا میں نہاتے بھی رہے۔“

”ایسی کوئی بات نہیں تھی جناب!“ کمال نے کہا۔
”ہم سچا پیار کرتے تھے اور ہماری محبت ناک تھی۔“

”تو اس مت کرو۔“ میں نے ابا تک لہجہ سخت کر
لیا۔ ”تم یہ پاک محبت کا ذرا اندر میرے سامنے نہ کرو، میں
نے ایسے ذرا سے بہت دیکھے ہیں۔ کیا تم نہیں جانتے
وہ ہندو تھی اور شادی شدہ بھی تھی۔ تم اس کے ساتھ کالی
کے مندر میں موج مستی کرتے رہے اور جب دل بھر گیا تو
اس سے جان چھڑائی۔“

میری یہ بات سن کر وہ تڑپ اٹھا اور قسمیں کھا کھا
کراہتی بے گناہی کا یقین دلانے لگا۔ اس نے یہ اعتراف
کر لیا کہ ان کے تعلقات ویسے ہی تھے جیسے ایک غیر
عورت مرد کے تنہائی میں ہو سکتے ہیں اور وہ تمام حدیں پار
کر گئے تھے۔ اس نے اس بات کا اعتراف بھی کر لیا کہ وہ
مقتولہ کے ساتھ کالی دیوی کے مندر میں چوری چھپے
لگا تھے کرتا تھا۔

”لیکن میں نے اسے قتل نہیں کیا۔“ کمال نے آخر
میں کہا۔ ”میں اسے کیوں قتل کرتا، اس نے میرا کیا بگاڑا
تھا؟“

”اس لئے کہ وہ تمہارے بچے کی ماں بننے والی

معمولی سا جھلکا تھا جو غور کرنے پر ہی محسوس ہوتا تھا۔ مجھے
یاد آ گیا کہ کھوجی نے کھرے دیکھ کر بتایا تھا کہ جس شخص
کے یہ کھرے ہیں وہ بائیں پاؤں پر زیادہ وزن ڈال کر
چلتا ہے۔ اس کی چال میں یہ نقص نہایت معمولی سا تھا اور
غور سے دیکھنے پر ہی محسوس ہوتا تھا۔ میں نے اس سے
پوچھا کہ اس کی ٹانگ میں کوئی پیدائشی نقص ہے یا کسی
حادثے کی وجہ سے ایسا ہے۔ اس نے خاصا حیران ہو کر
میری طرف دیکھا کہ میں نے اسے کیا بات پوچھنے کے
لئے تھا نے بلایا ہے۔ پھر اس نے بتایا کہ چند سال پہلے
ایک درخت سے گر کر اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی جو ایک
جراح کے علاج سے ٹھیک ہوئی تھی لیکن اس میں نہایت
معمولی سا فرق آ گیا جو غور کرنے پر محسوس ہوتا تھا۔

”تم جانتے ہو میں نے تمہیں کیوں بلایا ہے؟“
میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔
”آپ مائی باپ ہیں حضور!“ اس نے عاجزی
سے کہا۔ ”آپ بہتر جانتے ہیں۔“

”مقتولہ دیال شکر کی بہو قتل ہو گئی ہے۔“ میں نے
کہا۔ ”تمہیں اس کا پتہ ہی ہوگا۔“
”پورے قصبے میں یہ خبر پھیل گئی ہے۔“ اس نے
کہا۔ ”میں نے بھی سنی ہے۔ لیکن میرا اس سے کیا
واسطہ؟“

”تمہارا تو خاص تعلق واسطہ ہے“ میں نے کہا۔
”جس طرح لڑکے قتل کی خبر سب کی زبان پر ہے، اسی
طرح پورے قصبے میں تمہاری اور لڑکی دوستی کے حوالے
بھی ہیں۔ کیا یہ بات غلط ہے؟“

”وہ خواہ خواہ میرے پیچھے پڑی رہتی تھی۔“ کمال
نے ذرا سنبھل کر کہا۔ ”میں بھی اس سے ہنس بول لیتا
تھا۔“

”اور وہ جو تم اس سے چپ چپ کر ملتا تھا
کرتے تھے؟“ میں نے اس پر سیدھا حملہ کیا۔

”تم اتنا گھبرا کیوں گئے ہو کمال!“ میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ”تم مسلمان ہو اور میں بھی مسلمان ہوں، قتل ہونے والی ایک ہندو ہے۔ مجھے اس سے نہیں تم سے ہمدردی ہے۔ تم سب کچھ مجھے بتا دو، میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں صاف بھالوں گا۔“

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھتا رہا مگر بولا کچھ نہیں۔ اس کے ہونٹ ہلے مگر آواز نہ نکلی۔ میں نے اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا کہ وہ ساری بات کہہ دے میں سننا لوں گا۔

”مم۔۔۔ میں نے اسے نہیں مارا۔“ اس نے بڑی مشکل سے الفاظ کو باہر دھکیلا۔

”اچھی طرح سوچ لو۔“ میں نے اسے ڈراتے ہوئے کہا۔ ”ابھی موقع ہے۔ ورنہ میرے پاس ثبوت اور شہادت موجود ہے اگر میں نے حوثات کر دیا تو پھر کسی رعایت کی امید نہ رکھنا۔ پھر میں تمہاری کھال اتار کر بھی اقبالی بیان لے لوں گا۔“

وہ مزید خوفزدہ ہو گیا اور اس کے آنسو نکل آئے۔

”آپ میری بات کا یقین کیوں نہیں کرتے؟“ اس نے بے چارگی سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”اس لئے کہ تمام شواہد تمہارے خلاف ہیں۔“ میں نے اسے کہا۔ ”اور تمہارے پاس قتل کی وجہ بھی موجود ہے۔“

”آپ بے شک میری کھال اتار دیں۔“ اس نے ذرا سنبھل کر بڑے پختہ لہجے میں کہا۔ ”میں یہی کہوں گا کہ میں نے تم کو نہیں مارا۔“

مجھے اس سے ایسی دلیری کی امید نہیں تھی۔ چند لمحے پہلے وہ آنسو بہا رہا تھا اور کہا یہ کہ دیدہ دلیری سے جرم سے انکار کر رہا تھا۔

”قتل والی رات تم مقتولہ سے ملے مندر گئے تھے؟“ میں نے اس سے پوچھا۔ ”پہلے تم نے اس کے

تھی۔“ میں نے گویا اس کے سر پر بم دھماکا کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں، یہ غلط ہے۔“ اس نے تقریباً رو دینے والی آواز میں کہا۔ ”اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ وہ ماں بننے والی تھی۔“

”ثبوت یہ ہے۔“ میں پوسٹ مارٹم رپورٹ اس کے آگے پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ مقتولہ کی پوسٹ مارٹم رپورٹ ہے اور پوسٹ مارٹم کرنے والے ڈاکٹر نے لکھا ہے کہ مقتولہ تین ماہ کے حمل سے تھی۔ اب کیا کہو گے؟“

”تم نے مجھے کچھ نہیں بتایا تھا۔“ کمال نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”مگر مجھے اس بات کا علم تھا بھی تو پھر بھی مجھے اس کو قتل کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“

”یہ بات مجھی تو نہیں دینی تھی“ میں نے کہا۔

”مزید ایک دو ماہ بعد مقتولہ کی جسمانی حالت سے سب کو پتہ لگ جاتا تھا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ سب کو اس بات کا

علم ہے کہ لڑکا کا پگلا خاندان از روایتی حقوق ادا کرنے کے قابل نہیں ہے۔ خود اس کی ماں نے مجھے یہ بات بتائی

ہے۔ اب تم خود ہی سوچو کہ ایسی صورت میں ہر ایک کی زبان پر تمہارا ہی نام ہوتا تھا۔ ہندوؤں نے اس بات پر مشتعل ہو جاتا تھا اور ہندو مسلم فساد ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو جاتا۔ تم نے یہی مناسب سمجھا کہ اس سے پہلے کہ معاملہ مکمل جائے، اس کو ہمیشہ کے لئے شمع کر دیا جائے۔“

اس کے اچھے بھلے سرخ و سفید پہرے کا رنگ یک دم پیلا پڑ گیا۔ اس نے کچھ بولنے کی کوشش کی لیکن محض تھوک نکل کر رہ گیا۔ میں اس کی خراب ہوتی حالت کو دیکھ

سے دیکھ رہا تھا۔ قتل کر لینا آسان ہوتا ہے لیکن انسانی خون ہضم کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ تعزیرات پاکستان میں قتل پر دفعہ 302 لگتی ہے۔ اس کے بارے میں مشہور

ہے کہ دفعہ 302 لکھ کر کسی ہرے بھرے درخت سے باندھ دو تو وہ بھی سوکھ جاتا ہے۔

کے لوگوں سے پڑتا رہتا ہے اور ان کو تجربہ ہو جاتا ہے کہ کون سچ بول رہا ہے اور کون چکر دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ میرا اندازہ تھا کہ کمال مجھے چکر دینے کی کوشش نہیں کر رہا۔

”کیا پہلے بھی کبھی ایسا ہوا کہ تپا پہلے پہنچ گئی ہو اور تمہیں دیر ہو گئی؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں جناب!“ اس نے کہا۔ ”ہمیشہ میں پہلے پہنچ کر دیا روشن کر دیتا تھا۔ یہ پہلی مرتبہ ہوا کہ مجھے دیر ہو گئی۔“

”تمہیں اس روز دیر کیوں ہوئی تھی؟“ میں نے پوچھا۔

”میرے باپ کو بھینس نے سینک مار دیا تھا۔“ اس نے بتایا۔ ”میں ان کے لئے جراح کو بلا کر لایا تھا۔ اس کے بعد میں نے ان کی جلیبوں پر جراح کے دیئے ہوئے تیل کی ماش کی اور پھر گور کرتے ہوئے دیر ہو گئی، عام حالات میں ہم اتنا وقت گزار کے واپس آ جاتے تھے۔“

وہ جسے ”وقت گزارنا“ کہہ رہا تھا، دراصل وہ تپا کے ساتھ رنگ رلیاں منانے جاتا تھا۔ میں نے اپنے طریقے کے مطابق اس سے تمہا پھر کر اسے سوال پوچھے کہ وہ پریشان نہ ہو۔ اب جواب دیتے اس کی زبان لڑکھڑانے لگی تھی لیکن پھر بھی اس کے منہ سے ایسی کوئی بات نہ اگھوا سکا جو اس کے خلاف شک مضبوط کرتی ہو۔ کبھی مجھے بھی خیال آتا کہ واقعی اس نے تپا کو قتل نہیں کیا لیکن ابھی وہ میرا مشتبه نمبر ایک تھا۔

”میں تھوڑی دیر کے لئے تمہارا بیان سچ مان لیتا ہوں۔“ میں نے ایک خیال کے تحت اس سے کہا۔

”غریب کی بنی کو تم جیسے لوگ کئی پتنگ سمجھ کر لوٹنے کی کوشش کرتے ہو۔ کیا تم کسی ایسے بندے کے متعلق بتا سکتے ہو جو تمہاری طرح تپا کا طلبگار ہو اور تپا نے اسے ٹھکرا

ساتھ رنگ رلیاں منائیں اور پھر اس کا دوپٹہ اس کے گلے میں ڈال کر گھٹا گھونٹ کر مار ڈالا۔ اس کے بعد تم نے اس کی لاش کو کندھے پر اٹھایا اور پرانے کنویں میں ڈال کر گھر آ گئے۔“

”یہ بات غلط ہے تمہارا صاحب!“ اس نے تڑپتے ہوئے کہا۔ ”آپ میری بات کا یقین کریں، قتل والی رات میں تپا سے ملنے ضرور گیا تھا مگر وہ مجھے وہاں نہیں ملی تھی لیکن وہ آئی ضرور تھی۔“

”تم نے وہاں کوئی خاص بات دیکھی؟“ میں نے اس سے پوچھا۔ ”تمہیں کیسے اندازہ ہوا کہ تپا آئی تھی؟“

”دیوی کے جرنوں میں رکھا دیا جل رہا تھا۔“ اس نے کہا۔ ”ہم نے مندر کی دیوار کے ایک سوراخ میں ماچس چھپا رکھی تھی۔ ہم میں سے جو پہلے آ جاتا وہ ماچس نکال کر دیا جلا دیتا تھا۔ اس شام بھی ہم نے ملاقات کے وقت ملے کر رکھا تھا لیکن مجھے مندر پہنچنے میں پچھو رہی ہو گئی۔ میں جب مندر کے قریب پہنچا تو دور سے دیکھے کی روشنی دیکھ کر سمجھ گیا کہ تپا وہاں موجود ہے لیکن جب میں مندر

میں داخل ہوا تو مجھے تپا وہاں نظر نہ آئی۔ دیے کی روشنی میں مجھے نظر آیا کہ تپا کی جوتی وہاں پڑی ہوئی تھی اور کچھ چوڑیوں کے ٹکڑے فرش پر پڑے نظر آ رہے تھے۔ مجھے خیال گزرا کہ ضرور تپا کے ساتھ کوئی حادثہ ہو گیا ہے۔ میں نے اسے ادھر ادھر تلاش کیا، آوازیں دیں لیکن تپا کا کچھ پتہ نہ چلا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ کوئی بڑی گڑبڑ ہو چکی ہے اور میں بھی اس کی لپیٹ میں آ سکتا ہوں۔ یہی سوچ کر میں چپکے سے واپس آ گیا۔ پھر اگلے دن یہ خبر پھیل گئی کہ پنڈت کی بہو کی لاش کنویں سے ملی ہے۔“

میں نے کمال کا بیان بڑی توجہ اور غور سے سنا تھا۔ اس میں بہ ظاہر کوئی سقم محسوس نہیں ہو رہا تھا پھر میں نے اپنی کھوجی نظریں اس کے چہرے پر گاڑ دیں۔ مجھے وہاں اطمینان اور سچائی نظر آئی۔ پولیس والوں کا واسطہ ہر قسم

کے اس نوجوان کو تھانے لے آئے۔ اگر وہ کوئی مزاحمت کرے تو زبردستی لے کر آئے۔ میں نے کمال سے اندر کمار کا اتنے پتہ پوچھ کر کانشیل کو سمجھا دیا۔ کانشیل چلا گیا تو میں نے ہیڈ کانشیل کو بلا کر کہا کہ وہ کمال کو حوالات میں بند کر دے۔ کمال نے خاصا احتجاج کیا لیکن میں نے اس کی کوئی بات نہ سنی۔ میں اسے ڈھیل نہیں دینا چاہتا تھا۔ اب رات ہو رہی تھی اور میں خاصا تھک گیا تھا اس لئے میں نے بہتر سمجھا کہ آرام کر لوں۔ میں نے حمر سے کہا کہ میں تھوڑی دیر کے لئے سونے لگا ہوں۔ اس دوران کانشیل اندر کمار کو لے آئے تو مجھے جگانے کی ضرورت نہیں۔ میں خود ہی جب انھوں کا تو اندر کمار سے پوچھ گچھ کر لوں گا۔

عاشق نامراد

میں چونکہ آرام کے بغیر مسلسل کام میں لگا ہوا تھا اس لئے لیٹتے ہی میری آنکھ لگ گئی۔ ایک بدترین نیند لے کر اٹھا تو تازہ دم ہو چکا تھا۔ صبح ہو رہی تھی۔ میں نے کانشیل کو بلایا اور اس سے اندر کمار کے بارے میں پوچھا تو کانشیل نے بتایا کہ وہ تھانے میں حاضر ہے۔ میں نے اسے بلانے کو کہا تو کانشیل نے بتایا کہ جب وہ اندر کمار کو تھانے لے کر آیا تھا تو تھوڑی دیر بعد ہی اس کا باب دو تین محلے داروں کے ساتھ تھانے آ گیا تھا۔ اب وہ لوگ مجھ سے ملنے کے لئے انتظار کر رہے تھے۔ میں نے کانشیل سے کہا کہ وہ پہلے ان لوگوں کو بھیج دے، اندر کمار سے میں بعد میں پوچھ گچھ کروں گا۔ اندر کمار ساری رات تھانے کے بیچ پر بیٹھا رہا تھا۔

کچھ دیر بعد تین ہندو میرے پاس آ گئے۔ میں نے ان کو بٹھایا۔ وہ لباس اور حلے درمیانے طبقے کے لوگ نظر آ رہے تھے۔ اندر کمار کا باپ بڑا پریشان نظر آ رہا تھا۔ میں

دیا ہوا اور اس نے موقع پا کر اس طرح بدلہ لیا ہوا؟“ میرے ذہن میں مندر میں دیکھے جانے والے دوسرے کمرے آ گئے اور میں نے اسی خیال کے تحت یہ سوال پوچھا تھا۔ ”پہلے پہل دو ہندو لڑکوں نے لٹا کو تنگ کیا تھا۔“ کمال نے بتایا۔ ”لیکن جب لٹا نے مجھے بتایا تو میں نے ایک کواچی خاصی پھینٹی لگائی اور دوسرا محض دھمکانے پر ہی پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے بعد کسی میں اتنی جرأت نہیں ہوئی کہ لٹا کو تنگ کرے۔۔۔۔۔۔ یہ ہندو ویسے بھی گیدڑ ہوتے ہیں جناب!“

”اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندو بزدل ہوتا ہے۔“ میں نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن یہ جتنا بزدل ہوتا ہے اتنا ہی سازشی اور مکار ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے لٹا کے ان دونوں عاشقوں نے تم دونوں پر نظر رکھی ہو اور ان میں سے کسی نے موقع سے فائدہ اٹھا کر تمہیں پھسانے کے لئے تم سے پہلے ہی یہاں پہنچ کر لٹا کو قابو کر لیا ہو اور بعد میں اسے قتل کر کے لاش کنویں میں پھینک دی۔۔۔۔۔۔ تم غور کر کے بتاؤ کہ ان دونوں ہندو لڑکوں میں سے کوئی اتنی جرأت رکھتا ہے کہ اتنا بڑا کام کر سکے؟“ میری بات سن کر کمال سوچ میں پڑ گیا اور پھر مجھے کسی فیصلے پر پہنچ کر شاباش میں سر ہلانے لگا۔ ”ان میں سے ایک تو بالکل چوہا لٹکا تھا۔“ اس نے کہا۔ ”لیکن دوسرا جسے میں نے مارا تھا، وہ کچھ جرأت والا لگتا تھا۔ اس کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے کہ وہ یہ کام کر سکتا ہے۔“

”اس کا نام بتاؤ۔“ میں نے کہا۔ ”اور وہ کتنا کیا ہے؟“

”اندر کمار۔“ اس نے کہا۔ ”کام دھندا کوئی نہیں کرتا، بس آوارہ پھرتا ہے۔ کبھی کبھار جوا بھی کھیل لیتا ہے۔“

میں نے ایک کانشیل کو بلا کر کہا کہ وہ اندر کمار نام

اس کے جانے کے بعد میں نے اندر کمار کو بلا لیا۔ جب وہ کانشیل کے ساتھ اندر آیا تو خاصا سہا ہوا نظر آ رہا تھا۔ وہ بائیس تیس سال کا صحت مند نوجوان تھا۔ اس کے چہرے کی رنگت گندمی تھی لیکن خوف سے ہیلی پڑی ہوئی تھی۔ پولیس کی دہشت ان دنوں بہت زیادہ ہوتی تھی خصوصاً تھانے میں آ کر تو اچھے خاصے دل گردے والے خوف زدہ ہو جاتے تھے۔ اس کی وجہ تھی کہ پولیس اپنا کام فرض سمجھ کر کرتی تھی، اپنے کام میں ایماندار تھی اور بھر انگریزوں و غریبوں کا سخت رویہ تھا جو فرائض میں سستی اور کوتاہی رواست نہیں کرتے تھے۔ آج کی پولیس میں یہ دونوں باتیں نہیں ہیں۔

میں نے اندر کمار کو بلانے کو کہا تو وہ جھپکتے ہوئے بیٹھ گیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کیا کام کرتا ہے تو اس نے بولنے کی بجائے دائیں بائیں فی میں سر ہلا دیا۔ میں نے اس سے کچھ ادھر ادھر کی باتیں ہو گئیں۔ وہ بہت کم بولتا تھا، بس ہاں ناں میں جواب دیتا تھا۔

”تم جانتے ہو میں نے تمہیں یہاں کیوں بلایا ہے؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”نہیں“ اس نے کہا۔

”کون کوجانتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”کون؟“ اس نے انسا سوال کر دیا۔

”کمال کوجانتے ہو؟“ میں نے نیا سوال پوچھا۔

”نہیں جی!“ اس نے مری مری سی آواز میں کہا۔

مجھے اس پر غصہ آ گیا لیکن میں ضبط کر گیا۔ میں نے کانشیل کو بلا کر اسے ایک طرف لے جا کر کہا کہ اس کو حوالات کا ایک پکڑ لو الٹا اور خاص طور پر یہ وہاں بند کمال کو دیکھ لے۔ کانشیل سمجھ گیا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ اس نے اپنے بیٹے جیسے بڑے ہاتھ سے گردن کی پھیل طرف سے اس کا کالر تھکی میں لے کر اسے ایک جھٹکے سے اٹھایا اور دھکیلتا ہوا باہر لے گیا۔ دس پندرہ منٹ بعد

نے ان سے پوچھا کہ میں ان کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔

”آپ نے اندر کمار کو گرفتار کیوں کیا ہے؟“ اندر

کمار کے باپ نے پوچھا۔ ”اس نے کیا جرم کیا ہے؟“

”میں نے اسے گرفتار نہیں کیا۔“ میں نے اسے

بتایا۔ ”تا کے قتل کے کیس کے سلسلے میں اس سے کچھ

باتیں پوچھنی ہیں۔ اس کے بعد اسے چھوڑ دیں گے۔“

”اس کا قتل سے کیا تعلق واسطہ ہے؟“ باپ نے

بڑے رعب سے کہا۔ ”آپ اسے ابھی میرے ساتھ

بھیجیں، میں اسے لینے آیا ہوں۔“

”میں نے اسے پوں ہی نہیں بلایا۔“ میں نے ذرا

سخت لہجے میں کہا۔ ”میں قتل کی تفتیش کر رہا ہوں اور اس

سلسلے میں جس سے ضرورت محسوس ہوگا، اسے تھانے بلاؤں

گا۔ بہتر ہے آپ میرے کام میں مداخلت نہ کریں ورنہ

میں آپ کو سرکاری کام میں مداخلت کے جرم میں گرفتار کر

لوں گا۔ آپ لوگ پہلے اپنی جوان اولاد پر نظر نہیں رکھتے۔

جب اولاد آوارہ ہو جاتی ہے، جرائم پیشہ لوگوں میں

پھنس گئی ہے، نشہ کرنے لگتی ہے، جوا کھیلتی ہے تو پھر کسی نہ

کسی جرم میں بھی ملوث ہو جاتی ہے۔ آپ نے کبھی اپنے

بیٹے سے پوچھا ہے کہ وہ سارا دن کیا کرتا ہے، کہاں جاتا

ہے، کوئی کام دیکھتا ہے یا نہیں کرتا؟ آپ کا بیٹا ایک شادی

شدہ لڑکی کے چکر میں لڑائی جھگڑے کرتا ہے اور مار بھی کھا

چکا ہے، اب وہی لڑکی قتل ہو چکی ہے اور قتل کا شک آپ

کے بیٹے پر بھی آ رہا ہے۔ بہتر ہے تم لوگ شرافت سے گھر

جاؤ اور بیٹے کا انتظار کرو۔ میری آپ کے بیٹے سے کوئی

دشمنی نہیں ہے۔“

مجھے کچھ زیادہ ہی غصہ آ گیا تھا اس لئے اسے ٹھیک

ٹھاک سنا دیں۔ وہ بے وقوفوں کی طرح منہ کھولے مجھے

دیکھ رہا تھا۔ غالباً اپنے بیٹے کے کارنامے سن کر اسے خاصا

دھچکا لگا تھا۔ اس کے ساتھ آئے محلے داروں نے اسے

اٹھایا اور باہر لے گئے۔

”یہ غلط ہے تھانیدار صاحب!“ اندرکار نے میری بات کاٹ کر ہڈیانی لہجہ میں کہا۔ ”میں نے کچھ نہیں کیا..... میں نے لٹا کو نہیں مارا..... یہ جھوٹ ہے۔“

”پھر سچ کیا ہے“ میں نے کہا۔ ”تم بتا دو۔“

”میں نے لٹا کو قتل نہیں کیا۔“ اس نے کہا۔ ”میں سچ کہتا ہوں کہ کمال نے مجھے مارا چنانچہ تو میں ڈر گیا تھا اور میں نے لٹا کا خیال دل سے نکال دیا تھا۔“

”مگر اپنی بے عزتی کا خیال دل سے نہ نکال سکے۔“ میں نے کہا۔

”آپ یقین کریں، میں اس معاملے سے الگ ہو گیا تھا۔“ اندرکار نے کہا۔ ”میں اس دن کے بعد کبھی لٹا کے راستے میں نہیں آیا تھا۔“

”دیکھو، ابھی معاملہ میرے ہاتھ میں ہے۔“ میں نے اسے تھانیداروں کا رواجی چکر دیا۔ ”تم ساری بات مجھ بتا دو، میں تمہیں بجائے کا راستہ نکال لوں گا۔ اگر بات میرے ہاتھ سے نکل گئی تو پھر سمجھو چھانسی کا پسند استہارہی کروں میں ہوگا۔“

وہ پہلے ہی دہشت سے ادھ مڑا ہو چکا تھا، میری بات سن کر سر نہ ڈالا ہو گیا۔

”بھگوان کی سونگھ میں نے کچھ نہیں کیا۔“ اس نے کہا اور یک دم اٹھ کر میرے قدموں میں بیٹھ گیا اور میرے بوٹ پکڑ لئے۔ پھر اس کے آنسو بہنے لگے۔

میں نے اپنے پاؤں پیچھے کئے اور اس کو جھڑک کر کرسی پر بیٹھنے کے لئے کہا۔ وہ اٹھ ہی نہیں رہا تھا، بڑی مشکل سے میں نے اسے کرسی پر بٹھایا۔ پولیس والے اتنی جلدی کسی کے آنسوؤں اور قسموں پر یقین نہیں کرتے کیونکہ قسمیں تو ہر مجرم کھاتا ہے اور کوئی بھی آسانی سے اپنا جرم تسلیم نہیں کرتا لیکن اندرکار کے آنسوؤں نے مجھے متاثر کر لیا تھا۔ مجھے اس کے آنسو چھ لگ رہے تھے۔ پھر بھی میں نے اپنی تسلی کے لئے اس کے قدموں کے نشان

کا سبیل اسے اسی طرح دبوچے واپس لے آیا اور کرسی پر دھکیل دیا۔ میں نے دیکھا اندرکار کی حالت اس سلوک سے خاصی خراب ہو چکی تھی۔ بار بار ہونٹوں پر زبان پھیرتا اور تھوک نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لگتا تھا ابھی غصہ کھا کر مر پڑے گا۔

”اب یاد آ گیا ہوگا کہ لٹا اور کمال کون ہیں؟“ میں نے اس سے کہا۔

اس نے کچھ بولنے کی کوشش کی لیکن آواز نہ نکلی، اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”کمال سے کس بات پر جھگڑا ہوا تھا؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”وہ..... وہ جی اس کو جھگڑتا تھا۔“ اس نے بڑی مشکل سے جواب دیا۔

”کس کو جھگڑتا تھا؟“

”وہ جی..... لٹا کو؟“ اس نے کہا۔

”پھر تم نے کیا کیا؟“

”میں نے جی اس کو روکا تھا۔“ اس نے کہا۔ ”پھر ہماری لڑائی ہو گئی۔“

”تم نے کمال کو کیوں روکا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”لٹا سے تمہارا کیا تعلق تھا؟ تم خود بھی تو لٹا کو جھگڑتے تھے۔“

”تعلق تو کوئی نہیں تھا جی!“ اس نے کہا پھر نظریں چراتے ہوئے بولا۔ ”وہ جی..... وہ مجھے اچھی لگتی تھی۔“

”مگر تم اسے اچھے نہیں لگتے تھے۔“ میں نے کہا۔

”وہ کمال کو پسند کرتی تھی۔ اسی وجہ سے تم کمال اور لٹا کے دشمن بن گئے اور اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کا منصوبہ بنانے لگے۔ تمہیں معلوم ہو گیا کہ وہ دونوں کالی کے مندر میں چوری چھپے ملاقاتیں کرتے ہیں۔ تم موقع کے انتظار میں رہے اور پھر تم کو یہ موقع مل گیا اور تم نے کمال کے وہاں پہنچنے سے پہلے لٹا کا گھونٹ کر قتل کر دیا اور.....“

نہیں بھی کیا تھا پھر بھی اس سے اس کا تعلق بنا تھا۔ میں نے اسے واپس حوالات میں بھجوا دیا۔

عورتوں کا شکاری

اچھے دن میں تازہ دم ہو کر تھانے پہنچا تو تالا کا کیس سامنے رکھ کر نئے سرے سے اس کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے لگا۔ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ میں تفتیش کرتے وقت کوئی اہم پہلو نظر انداز کر گیا ہوں۔ جب میں نے سارے واقعات و حالات پر نظر ثانی کی تو مجھے خیال آیا کہ مجھے مقتولہ کی سہیلیوں یا اس کی مسائیوں سے پوچھ سمجھ کرنا چاہئے تھی۔ مشہور ہے کہ عورت پیٹ کی ہلکی ہوتی ہے اور زیادہ درخت کوئی بات چپا کے نہیں رکھ سکتی چاہے وہ اس کی اپنی ذات کے متعلق ہی کیوں نہ ہو۔ وہ اپنی کسی نہ کسی سہیلی کو ضرور راز دار بنا لیتی ہے۔ یہی سوچ کر میں نے مقتولہ کی سہیلیوں سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

میں نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ جوان عورتوں کو تھانے بلایا جائے۔ میں نے نمبردار کو بلا لیا اور اس سے کہا کہ میں مقتولہ کی سہیلیوں سے مقتولہ کے بارے میں کچھ معلومات لینا چاہتا ہوں اس لئے وہ اسی محلے میں کسی کے گھر میں بیٹھنے کا انتظام کر دے اور سہیلیوں کے گھر والوں سے بھی کہہ دے۔ نمبردار ایسے کاموں کو سمجھتا تھا۔ وہ اسی وقت چلا گیا اور پھر ایک گھنٹے بعد اس نے آ کر رپورٹ دی کہ مقتولہ کا محلے میں زیادہ ملنا ملنا نہیں تھا۔ جن لڑکیوں کا علم ہوا ہے جن کے ساتھ مقتولہ کی بے تکلفی والی دوستی تھی۔ نمبردار ان کو پابند کر آیا تھا کہ وہ مغرب کے بعد گھروں میں موجود رہیں۔ نمبردار نے ایک مسلمان سکول ماسٹر کے گھر میرے بیٹھنے کا انتظام کر دیا تھا۔

میں اپنے کاموں سے فارغ ہونے کے بعد شام کو نمبردار کے ساتھ پنڈت کے محلے میں چلا گیا۔ میں نے پنڈت سے ملنے کی ضرورت نہ سمجھی اور نہ ہی میں یہاں

لینے کا فیصلہ کیا۔ اس کو تھانے کے صحن میں کچی زمین پر چلایا گیا اور پھر کھوجی کو بلا کر اس سے کہا کہ وہ جائے واردات پر پائے جانے والے کھروں سے ان کھروں کا موازنہ کرے۔ کھوجی نے بغور ان کھروں کو دیکھا اور پھر انکار میں سر ہلا دیا۔ اس کے بعد میں نے کمال کو بھی حوالات سے نکلوا کر کچی زمین پر دس بارہ قدم چلنے کو کہا اور پھر کھوجی کو اس کے کھرے دکھائے۔

”یہ کھرے مندر میں آئے اور پھر واپس آئے ہیں۔“ کھوجی نے کمال کے کھرے دیکھنے کے بعد اپنی رائے دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ شخص مندر میں آیا تھا اور اس کے کھرے وہاں کئی جگہ موجود ہیں لیکن میرے علم کے مطابق یہ کھرے قاتل کے نہیں ہیں۔ قاتل کے کھرے وہی ہیں جو لاش اٹھا کر کوسوں کی طرف جاتے ہوئے دیکھے تھے۔ ان کھروں کی خاص نشانی جوتے کے تلے میں بنا ہوا سوراخ ہے۔“

یہاں آ کر میری تفتیش کی گاڑی نصب ہو گئی۔ میں جہاں سے چلا تھا پھر وہیں جا پہنچا۔ میں نے اندر کھار کے پاؤں کے نشان کے متعلق کھوجی سے پوچھا کہ کیا ایسا ممکن ہو سکتا کہ واردات کے وقت اس نے دوسرا جوتا پہن رکھا ہو اور اس وقت یہ جوتا پہن رکھا ہے۔

”ایسی بات نہیں ہے جناب!“ کھوجی نے پورے وثوق سے کہا۔ ”اس کے کھرے اور جائے واردات پر پائے جانے والے کھرے میں بہت فرق ہے۔ دونوں کے قدموں کی ساخت اور چلنے کا انداز بالکل الگ ہے۔“ میں نے اندر کھار کو جانے کی اجازت دے دی لیکن ساتھ ہی اس سے کہا کہ وہ علاقے سے باہر نہیں جائے گا اور اگر جانا ہی پڑے تو تھانے اطلاع دے کر جائے گا اور اس کے علاوہ جب بھی اسے تھانے بلایا جائے تو اسے حاضر ہونا پڑے گا۔ کمال سے ابھی میں مطمئن نہیں تھا۔ وہ قتل کی اس واردات کا اہم کردار تھا۔ اگر یہ قتل اس نے

اپنی آمد ظاہر کرنا چاہتا تھا۔ اس مسلمان سکول ماسٹر کا نام گل حسن تھا۔ وہ بڑا خوش اخلاق اور فطرتاً ہی آدمی تھا۔ اس نے اپنی بیٹھک میں میرے بیٹھنے کا انتظام کر دیا تھا۔ گل حسن نے میری خاطر تواضع کے لئے انتظام کرنا چاہا لیکن میں نے منع کر دیا۔

نمبردار نے بتایا کہ تینوں لڑکیاں زمانہ جسے میں موجود ہیں۔ ان میں دو ہندو ہیں اور ایک سکھ۔ میں نے نمبردار سے کہا کہ وہ باہر چلا جائے اور باری باری ایک ایک لڑکی کو اندر بھجوائے۔ نمبردار باہر چلا گیا اور کچھ دیر بعد پہلی لڑکی اندر آئی۔ وہ سارے رنگ اور عام سے نقش و نگار والی لڑکی تھی۔ اس کے چہرے پر تھانیدار کے خوف کے علاوہ جبکہ بھی نظر آ رہی تھی۔ میں نے اس سے نام پوچھا تو اس نے کامنی بتایا۔

”بیٹھ جاؤ کامنی!“ میں نے اس سے کہا۔ وہ بیٹھ گئی تو میں نے اس سے پوچھا۔ ”تو تمہاری پہلی تھی؟“

”جی ہاں!“

”میری بات غور سے سنو کامنی!“ میں نے اس سے کہا۔ ”میں اس کے مرنے کا بہت دکھ ہو گا، یہ میں جانتا ہوں۔ اسے کسی ظالم نے گلا گھونٹ کر مار ڈالا ہے۔ میں تمہاری پہلی کو تو واپس نہیں لاسکتا لیکن وعدہ کرتا ہوں کہ اس کے قاتل کو پکڑ کر پھانسی دلاؤں گا۔ اس کے لئے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ جو میں پوچھوں اس کا ٹھیک ٹھیک جواب دیتا۔“

وہ جواب میں کچھ نہ بولی محض اثبات میں سر ہلا دیا۔

”کیا تو اس شادی سے مطمئن تھی؟“ میں نے پوچھا۔

”بالکل نہیں۔“ کامنی نے کہا۔ ”یہ تو مجبوری کی شادی تھی۔“

”شوہر کے ساتھ اس کا رویہ کیسا تھا؟“ میں نے

پوچھا۔

”ایک پاگل کے ساتھ زندگی گزارنا بڑا مشکل کام ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”پھر بھی تو جیسے تیسے گزارہ کر رہی تھی۔“

”اس کی ساس اور سرسکار وہ اس کے ساتھ کیسا تھا؟“

”وہ تو بڑا خیال رکھتے تھے۔“ کامنی نے کہا۔ ”سرسکار تو اس کا دیوانہ تھا اور اس کے لئے نئے نئے کپڑے، سرخی پوڈر اور کھانے پینے کی اشیاء لاتا رہتا تھا۔“

”تم میری بیٹوں جیسی ہو کامنی!“ میں نے اس سے کہا۔ ”ایک سوال پوچھ رہا ہوں، ہو سکتا ہے تمہیں بُرا لگے لیکن یہ پوچھنا ضروری ہے۔“ کامنی نے مجھے بتایا ہو کہ اس کا پگلا خاوند اس کے ساتھ ایک شوہر کے حقوق ادا کرتا تھا یا نہیں۔“

”بالکل نہیں۔“ کامنی نے نظریں جھکائے کہا۔

”ایسی کوئی بات نہیں تھی۔“

”لیکن پوسٹاٹم رپورٹ تو کچھ اور بتا رہی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تو اس بننے والی تھی۔“

وہ جواب میں کچھ نہ بولی اور خاموش رہی۔

”کیا تمہیں معلوم ہے کہ اس کی باہر کسی مرد سے دوستی تھی؟“ میں نے سوال کیا۔

”جی ہاں، اس نے بتایا تھا۔“ کامنی نے کہا۔ ”وہ ایک مسلمان کمال سے ملتی تھی۔“

”یہ بات چھپی نہیں رہی تھی۔“ میں نے کہا اور پوچھا۔ ”کیا تو نے تمہیں کبھی بتایا تھا کہ کبھی اس کے بھائی نے با اس کے سر نے اس بات پر اس سے لڑائی جھگڑا کیا ہو؟“

”جی نہیں۔“ کامنی نے کہا۔

”کمال کے علاوہ اس کا کوئی چاہنے والا ہو گا۔“

یہ ہے کہ اس نے پاگل بننے کی شادی اپنی ہوس پوری کرنے کے لئے کی تھی۔ تانے مجھے ہر بات بتا دی تھی جی۔ وہ بڑا روتی تھی۔

”میں نے تو سنا ہے سراسر اس کا بڑا خیال رکھتا تھا۔“
میں نے امرت کور کو مزید بولنے پر اکسایا۔ ”وہ بہو کے لئے بڑے مہنگے کپڑے اور پرفیوم لاتا تھا اور اسے بیٹی بیٹی کہتے اس کا منہ سوکھتا تھا۔“

”یہ تو دنیا کھاوا تھا سرکار!“ اس نے کہا۔ ”تا مجھ سے اپنی کوئی بات نہیں چھپاتی تھی۔ یہ سوٹ اور پرفیوم پنڈت اسے رشوت کے طور پر دیتا تھا اور اس سے منہ کالا کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے قابو نہیں آتی تھی۔ پھر لڑکی دوستی کمال کے ساتھ ہو گئی۔ تا مجھے اکثر کہتی تھی کہ اس نے اپنے غریب اور مجبور بزرگے باپ کے قرضے ختم کرنے کے لئے ایک پاگل سے شادی کی ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اپنے باپ کی عمر کے سر کی داشتہ بن جائے۔ اگر یہی کچھ کرنا ہے تو کیوں نہ اپنی پسند کے مرد سے دوستی لگائے۔“

”پھر اس نے کمال سے دوستی لگالی؟“ میں نے اسے پوچھا۔

”یہ! اچھا کیا سرکار!“ امرت کور نے کہا۔ ”زندگی بار بار نہیں مٹی تو پھر اس کو ترس ترس کر کیوں گزارا جائے۔ کیوں نہ سوچ میل کیا جائے، کیوں نہ زندگی سے اپنی خوشیاں اور خواہشیں پوری کی جائیں۔ میں نے تو اس کو شاباش دی تھی کہ وہ ٹھیک کر رہی ہے۔“

”اس دوستی کا پنڈت جی کو علم ہو گیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”جب جن چڑھتا ہے تو سارا عالم دیکھتا ہے سرکار!“ اس نے سکھوں والے انداز میں کہا۔ ”عشق مشک چھپائے نہیں چھپتے۔ پنڈت کو بھی پتا لگ گیا تھا۔“
”پھر پنڈت جی کا رد عمل کیا تھا؟“

میں نے کہا۔ ”اور اس نے اسے مجبور کیا ہوگا کہ وہ کمال کو چھوڑ کر اس سے دوستی لگے مگر وہ باز نہ آئی۔ ہو سکتا ہے کہ اس کو اس آدمی نے قتل کر دیا ہو..... کیا تانے تم سے ایسی کسی بات کا ذکر کیا تھا؟“

”میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں۔“ کامنی نے کہا۔

میں نے کامنی سے اور بھی بہت سی باتیں پوچھیں لیکن اس سے مجھے اپنے کام کی کوئی بات معلوم نہ ہو سکی۔ میں نے اسے جانے کی اجازت دے دی۔ اس کے بعد دوسری ہندو لڑکی کو بلوایا اور اس سے بھی کم و بیش یہی سوال پوچھے اور اس نے بھی کامنی سے ملتے جلتے جواب دیئے۔ اب ایک آخری لڑکی رہ گئی تھی۔ اس نے اپنا نام امرت کور بتایا۔ وہ اونچی لمبی بھرے جسم کی خوبصورت لڑکی تھی۔ اس کے انداز میں سکھوں والا کھلاؤ تھا اور ہار ہار تھا۔ جب میں نے اس سے یہ بات کی کہ مقتولہ کا خاندان اس قابل نہیں تھا مگر وہ تین ماہ کی حاملہ تھی تو امرت کور کو غصہ آ گیا۔

”اس کا خاندان پاگل تھا سرکار!“ اس نے کہا۔ ”مگر پنڈت جی تو پاگل نہیں ہیں نا۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ میں سناتے میں رہ گیا۔

”مطلب صاف ہے سرکار!“ امرت کور نے کہا۔ ”پنڈت جی کی نیت اپنی بہو پر خراب تھی..... سرکار میرا نام نہ آئے تو کھل کر بات کروں؟“

”ہاں، ہاں امرت کور!“ میں نے سنبھل کر کہا۔

”میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارا نام کہیں بھی نہیں آئے گا، تم کھل کر بات کرو۔“

”یہ پنڈت بڑا گھٹیا آدمی ہے سرکار!“ اس نے بتایا۔ ”عورتوں کا پکا شکاری ہے۔ بڑا پنڈت بنا پھرتا ہے، اسی آڑ میں خاصی عورتوں کو شکار کر چکا ہے۔ ہندو عورتیں اسے پنڈت سمجھ کر خاموشی اختیار کر لیتی ہیں۔ سچی بات تو

نے ہندو کو صرف فلموں کی حد تک دیکھا ہے اور اس کی اداکاراؤں کے دیوانے ہو گئے ہیں۔ ہندو کی اصلیت ان بزرگوں سے پوچھیں جنہوں نے ان کے ساتھ وقت گزارا اور ان سے واسطہ رہا۔

بہر حال میں نے امرت کور سے اپنے کام کی اور بہت سی باتیں پوچھیں اور پھر اس کو سمجھایا کہ میری اس کی جو باتیں ہوئی ہیں وہ کسی کو نہ بتائے۔
”یہ بات تو میں آپ کو کہنے والی تھی سرکار!“ اس نے سسکا کر کہا۔ ”میرا نام نہ آنے دینا۔“
میں نے خوش دلی سے اس بات کو لڑکی کا شکریہ ادا کیا اور وہاں سے نکل آیا۔

کالی ماما کی آگیا سے

میں تھانے والہں آ گیا۔ میں نے اپنے ذہن میں سارا کیس دہرایا۔ اب تک میں اندھیرے میں ٹاک ٹوئیاں مار رہا تھا۔ امرت کور سے ملنے والی معلومات کی روشنی میں یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ مندر میں پائے جانے والے دوسرے آدمی کے کمرے کس کے تھے۔ یہی کمرے بعد میں کنویں کی طرف گئے تھے۔ اب مجھے یقین ہو چلا تھا کہ یہ کمرے پنڈت کے ہی ثابت ہوں گے۔ پولیس والوں کی عادت ہوتی ہے کہ ہر بندے کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں اور تحقیق کی بنیاد ہی شک پر رکھی جاتی ہے لیکن اس قتل کے کیس میں جو حقائق اور شواہد تھے، وہ سیدھا سیدھا کمال کو طرز ثابت کر رہے تھے اور پھر پنڈت کی مذہبی حیثیت، اس کا مقتولہ سے باپ والا رشتہ اور اس کی اوجیز عمری نے میرا ذہن اس طرف جانے ہی نہ دیا تھا۔ اب میں نے صبح کا انتظار کئے بغیر اسی وقت پنڈت کو تھکنے میں لینے کا فیصلہ کر لیا۔

اگر میں دن کے وقت جاتا تو لمحوں میں یہ بات ہر طرف پھیل جاتی تھی کہ پولیس نے پنڈت دیال منتر کو بہا

”بڑا بے غیرت آدمی ہے یہ پنڈت سرکار!“ اس نے کہا۔ ”تا سے کہنے لگا جس سے دل چاہے دوستی لگا لے لیکن اس کا دل خوش کر دیا کرے۔“
”پھر کیا ہوا؟“

”کا دل نہیں مانتا تھا سرکار!“ اس نے بتایا۔ ”تا نے اس کی بات نہیں مانی تو اس نے دمکی لگا دی کہ اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔۔۔۔۔ اب دیکھ لو سرکار! بے چاری قتل ہو گئی۔“

”تمہارا کیا خیال ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”کا کو پنڈت جی نے نمے انجام تک پہنچایا ہے۔“

”میں کیا کہہ سکتی ہوں سرکار!“ اس نے کہا۔ ”آپ داروغہ جی لگے ہوئے ہو مظلوم کر لو۔“

اس نے بڑی ہوشیاری سے اپنا پہلو بچا لیا تھا اور مجھے اشارہ بھی دے دیا تھا۔

”کیا پنڈت میں اتنی جرأت ہے کہ وہ کسی کو قتل کر لے؟“ میں نے امرت کور سے پوچھا۔

”وہ کالی ماما کا بھاری ہے سرکار!“ اس نے بتایا۔ ”جس طرح کالی ماما بڑی ظالم دیوی ہے اسی طرح یہ پنڈت بھی بڑا ظالم ہے۔ وہ اکثر اپنی انگلی میں کٹ لگا کر کالی ماما کو اپنے لہو کی بھینٹ دیتا رہتا ہے۔ وہ کالی ماما کو خوش کرنے کے لئے انسانی جان کی نئی بھی دے سکتا ہے۔“

امرت کور نے میرا داغ روشن کر دیا۔ مجھے یاد آ گیا کہ ہندو پنڈت نے اپنے باپ کے دوران کٹر دیوی دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لئے جانوروں کے خون کی بھینٹ دیتے ہیں اور بعض اوقات انسانی خون کی بھینٹ بھی دیتے ہیں۔ اس کے لئے وہ کسی غریب کا بچہ یا کوئی لاوارث بچہ استعمال کرتے ہیں۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے، ہندو اس سے بھی زیادہ درندگی کا مظاہرہ کر سکتا ہے۔ آج کی نسل کو ہندو کی اصلیت معلوم نہیں ہے کیونکہ اس

نقص ہے جس کی وجہ سے وہ دائیں ٹانگ پر زیادہ وزن ڈالتا ہے۔ پہلے میں نے یہی کمزوری کمال کے چلنے میں دیکھی تھی۔ آتے ہوئے میں نے اپنے آگے چلتے پنڈت کو دیکھا تو وہ بھی دائیں ٹانگ پر زیادہ وزن ڈال کر چل رہا تھا۔ اس کی بائیں ٹانگ دائیں سے کمزور لگتی تھی اور اس پر کسی مرہم یا تیل کی مالش کی ہوئی تھی۔

”آپ اپنی ٹانگ کی مالش کر رہے تھے، پنڈت جی!“ میں نے سرسری سے انداز میں بات شروع کی۔

”کیا ہو گیا؟“

”فالج مار گیا اس ٹانگ کو داروغہ جی!“ پنڈت نے بتایا۔ ”ایک ویڈیو نے بڑا اچھا تیل بنا کر دیا ہے۔ اس کی روانہ رات مالش کرنے سے ٹانگ میں جان پڑ گئی ہے۔“

”اس عمر میں بھی آپ میں جوانوں جیسی پھرتی ہے پنڈت جی!“ میں نے کہا۔ ”آپ اس عمر میں بھی جوان ہیں۔“

”اب کہاں رو مگی جوانی داروغہ جی!“ پنڈت نے فخر بھرے لہجے میں کہا۔ ”جب جوانی تھی تو ناریاں رک رک کے دیکھتی تھیں۔“

”مورتوں کی تو اب بھی کی نہیں پنڈت جی!“ میں نے مکھن کاٹتے ہوئے کہا۔ ”آپ کے اشارے کی دیر ہے۔“

”مرد کے اندر کشش ہونی چاہئے داروغہ جی!“ پنڈت نے مزید پھول کر کہا۔ ”ناریاں پیچھے پیچھے پھرتی ہیں۔“

”مگر آپ کی یہ خوبی نظر نہیں آئی تھی۔“ میں نے کہا۔

”دماغ خراب تھا حرام جادی کا۔“ بے اختیار پنڈت کے منہ سے نکلا۔ پھر جب اسے احساس ہوا کہ وہ کیا بول گیا ہے تو خفت زدہ نظر آنے لگا۔

کہتے ہیں لفظ انسان کے غلام ہوتے ہیں مگر جب

کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا ہے۔ اس طرح ہندوؤں کے مشعل ہو جانے کا خطرہ تھا۔ میں مسلمان تھا، اس لئے ہندوؤں نے یہ الزام لگانا تھا کہ مسلمان تھانیدار نے جان بوجھ کر ان کے مذہبی رہنما کو پکڑ لیا ہے۔ اس طرح فساد کھڑا ہو سکتا تھا۔ یہ دیہاتی علاقہ تھا، لوگ سر شام ہی گھروں میں گھس جاتے تھے، اس لئے امکان تھا کہ میں پنڈت کو رازداری سے تھانے لے آؤں گا۔

میں نے دو کافیل ساتھ لئے، اپنا سرکاری پستول لگایا اور پنڈت کے گھر جا پہنچا۔ دروازہ کھٹکھٹایا تو تھوڑی دیر بعد خود پنڈت نے ہی دروازہ کھولا۔ پولیس والوں کو دیکھ کر ایک لمحے کو اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار ابھرے مگر پھر فوراً ہی ٹھیک ہو گئے۔ اس وقت اس نے دھوتی کو لٹکوت کی طرح اوپر باندھ رکھا تھا اور اس کی ایک ٹانگ پر تیل نما چیز لگی صاف نظر آ رہی تھی۔ غالباً وہ ٹانگ کی مالش کر رہا تھا۔

”اس سے داروغہ جی!“ اس نے پریشان کن انداز میں پوچھا۔ ”کھیریت ہے؟“

”ہاں، پنڈت جی!“ میں نے کہا۔ ”آپ سے کچھ باتیں پوچھنی ہیں، آپ کی بہو کے قتل کے سلسلے میں۔“

”آ جاؤ داروغہ جی!“ اس نے ہمیں اندر آنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا اور اندر کی طرف چل پڑا۔

پنڈت ہمیں اس کمرے میں لے گیا جسے بیٹھک بھی کہا جا سکتا ہے اور ضرورت مندوں کو جھاز پھونک وغیرہ کرنے کی جگہ بھی۔ یوں سمجھ لیں جیسے ہمارے وہاں بیروں فقیروں اور عاقلوں شاہ صاحبوں وغیرہ نے ٹھکانے بنا رکھے ہوتے ہیں۔ پنڈت نے ایک طرف کالی دیوی کا چھوٹا سا بت رکھا تھا اور عملیات کرنے کے لئے کچھ اسی سیدھی چیزیں رکھی تھیں۔

میرے ذہن میں کھوجی کی یہ بات آ گئی تھی کہ قاتل کی بائیں ٹانگ ذرا کمزور ہے یا اس میں کسی قسم کا

یہ قتل میں نے کالی ماں کی آگیا سے کیا ہے۔
 ”تم ایک بات بھول رہے ہو پنڈت جی!“ میں
 نے طنزیہ لہجہ میں کہا۔ ”یہاں قانون کالی ماما کا نہیں
 انگریز کا چلتا ہے اور میں انگریز حکومت کا ملازم ہوں کالی
 ماما کا نہیں۔ تم یہ سب عدالت میں کہنا۔ اب شرافت سے
 میرے ساتھ تھانے چلو، دوسری صورت میں جھڑپاں لگا
 کر لے جاؤں گا۔“

میں نے کانسیلوں سے کہا کہ اس کو حراست میں
 لے کر تھانے لے چلو۔ چلنے سے پہلے میں نے پنڈت
 سے کہا کہ وہ اپنے جوتے خود ہی مجھے دے دے جو اس
 نے واردات کے وقت پہن رکھے تھے ورنہ میں سارے
 گھر کی تلاشی لے کر خود جوتے ڈھونڈ لوں گا۔ پنڈت نے
 تھوڑی پس و پیش کے بعد کاٹھ کھڑ کے نیچے سے پرانے
 سے جوتوں کی ایک جوڑی نکال کر دے دی۔ میں نے
 جوتوں کے کتوے دیکھے۔ ایک جوتے کے کتوے میں بچے
 والے حصے میں چمڑے کا ٹکڑا لگا ہوا تھا۔ یہ ہو بہو دسالی
 تھا جیسے کمرے میں نے کنویں کے پاس دیکھے تھے۔ میں
 نے ایک کانسیل کو جو جوتے پکڑا دیئے۔

مجھے سے پہلے پنڈت نے کہا کہ وہ اپنی گھر والی کو بتا
 کر آتا ہے ورنہ جوتے وہ اسے نہ پا کر پریشان ہوں گے۔
 میں نے اسے اسیلے اندر نہ جانے دیا کہ وہ کسی دوسری
 طرف سے فرار نہ ہو جائے۔ میں خود اس کے ساتھ اندر
 گیا۔ کمرے میں اس کی بیوی سو رہی تھی۔ میں نے اچھی
 طرح دیکھ لیا کہ اس کمرے کا کوئی دوسرا دروازہ نہیں ہے
 اور نہ ہی ایسی کھڑکی ہے جس سے آدی باہر نکل سکے۔ میں
 باہر ہی کھڑا ہو گیا اور پنڈت اپنی بیوی کو جگانے لگا۔ پھر پتا
 نہیں پنڈت نے اسے کیا بتایا ہوگا۔ چند منٹ بعد وہ باہر آ
 گیا۔ ہم اسے لے کر باہر نکلنے لگے تو اچانک میری نظر
 کارنس پر رکھی ہوئی ایک ڈیبا پر پڑی جس پر ایک شیر کی
 تصویر بنی ہوئی تھی اور اوپر ہندی زبان میں کچھ لکھا ہوا تھا۔

انہیں منہ سے نکال دیا جائے تو یہ پرانے ہو جاتے ہیں۔
 ”اسی لئے ماری گئی بے چاری۔“ میں نے کہا۔
 ”آپ کی بات مان لیتی تو زندہ رہتی۔“
 ایک لمحے کے لئے پنڈت کا سانولا رنگ سیاہ پڑ گیا
 اور اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس نے تھوک نکلنے کی
 کوشش کی۔

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں داروغہ جی!“ پنڈت
 نے بڑی مشکل سے کہا۔
 ”دیکھو پنڈت جی!“ میں نے ذرا سخت لہجہ میں
 کہا۔ ”میں یونہی یہاں نہیں آ گیا۔ مجھے ساری واردات
 معلوم ہو گئی ہے۔“
 ”میں نے لا کو نہیں مارا۔“ پنڈت نے کہا۔ ”یہ
 کمال کا کام ہے۔ وہ مسلمان ہے اس لئے آپ اسے
 پکڑنے کے بجائے مجھے دھمکا رہے ہیں۔“
 ”میں نے تو ابھی تک نہیں کہا کہ تم نے لا کو قتل کیا
 ہے۔“ میں نے کہا۔

”آپ کی باتوں کا یہی مطلب ہے۔“ پنڈت نے
 کہا۔ ”میں بھلا اپنی بیٹی جیسی بہو کو کیوں ماروں گا؟“
 ”کہاں کی بیٹی اور کہاں کی بہو پنڈت جی!“ میں
 نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ”تمہاری
 نیت اپنی بہو پر خراب تھی تمہارا بھٹا تو شادی کے قابل
 ہی نہیں تھا۔ تم نے دنیا کو دکھانے کے لئے بیٹے کی شادی
 کر دی تاکہ آنے والی غریب کی بیٹی سے رنگ رلیاں منا
 سکو مگر اس نے تم جیسے بوڑھے کو ٹھکرا کر اپنے جیسے جوان
 آدی سے دوستی لگالی۔ اسی بات کا تمہیں رنج تھا۔ پھر تم
 نے موقع پا کر اس کا کام تمام کر دیا۔“

پنڈت نے کچھ بولنا چاہا مگر بول نہ سکا اور کچھ
 سوچنے لگا۔

”دیکھو داروغہ جی!“ اس نے سنبھل کر کہا۔ ”آپ
 اس معاملے میں دخل نہ دو۔ یہ ہمارا دھرم کا معاملہ ہے۔“

ہے۔ یہ تا عمر ایسے ہی رہے گا۔ جب پنڈت کی زانیہ لوگوں کو اس بات کا علم ہوا تو دور دور سے کمزور عقیدے کے ہندو مرد و عورتیں اس کو دیکھنے آنے لگے۔ لوگ آتے تو نقد چڑھاوا یا کھانے پینے کی اشیاء لے آتے۔ اس طرح پنڈت کا پاگل بیٹا اس کی آمدنی کا ذریعہ بن گیا۔

ایک دن کسی نے پنڈت کو مشورہ دیا کہ اس کی شادی کر دو یہ ٹھیک ہو جائے گا۔ پنڈت کو یہ بات پسند آئی مگر اس کے پاگل بیٹے کو کون اپنی بیٹی دیتا؟ عقیدت اپنی جگہ رکھ اپنی بیٹی کو کوئی بھی اس جہنم میں ڈالنے کو تیار نہ تھا۔ پنڈت ہر طرف سے مایوس ہو گیا تو اس کے ایک بھائی والے نے اسے لٹاکے باپ کی غربت اور قرضوں کے متعلق بتایا اور پنڈت نے کہا کہ وہ اگر اس شخص کا قرض اتار دے اور کچھ مدد کر دے تو یقیناً وہ اپنی چھوٹی بیٹی کا رشتہ پنڈت کے بیٹے کو دے دے گا۔

اس کے بعد ایسا ہی ہوا۔ پنڈت نے باپ کی مجبوریوں کے عوض لٹا کو اپنے پاگل بیٹے کے لئے خرید لیا۔ اس کا بیٹا دلہن کو دیکھ کر بہت خوش ہوا لیکن جیسا کہ بیان ہو چکا ہے کہ اس کی ذہنی حالت میں کوئی تبدیلی نہ آئی اور نہ ہی وہ عورت کے قائل تھا۔ اب پنڈت کو احساس ہوا کہ اس سے غلطی ہو چکی ہے اور خواہ مخواہ اتنا پیسہ بھی ضائع کیا۔ پنڈت کو ابھی پیسے کا غم کھائے جا رہا تھا کہ اسے لوگوں کی زبانی معلوم ہوا کہ اس کی بہو لڑنے ایک مسلمان لڑکے سے دوستی لگاتی ہے اور وہ اکثر اس سے ملتی ہے۔ اس نے لڑکے کو سمجھا باپا لیکن لڑکھن کی حد سے بہت آگے نکل چکی تھی۔

پنڈت خود بھی کوئی شریف آدمی نہیں تھا۔ اس کے کئی عورتوں سے تعلقات رہ چکے تھے۔ اس نے لڑکے پر بڑی نظر رکھی اور اسے نت نئے کپڑے، جوتیاں اور سرنخی پوڈر لاکر دیے لگا۔ اس نے اپنی باتوں اور حرکتوں سے لڑکے کو اپنے راستے پر چلانا چاہا لیکن وہ پہلو بھاگتی۔ آخر اس نے

میں نے وہ ڈیبا اٹھا کر دیکھی، پھر اسے کھول کر دیکھا۔ اندر دس بارہ گولیاں پڑی تھیں جن پر سونے کا ورق چڑھا ہوا تھا۔

”یہ کیا ہے پنڈت جی؟“ میں نے یونہی سرسری انداز میں پوچھ لیا۔ میرا کوئی خاص مقصد نہ تھا۔

”یہ..... یہ فالج کی دوائی ہے داروغہ جی!“ پنڈت نے ذرا انگ کر کہا۔ ”اپنی ٹانگ کے لئے استعمال کرتا ہوں۔“

میں ڈیبا کو دیکھ رہا تھا کہ اسی وقت ایک ہندو کانشیل نے مجھے آنکھ سے اشارہ کیا اور ایک طرف چل پڑا۔ ہم دونوں پنڈت سے دس بارہ قدم پر سے چلے گئے تو میں نے کانشیل کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”پنڈت جی جھوٹ بول رہے ہیں سر!“ کانشیل نے سرگوشی میں کہا۔ ”یہ فالج کی دوائی نہیں ہے بلکہ جنسی قوت بڑھانے والی گولیاں ہیں۔ یہ بڑی مشہور دوائی ہے..... معلوم نہیں یہ پنڈت اس بڑھاپے میں بھی ایسی دوائی کیوں کھاتا ہے؟“

یہ مجھے معلوم تھا۔ اس بے چارے کانشیل کو کیا معلوم کہ ان کا پنڈت عورتوں کا شکاری ہے اور اپنی عیاشی کے لئے اپنی کمزور جوانی کو دوائیوں کے سہارے قائم رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں نے گولیوں کی وہ ڈیبا اپنی جیب میں رکھ لی اور پنڈت کو لے کر تھانے آ گیا۔

پنڈت نے اپنے بیان میں جو کچھ بتایا وہ میں مختصر کر کے اپنے الفاظ میں پیش کر دیتا ہوں۔ پنڈت کو قدرت نے ایک ہی بیٹا دیا تھا جو دائمی طور پر نارمل نہیں تھا اس کا جبکہ علاج کرایا لیکن وہ ٹھیک نہ ہو سکا۔ پھر اس کے علاج کے لئے جو گیوں، عاتلوں کے پاس لے جایا گیا مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ پھر اسے تیرتھ یا ترائے کے لئے بنارس لے گیا۔ وہاں ایک مہا پجاری نے اس کے بیٹے کو دیکھ کر کہا کہ یہ تو کالی ماں کا اتار ہے، اس پر کالی ماں کا سایہ

AL-KAWTHER

الکواثر

• واشنگ مشین • فریڈر • روم انکوبر • گیڈر

سب سے اچھی ہے



ISO 9001

Environment Friendly

حمید الیکٹریک انڈسٹری

فون: 92-55-3894636 • فیکس: 92-55-3894638

e-mail: info@unitedwash.com

ایک دن لڑکا کو صاف صاف کہہ دیا کہ وہ بے شک اس مسلمان لڑکے سے دوستی لگائے رکھے لیکن پنڈت کا دل بھی خوش کر دیا کرے۔

یہ پنڈت کی کمینگی اور بے غیرتی کی انتہا تھی۔ اس نے ہندو جنوں کی سوچ کے عین مطابق بتایا کہ وہ چاہتا تھا کہ اس نے جو اس شادی پر اتنی بڑی رقم خرچ کی ہے وہ لڑکا سے پوری کر لے۔ جب لڑکا اس کے جال میں نہ آئی تو پنڈت کا دماغ خراب ہو گیا اور وہ اس سے انتقام لینے کے منصوبے بنانے لگا۔ وہ لڑکے پر نظر رکھنے لگا۔ اس طرح اسے معلوم ہو گیا کہ لڑکا اور کمال کالی دیوی کے پرانے مندر میں رنگ رلیاں مناتے ہیں۔

پھر وہ دن آیا جب پنڈت کو بتایا کہ اس کا بھائی بیمار ہے اور وہ اس کو دیکھنے جا رہی ہے۔ پنڈت کو شک ہو گیا اور وہ اس کا پیچھا کرتے ہوئے مندر تک چلا گیا۔ اب اسے لڑکا کی بد قسمتی کہہ لیں یا یوں کہہ لیں کہ اس شام کمال کے باپ کو بھینس نے سینک مار دیا اور وہ دم توڑ پر وہاں پہنچ نہ سکا۔

سدا جوانی

ادھر پنڈت نے مندر میں جا کر لڑکا کو پکڑ لیا اور پہلے تو اس کو خوب ڈرایا دھمکایا اور پھر اس پر اپنی بُری نیت کا اظہار کر دیا۔ لڑکا اس سے ڈری اور نہ اس کے جال میں آئی۔ اس کو غالباً امید تھی کہ کمال آئے ہی والا ہوگا اور وہ پنڈت کو سنبھال لے گا۔ پنڈت نے جب لڑکا کو مضامند نہ پایا تو اس نے اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھایا اور زبردستی اس سے منہ کالا کیا۔ لڑکا نے اس کو نگلی گالیاں دیں اور کہا کہ وہ ساری دنیا کو بتائے گی کہ اس کے باپ کے برابر سر نے اس کے ساتھ زبردستی منہ کالا کیا ہے۔ یہ سن کر پنڈت خوف زدہ ہو گیا مگر پھر اسے طیش آ گیا کہ وہ اپنی مرضی سے ایک مسلمان کے ساتھ رنگ رلیاں مناتی ہے اور اس

میں نے پنڈت سے جوتے اتروا کر ثبوت کے طور پر رکھ لئے۔ پھر میں نے پنڈت کو اس کے گھر سے ملنے والی گولیوں کی ڈبیا دکھا کر کہا کہ یہ فالج کی گولیاں نہیں ہیں، وہ سچ بتائے کہ یہ کس کام کی دوائی ہے؟
”آپ کے کانٹیل نے آپ کو بتا دیا تھا۔“
پنڈت نے کہا۔

”ڈبیا کے اوپر ہندی میں کیا لکھا ہوا ہے؟“ میں نے نوجنی دوپٹے کی خاطر پوچھا۔

”سدا جوانی!“ پنڈت نے کہا۔ ”یہ بڑی قیمتی دوائی ہے اور صرف مجھے والے ہی استعمال کرتے ہیں۔“

”اگر جوانی پاک صاف گزاری ہو تو بڑھاپے میں دوائیوں کی ضرورت نہیں پڑتی پنڈت جی!“ میں نے اس سے کہا۔ ”قدرت اپنے اصولوں پر نکل رہی ہے۔“

اس کے بعد میں نے پنڈت کو محشریت کے سامنے پیش کیا تاکہ اس کا بیان کر اسکو مگر محشریت کے سامنے جا کر پنڈت اپنے بیان سے منحرف ہو گیا اور قانون کے مطابق پنڈت کو جیل بھیج دیا گیا۔

میں نے بڑی محنت سے پنڈت کے خلاف کہیں تیار کیا۔ میں نے گواہوں میں امرت کور اور کمال کا بیان دلوانا تھا۔ سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ موقع کا کوئی گواہ نہیں تھا۔ واقعاتی شہادت بڑی مضبوط تھی۔ جب کہیں عدالت میں پیش ہوا تو ہندوؤں نے پنڈت کی طرف سے بڑا ہی قابل وکیل پیش کیا۔ اس وکیل نے سارا زور اسی نکتے پر رکھا کہ موقع کا کوئی گواہ نہیں ہے اور دونوں گواہوں کے بیان سے کہیں یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ قتل پنڈت شکر دیال نے کیا ہے۔ سچ ایک ہندو رام سہائے گپتا تھا۔ اس نے پنڈت کو شک کا فائدہ دے کر بری کر دیا۔ میں نے مقتول کے باپ رام داس سے کہا کہ وہ ایٹل میں جائے مگر اس میں اتنی ہمت نہیں تھی۔ اس نے انکار کر دیا۔



کو دھمکا رہی ہے۔ پنڈت پر پاگل پن سوار ہو گیا۔
لٹا کالی دیوی کے قدموں میں زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کا دوپٹہ ایک طرف پڑا تھا۔ چوڑیاں ٹوٹ کر بکھر گئی تھیں۔ پنڈت نے بڑی پھرتی سے دوپٹہ اٹھایا اور پیچھے سے لٹا کی گردن میں ڈال کر گرہ لگا دی اور پوری قوت سے دونوں پلو مخالف سمت میں کھینچنے لگا۔ لٹا آخر جوان تھی۔ اس نے ایک بار تو زور لگا کر آنکھوں کی کوشش کی لیکن پیچھے سے پنڈت نے اس کے دونوں کندھوں کے درمیان اپنا پاؤں رکھ کر دباؤ ڈال دیا اور دوپٹے کو پوری قوت سے اپنی طرف کھینچا۔ تھوڑی دیر میں لٹا سانس رکھنے سے مر گئی۔

پنڈت کو معلوم تھا کہ ٹھوڑے فاصلے پر ایک خشک اور ویران کنواں ہے اور اس طرف کم ہی کوئی جاتا ہے۔ اس نے لٹا کی لاش کو اٹھایا اور کسی نہ کسی طرح کنویں تک لے گیا۔ باقی سارا واقعہ اس طرح ہوا جیسے میں شروع میں بیان کر چکا ہوں۔ پنڈت میں اب جوانی والی قوت نہیں رہی تھی۔ کچھ دودھ جا کر وہ ہانپنے لگا اور لٹا کی لاش زمین پر رکھ کر تازہ دم ہوا اور پھر لاش کو کندھے پر ڈال کر چل پڑا لیکن ابھی کنواں کچھ فاصلے پر تھا کہ اس کی ہمت جواب دے گئی۔ دم لینے کے بعد اس نے لاش اٹھانے کی بجائے اس کو ٹانگوں سے پکڑ کر کھینچنا اور لے جا کر کنویں میں ڈھکا دیا۔

میں نے پنڈت کا بیان کچھ کر اس کا انگوٹھا لکوا لیا۔ اس کے بعد میں نے پنڈت کو وہ جوتے پہنے کو کہا اور اس کے بعد اس کو تھانے کے صحن میں بکچی زمین پر چلایا۔ کھوجی کو میں نے پہلے ہی بلارکھا تھا۔ وہ آ گیا تھا۔ میں نے اس کو کہا کہ وہ جائے واردات پر پائے جانے والے کھردوں سے ان کھردوں کا موازنہ کرے۔ کھوجی نے کھرے دیکھتے ہی کہہ دیا کہ سو فیصد جائے واردات پر پائے جانے والے کھرے ہیں اور ان میں ہال برابر فرق نہیں ہے۔

لفظ آمریش

آہ! کالے نہیں رہے۔ پرنٹ میڈیا سے آگے نکل کر خود کو الیکٹرانک میڈیا کے حوالے کرتے ہوئے لفظ اپنی آن بان اور شان کھوتے چلے گئے، لفظ کو تلے ہو گئے مگر لفظ کبھی مرتے نہیں..... کیونکہ لفظ آمریش۔

☆ شازیہ محسن (ایم اے انگلش)

رہی تھی، دوسری جانب اسی گلوبل ولج کے رہنے والے بیمار اندیشوں اور دوسروں کی کہانیاں لکھ رہے تھے۔ ترقی کے بعد.....؟ ای کامرس، ای میل.....؟ انجیکشن کے بعد.....؟ انٹرنیٹ کے وسیع ہوئے دائرے کے بعد.....؟ کلوننگ کے بعد..... آسمان پر کند بھینکنے کے بعد..... ٹرانسپلانٹیشن کے معجزہ سے گزرنے کے بعد..... سوالات کی اس لمبی، لامتناہی قطار میں، بس دو چار برس بعد مستقبل کے کچھ ایسے بچوں کے دھندلے چہرے بھی نظر آ رہے تھے جو پوچھ رہے تھے۔ ”اچھا پاپا! آپ استاد سے پڑھتے تھے ہمیں تو کمپیوٹر پڑھاتا ہے۔“

الیکٹرانک میڈیا کی یلغار کے بعد کیا پرنٹ میڈیا

میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا پر بات کرتے ہوئے بار بار مجھے احساس ہو رہا ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہرائی ہے۔ ”Big brother is watching you.“ کا خونک، حوال کل بھی تھا اور آج بھی ہے۔ جنگ عظیم کی تباہ کاریوں کے بعد بھی تباہ کاریوں کے نئے نئے سلسلے جاری رہے۔ بیسویں صدی ایک طرف جہاں انسان کی آنکھوں میں ارتقاء کے نئے خواب رکھتی گئی، وہیں عالمی انسانی برادری سے متعلق سوال پر سوال کھڑا کرتی گئی۔

انسانی ارتقاء کی حیرت انگیز تاریخ ایک طرف دنیا کو ایک چھوٹے سے گلوبل ولج میں تبدیل کرنے کا دعویٰ کر

نہیں آئے تو وہی ریوٹ اور ایک نیا ریوٹ کلچر..... جب کچھ بھی نہیں تھا، تب بھی لفظ تھے۔ صفحہ ہستی پر موجود بے نام انتہا کی صورت میں یہ لفظ موجودات کی دنیا میں اپنی اہمیت ثابت کرنا چاہتے تھے۔ پھر یہ لفظ زور زور سے چیخے، ادھر صدیوں کے نئے نئے برس بدلنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ ادھر تہذیب اور سماجی زندگی میں، تعمیرات کا دور شروع ہوا لیکن کیا بدلتا تھا؟ کتنا کچھ بدلتا تھا؟ یا کچھ بھی نہیں بدلتا تھا؟ وقت اپنی لمبی عمر کی جھریاں سی لگا رہا تھا۔ مگر بدلتا کچھ بھی.....؟ ہاں، ریس کے گھوڑے بدلے تھے۔ ہر آنے والی نسل جرمن اویب "ہرمن بیے" کے ڈیسیان کی طرح اپنے نئے گھوڑے بدل بدل کے صفحہ ہستی پر اپنی موجودگی ثابت کر رہی تھی۔ جیسے وہ جرمن شاعر ایش فریڈ کہتا تھا۔

آؤ!

بدلتا کچھ بھی نہیں ہے

تم نے غور نہیں کیا

اپنے دادا میں بھی تم تھے

باب میں بھی

دکے ہوا

بدلتا کچھ بھی نہیں ہے

صدیوں پہلے تھا ہمارے پڑکھوں نے خاندان کی پہلی انگلی تھامی تھی تم یقین کرو وہ بھی تم تھے تو طے ہوا کہ بدلتا کچھ بھی نہیں ہے۔ موسم وہی، انسان وہی، انسان کی فطرت وہی، وہی جبلت، وہی خون ریزی، کبھی موسم سی لپک، کبھی مکاری، صرف صدیوں کے اندھیرے میں اپنی خوفناکی اور تباہی کی کہانیاں دہراتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ ڈائمنسار کی جگہ دوسرے جنگلی جانور لے لیتے ہیں اور انسان اپنی عادتیں، اپنی فطرت لباس کی طرح بدلتا رہتا ہے اور ارتقاء کی دوڑ میں اپنے ہونے کا ثبوت دیتا رہتا ہے۔ کوئی ایک شہر سیکون ندی کے اٹھتے ہوئے

ختم ہو جائے گا؟ پرنٹ میڈیا کا مستقبل کیا ہے؟ مچھلیوں کی یلغار، انٹرنیٹ کے خیم سے برآمد گوشت پوست کی عورتیں اور اس سے چپکی نو جوان نسل پرسل کمپوزرز پر جھکے ہوئے دماغ اور ایک طرف وہی پرانی مچھلیں، وہی کاغذوں کے انبار اور وہی سلکتے جاگتے لفظ، وہی کمزور اور ہونے لفظ، وہی سیاسی لفظ، وہی لفظ جو جلی سرخیوں میں کبھی آپ کو چونکاتے تھے، مشتعل کرتے تھے، بے چین کرتے تھے، آپ کو جذباتی بناتے تھے۔ انہی لفظوں نے یکا یک پیرا بن بدل لیا۔ مچھلیں پرانی ہو گئیں، وہ لفظ قلم اور سیاسی سے کودے اور "Visuals" بن گئے۔ وہ کیفیتیں، مکالمے، فوٹو گرافی اور اداکاری ایڈیٹنگ کی تکنیک میں سامنے آئی۔ تو کیا سارے لفظوں کے پرنٹ میڈیا سے دوستی ختم کر لی؟ برسوں سے یکسانیت اور یونٹیم کے شکار لفظوں نے Visual Media سے دوستی کر لی؟ تمدن کے پرانے چراغ گل ہو گئے؟ پرانی روایتیں پائل ہو گئیں؟ وہ چائے کی چسکیاں، وہ صبح کی ٹھنڈی ہوا اور باغوں میں پڑے ہوئے جھولے اور کتابیں اور آنکھوں میں قید ایک عجیب سی رومانی دنیا، بیڈ روم کے نیچے کے نیچے پڑے ہوئے مڑے پرانے رسائل، میز پر ادھر ادھر رکھی ہوئی کتابیں، گھر کی لائبریری میں، ریوٹنگ چیر پر جموستا ہوا بوزھا وجود، میز پر پڑی ہوئی ٹیک اور ریک پر ایک قطار میں بھی کتابیں، تو کیا وقت بوزھا ہو گیا؟ پرانی کہانیاں وقت کی زنجیل میں کھو گئیں یا دفن ہو گئیں۔

ابھی کچھ برسوں پہلے کی Reading Habit ماضی کا قصہ پارینہ بن گئی۔ ہم ریوٹ کلچر کے لوگوں نے ہاتھوں میں ریوٹ تھام لیا۔ جیو کا پروگرام پسند نہیں آیا تو اسے آر وائی لگا دیا۔ دنیا چینل پسند نہیں آیا تو پی ٹی وی لگا دیا۔ پی ٹی وی پسند نہیں تو کسی باپ گانے کے انتظار میں آنکھیں تیرنے لگیں۔ اس سے بھی جی بھر گیا تو انٹرنیٹ سے دودھ ہاتھ کر لئے۔ بیوی پسند نہیں آئی تو، بچے پسند

شیکسپیئر مجھے بہت سے ایسے لوگوں کی ضرورت نہیں کہ جب میں مروں تو وہ رونے کو تیار ہوں بلکہ مجھے صرف ایک ایسے بندے کی ضرورت ہے کہ جب روؤں تو وہ مرنے پر تیار ہو۔
(خادم حسین مجاہد)

اس جاتی ہیں۔

میں نہیں جانتی تیسری جنگ عظیم کیسے کیسے اسلحہ سے لڑی جائے گی مگر یقیناً چوتھی جنگ عظیم کے بارے میں وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ اس میں ایک بار پھر تیر اور بھالوں کا استعمال شروع ہو جائے گا۔ اس سے دو ہاتھ آگے بڑھ کر ایچ جی ویلز ہمیں ایک خوفناک منظر دکھاتا ہے۔ ایک سائنس دان ہے جس نے انسانوں جیسا روباٹ بنا لیا ہے۔ نین نقشہ سب کچھ انسانوں جیسا، انسان بے کار ہونے لگے ہیں۔ کمپیوٹر اور روباٹ ان کے سارے کام انجام دینے لگے ہیں۔ پھر ایک دن کمپیوٹر اور روباٹ کا احساس ہوتا ہے کہ یہ نکما انسان برسوں سے ان کا استحصال کر رہا ہے اور ایک دن وہی سائنس دان روباٹ کو غصے اور احتجاج بھرے موڈ میں دیکھتا ہے۔ روباٹ سب سے پہلے اس سائنس دان کو قتل کر دیتا ہے۔ دراصل اس ٹھوبلا نریشن اور کمپیوٹر ٹیکنالوجی کی برق رفتار ترقی کو لے کر احتجاج نہیں درج کرانا لیکن کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے اس عہد میں جس طرح انسان آہستہ آہستہ Digital ہوتا جا رہا ہے اس سے ایک افسوس ناک فضا قائم ہوتی ہے۔ ترقی اچھی چیز ہے لیکن اس عہد میں جب موت آپ کی مٹیوں میں بند ہے انسان کی دسترس میں ہے۔ جب ٹرانسپلانتیشن کے تجربوں میں آپ بندر کے اعضاء کا استعمال کر سکتے ہیں۔

جب الیکٹرانک میڈیا کی یلغار آپ کو نکلا اور انسانی

شعلوں کی نذر ہو جاتا ہے۔ پھر کوئی نیا ہیر و شیماء، نیا ناگ ساکی، نئی ترقیاں اور نئے انسان۔

کبھی لفظ جاتے ہیں کبھی لفظ سیاسی نعرے بن جاتے ہیں۔ کبھی خوبصورت روحانی مکالمے، پرنٹ ہو کر آپ کی عادت، آپ کی زندگی کی ضرورتوں سے اس طرح جڑ جاتے ہیں کہ روزمرہ کی روٹین بن جاتے ہیں اور جب کبھی لمحے صدیوں کے فاصلے طے کرتے ہیں تو کبھی لفظ نئے سواصلاتی نظام میں ڈھل کر کبھی ریڈیو، ٹی وی، نئے نئے جیتو، کمپیوٹر ڈیجیٹل اور مٹی میڈیا کی نئی نئی دریافت بن جاتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وقت نے صدیوں کی انگی تمای اور اثر ان شستری میں بیٹھا اور اثر ان جھو ہو گیا..... مگر کہاں؟

آہ مکالمے نہیں رہے۔ پرنٹ میڈیا سے آگے نکل کر خود کو الیکٹرانک میڈیا کے حوالے کرتے ہوئے لفظ اپنی آن بان شان کھوتے چلے گئے۔ لفظ کو نئے نئے چلے گئے اور پھر لفظ منہ سے ہونے والی ادائیگی بھول کر لفظ اپنے اپنے پرسل کمپیوٹر پر دماغ میں چلنے والی کشش اور تھرکتی ہوئی باتوں کی انگلیاں بن گئے۔ انگلیوں کا رقص جاری رہا۔ لفظ غائب ہوتے رہے، مکالمے سنائے میں ڈوب گئے، ایک سائبر لینے ہے، انٹرنیٹ کی ڈکان کھلی ہے، کمپیوٹر پر بیٹھے ہوئے لوگ خاموشی سے سکرین کے ساتھ چپکے ہوئے ہیں۔ دنیا ایک چھوٹے سے گلوبل گاؤں میں تبدیل ہو گئی مگر یہ گلوبل گاؤں انسانی لمس سے قطعی نا آشنا ہے۔ یہ گلوبل گاؤں اپنی تنہائی کی دنیا تو بنا لیتا ہے مگر مکالموں، غلوں و محبت کی دنیاؤں سے دور نظر آتا ہے اور دراصل الیکٹرانک میڈیا کی ترقی نے اتنا کیا کہ ہمیں ترقی کے Explosion Point پر پہنچا دیا جس کے بعد کوئی ترقی نہیں، جس کے بعد کوئی رئیس کا گھوڑا نہیں، جس کے بعد دنیا کا نام و نشان نہیں بس ایک دھماکہ اور آئن سٹائن کی باتیں، سیسے کی طرح کانوں میں

ہوا۔ وہ دن بھی یاد ہے جب ”اندھیرا اجالا“ اور ”تہائیاں“ جیسے دوسرے مقبول سیریلز کے وقت سرکاری سونی ہو جاتی تھیں۔ میرے خیال میں پرنٹ میڈیا کا دبدبہ وقار اور اہمیت چھوٹی سی مختصر انسانی زندگی سے بھی بھی ختم نہیں ہو سکتی۔

ابھی بھی انسانی کیفیت کے سمندر سے کافی آگے نکل گئی۔ فلم اور فوٹو گرافی نے ایک قطرہ سے زیادہ بھی نہیں لیا ہے۔ جدید تر فلم ٹیکنالوجی کچھ بھی فلانے کا حوصلہ تو رکھتی ہے لیکن ابھی بھی محبت کی نازک ترین سطح تک اس کی پہنچ نہیں ہوئی ہے۔ بہت ساری کیفیات، انسانی جذبات اور احساسات ایسے ہیں جنہیں کمرے کی آنکھ فلانے کا حوصلہ نہیں رکھتی۔ فلمیں آتی جاتی لہرس ہیں Visuals اس لمحے کا جج ہے جس لمحے ہماری آنکھیں Screen سے چپک رہی ہیں۔ پرنٹ میڈیا کو اس معاملے میں ابدیت حاصل ہے۔ اس کا ہر لفظ بولتا ہے۔ برسوں بولتا ہے، بولتا اور چختا ہے اور یہ جج ایک باشعور انسان کسی سی ڈی یا ڈی وی ڈی کیسٹ میں محفوظ نہیں رکھ سکتا۔

لفظ امر ہیں، ہم اشرف المخلوقات ہیں کلونک پروبجر سے گزر رہے ہوئے بھی اپنے جیسے انسان بنا لینے کے تجربہ کے بعد کہیں ایک پرانی تہذیب کا درد باقی رہ جاتا ہے اور کہیں یہی درد پرنٹ میڈیا کے جلی حروف کی حفاظت اور دفاع میں سامنے آئے گا اور یقیناً اس یلغار کے جھمٹے ہی ایک بار پھر یہ جلی حروف اپنی اہمیت و افادیت ثابت کرنے کے لئے ہمارے سامنے ہوں گے۔ لفظ امر ہیں، لفظوں کی ترسیل مطبوعہ صفحات پر ہی اچھی لگتی ہے اور انہی مطبوعہ صفحات میں تہذیب کے برسوں پرانے ڈائنوسار ابھی بھی زندہ ہیں اور نام صرف زندہ ہیں بلکہ سانس لے رہے ہیں۔



اخلاقیات سے پرے کا انسان بنا دیتی ہے تو سوچنا پڑتا ہے کہ اس ختم ہوتی تہذیب کے اس Explosion Point پر ہمارے بچے کیا دیکھیں گے۔ ہمارے کالونی کلچر میں ان بچوں کے لئے نہ دو دھیا آسمان ہے نہ آکاش میں پھیلے چاند ستارے، نہ چھت ہے، نہ چھت پر پھمسی ہوئی پٹلیاں..... جہاں باتیں جاگتی تھیں، جہاں محبت میں ڈوبے مکالے ہوتے تھے جن سے ایک زندگی کی مسرت کے سلسلے شروع ہوتے تھے۔ اب بند کر دیے ہیں۔ کالونی کلچر ہے، اپنا اپنا پرسنل کمپیوٹر ہے۔ گوگلے ہوتے لفظ ہیں، کمپیوٹر ان فارمیشن ٹیکنالوجی کے انقلابات نے ہم سے وہ جیتا جاگتا سکھ میں خوش ہوتا اور دکھ میں روتا، جذباتی انسان جھین لیا ہے جو شاید مستقبل میں بالکل ہی مٹا ہوا جائے اور کہیں سے برآمد ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ الیکٹرانک میڈیا کی یلغار سے پرنٹ میڈیا اثر پذیر ہو رہا ہے لیکن کسی بھی ملک میں الیکٹرانک میڈیا کی یلغار سے کچھ برس تو متاثر ہوتے ہی ہیں۔ یہ وقت کسی بھی ملک پر وہ برسوں سے بھی زائد ہو سکتا ہے۔ گزشتہ کئی برس قبل امریکا میں جب ٹی وی فوبیا نے امریکہ کے باسیوں کو چوبیس گھنٹے کے لئے جکڑ لیا تو عام سوالات یہ پیدا ہو رہے تھے کہ اب.....

☆..... اخباری دنیا یا صحافت کا کیا ہوگا؟

☆..... کیا ادب ختم ہو جائے گا؟ اس کے قارئین کسی میوزیم میں رکھ دیئے جائیں گے؟

☆..... اخلاقیات پر اس تبدیلی کا کیا اثر ہوگا؟

مگر کچھ ہی برس گزرنے کے بعد عام زندگی اپنی روش پر لوٹ آئی تھی۔ ویسی اخبارات، ویسی ادب، ویسی ضخیم کتابوں کا چلن، Best Seller سے لے کر ادب کی کتابوں تک۔ آہستہ آہستہ لوگ پورڈم کا شکار ہونے لگے اور اپنی پرانی دنیا میں واپس آ گئے۔

پاکستان میں میڈیا کی سرگرمیوں کو زیادہ عرصہ نہیں

محترم عارف صاحب! السلام علیکم! ”داستان ایک عامل کی“ کا اختتام کرنے کے بعد اپنے کچھ ضروری امور نبھانے کے لئے ”حکایت“ سے غیر حاضر ہوا تو قارئین کی فون کالز کا تانتا بندھ گیا۔ میں قارئین کا شکریہ ادا ہوں جو مجھے اس قدر پذیرائی بخشے ہیں۔ میرے سینے میں جتنی بھی کہانیاں ہیں وہ میں قارئین کی نذر کرتا رہوں گا۔ کچھ حضرات نے تنقید بھی کی، ان کا بھی شکریہ۔ میری کوشش یہی ہوگی کہ اصل کہانی کی دلچسپی کے ساتھ تعمیری پہلو بھی مد نظر رکھا جائے۔ اس طرح تفریح کے ساتھ تربیت بھی ہوتی رہے گی۔ والسلام
 مولانا محمد افضل رحمانی

گات کا پیلو

ہمارے معاشرے کے مہذب ڈاکوؤں کی شرمناک داستان

قسط: 1

0314-4652230

☆ مولانا محمد افضل رحمانی



نام میں دو الف ایک میم اور دو وال آتے ہیں۔

پھول اور کانٹا

ایک نوجوان جوڑا میرے پاس آیا دونوں میاں بیوی نے نہایت احترام سے مجھے سلام کیا میں نے سلام کا جواب دیا اور انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ لباس، چال و حال، انداز گفتگو اور رکھ رکھاؤ سے پتہ چلتا تھا کہ کسی اونچے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔

”مولانا صاحب! گاڑی بڑی ہونے کی وجہ سے ڈرائیور موڑ نہیں کاٹ سکا۔“ لڑکی نے نہایت مہذبانہ انداز سے کہا۔ ”لہذا ہم گاڑی کو سیم نالے پر ہی کھڑا کر آئے ہیں۔ ڈرائیور بچا رہا ہے اگر آپ برا محسوس نہ کریں تو ہم اپنا مسئلہ عرض کر لیں؟“

”دیکھیں بھئی، یہ تو میرے مریضوں پر منحصر ہے اگر وہ آپ کو اجازت دے دیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔

اسنے میں نوجوان نے ایک رقعہ میری طرف بڑھایا اور کہنے لگا۔ ”مولانا اچھی بات تو نہیں دے دیے اگر آپ رقعہ ملاحظہ فرمائیں تو آپ کی عین نوازش ہوگی۔“

میں نے جوں ہی رقعہ کھولا، رقعہ ایک مخصوص پیڑ کے درخت پر لکھا ہوا تھا میں نے سرنامہ دیکھا تو حیرت سے میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ لکھنے والے رئیس المفسرین، جامع المستوفی والمعتول، صاحب مدارج، بحر ذخار، شیخ القرآن، استاد العلما، مامی توحید و سنت، شیخ و استاذی محترم تھے جن سے میں نے دورہ تفسیر پڑھا تھا۔ میں بے اختیار کھڑا ہو گیا۔ میں جوں جوں عبارت پڑھتا جا رہا تھا میری آنکھوں سے آنسو آبشار کی شکل میں بے اختیار نکل رہے تھے۔ فرط جذبات سے میں نے رقعہ کو آنکھوں سے لگا لیا اور پھر اپنے جذبات کو اعتدال پر لانے کے لئے اندر کی طرف چلا گیا۔ رقعہ میرے ہاتھ

ڈاکو کو تو خیر آپ سب جانتے ہیں اس غیر مہذب کے ہاتھ میں کلاشکوف اور منہ پر نقاب ہوتا ہے۔ میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ آپ سے اس کی ملاقات ہوتی رہتی ہے لیکن بد قسمتی سے کئی لوگوں کو اس سے پالا پڑتا ہے گھر میں بھی اور گھر سے باہر بھی۔ وہ اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر اپنی قسمت پر شاکر ہو کر بلند آواز سے کہتا ہے تمہاری جیب میں جو کچھ ہے جلدی سے نکال دو ورنہ گولی سے اڑا دوں گا۔ اب اس کی قسمت کہ آپ کی جیب سے پانچ ہزار نکلتے ہیں یا صرف پانچ روپے۔ اگر دوسری صورت پیش آئے تو وہ قانع انسان پانچ روپے لے کر اپنی قسمت پر شاکر و صابر ہو کر آپ کے راستے سے ہٹ جاتا ہے اور پھر ہو سکتا ہے کہ ساری عمر اس سے آپ کی دوبارہ ملاقات نہ ہو۔

لیکن آج میں آپ کی ایک مہذب ڈاکو سے ملاقات کرانا چاہتا ہوں جس کے ہاتھ میں کلاشکوف تو نہیں ہوتی نہ منہ پر نقاب ہوتا ہے لیکن وہ آپ کو تلاش نہیں کرتا بلکہ آپ خود اس کو تلاش کرتے ہیں وہ قانع بھی نہیں کہ تھوڑی رقم پر قناعت کرے نہ وہ آپ کا بھی بھیا چھوڑتا ہے خواہ آپ مرکز قبرستان میں چلے جائیں۔ وہ رات کے اندھیرے میں نہیں بلکہ دن کی روشنی میں آتا ہے۔ چھپ نہیں بلکہ عیاں ہو کر آتا ہے۔ اکیلا نہیں بلکہ جم غفیر کے ساتھ آتا ہے۔ پتہ نہیں اس کے پاس کون سی جادو کی چھڑی ہے کہ آپ سمجھ ہو کر اسے پوری زندگی کا پس انداز کیا ہوا مالش خود اپنے ہاتھوں سے نکال کر پیش کر دیتے ہیں اور صرف آپ ہی نہیں میں خود بھی ان لوگوں میں شامل ہوں۔

غیر مہذب ڈاکو تو غریب سے صرف نظر کرتا ہے لیکن اس مہذب ڈاکو کو کسی کی غریبی سے کوئی تعلق نہیں۔ اب آپ مجھ سے اس کا اتنا پتہ پوچھیں گے لیکن میں اتنا جلد باز بھی نہیں کہ آپ کو فوراً ہی بتا دوں ویسے اس کے

شیخ رحمہ اللہ کے بارے میں مختلف سوال کئے اور شیخ رحمہ اللہ کی صحت اور معمولات کے بارے میں پوچھا وہ دونوں شیخ کے متعلق کافی معلومات رکھتے تھے۔ پھر میں نے آنے کا مقصد پوچھا تو نوجوان کہنے لگا۔ ہمیں حضرت جی نے عی آپ کے پاس بھیجا ہے پھر انہوں نے وضاحت سے اپنا مسئلہ بیان کیا۔ گاڑی کے پاس ایک لڑکے کی ڈیوٹی لگا کر ڈرائیور کو بھی بیٹھک میں بلا لیا تھا۔

بادرے کے میں ہمیشہ سے عی نازک مزاج واقع ہوا ہوں کسی بھی اچھی چیز کو دیکھ کر میرا دل کھل جاتا ہے لیکن کسی چیز میں ذرا سا نقص مجھے کھٹکنے لگتا ہے۔ مجھے پھول کے ساتھ کاٹنا بالکل اچھا نہیں لگتا۔ عموماً تو یہی کہا جاتا ہے کہ پھول کے ساتھ کاٹنا بھی ہوتا ہے لیکن بعض پھول بغیر کانٹے کے بھی ہوتے ہیں لہذا ہر پھول کے ساتھ کاٹنا ہونا کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہے۔ لہذا پھول کے ساتھ کانٹے والا محاورہ اچھا ہے۔ اب میں نے جب اپنی آنکھوں کے سامنے پھول کے ساتھ کاٹنا دیکھا تو میرے دماغ میں الارم بجتا شروع ہو گیا اور میری طبیعت میں انقلاب پیدا ہو گیا۔ کٹاری آنکھوں، چوڑی پیشانی، گھٹنہ یا گے بالوں، روئی کے گالوں کی طرح سفید چہرہ جس پر گلابی ہونٹ صنار عالم کی بے مثل صنائی کا نظارہ پیش کر رہے تھے۔ سرو قد تناسب الامضاء، گفتگو میں روانی کے ساتھ ملاحظت اور تلفظ کی اداسی نے اسے نسوانی حسن کا شاہکار بنا دیا تھا وہ چنبیلی کے پھول کی طرح تھی جس کے ارد گرد گلاب کی پتیوں کا حاشیہ لگا دیا گیا ہو۔ ظاہری حسن کے ساتھ ساتھ باطنی حسن کی مالک بھی تھی۔ دینی و دنیاوی علوم سے آراستہ روشن دماغ اور خوددار لڑکی تھی لیکن صاحب بہادر قمری ہیں سوٹ میں سرکس کے منظرے کی طرح نظر آ رہے تھے۔ اوپر کا دھڑلہ اور ٹانگیں ذرا چھوٹی تھیں جس کی وجہ سے پتلون انہیں سوٹ نہیں کر رہی تھی۔ شکل و صورت بھی بس واہجی سی تھی۔ ہونٹ بھدے اور

میں تھا اور آنسوؤں سے دامن تر ہو رہا تھا۔ میری بیوی نے دیکھا تو تڑپ کر میرے قریب آئی، خدا خیر کرے، اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

میں روتے میں ہنس پڑا اور جلدی سے کہا۔ ”شیخ کا رقعہ ہے، بس ذرا جذبات میں آ گیا ہوں۔“ اس دن پچہ چلا کہ خوشی کے آنسوؤں کے آنسوؤں سے بھی موئے ہوتے ہیں۔ شیخ کا بڑا پن دیکھتے وہ مجھے بر خودار بھی لکھ سکتے تھے جیٹا بھی لکھ سکتے تھے صرف نام بھی لکھ سکتے تھے لیکن انہوں نے جو انداز بیان اختیار فرمایا وہ ان کے بڑے پن کا واضح ثبوت تھا، لکھا تھا۔

”مولانا محمد افضل صاحب مدظلکم! حامل رقعہ ہذا ہمارا خادم ہے۔ ان دونوں کا مسئلہ غور سے سننا اور ان کی تسلی و تسفی فرمادینا۔ عزیزہ بچی جو اس کے ساتھ ہے اس کی بیوی ہے، بڑی خوددار لڑکی ہے، اگر وقت ہو تو اس سے اس کے حالات پوچھ لیتا اس کے ساتھ چلے آئے والا واقعہ سبق آموز اور شاذ بھی ہے۔ گلے پڑھنے کا آپ کو شوق ہے آپ کے کام آئے گا۔ دعاؤں میں یاد رکھنا، کسی وقت مل جائیں تو احسان ہو گا۔ فقط“

بازوق قارئین! اندازہ فرمائیں یہ ایک استاذ کا ایک ادنیٰ شاگرد سے اندازہ مخاطب ہے۔ وہ استاذ جن کی تقریر کی گمن گرج حکومت کے ایوانوں میں زلزلہ برپا کر دیا کرتی تھی۔ میں نے اس رقعہ کو سالہا سال تک محفوظ رکھا۔ میں اپنے دوستوں کو فخر سے دکھایا کرتا تھا اور جب یہ رقعہ مجھ سے گم ہوا تو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی احتیاتی فیسی چیز سے محروم ہو گیا ہوں۔ اب وہ نوجوان جو میرے لئے اہمیت اختیار کر گیا تھا۔ میں نے بیوی سے کہا کہ چائے پانی اور کھانے کا انتظام کرے اور ان دونوں کو اندر کمرے میں بلا لیا اور آرام کرنے کو کہا۔ مریضوں سے فارغ ہو کر جب میں ان کے پاس آیا تو وہ دونوں احتراماً کھڑے ہو گئے۔ میں نے انہیں بیٹھنے کو کہا اور پھر اپنے

”بالکل ٹھیک“۔ اس نے کہا۔ ”میں اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد ہوں اور بھائی بہنوں سے محروم ہوں۔ آپ کو بھائی جان کہوں تو مجھے آپ سے بھی بڑھ کر خوشی ہوگی۔ تو بھائی جان! میرا نام ستارہ شہزاد ہے۔ میرے پاپا مل اؤز ہیں۔ منہ میں سونے کا چھچھ لے ہوئے پیدا ہوئی، دنیا کی ہر نعمت اور آسائش میرے ہے۔ ذیل ایم اے ہوں۔ والد صاحب حضرت جی کے تعلق کی بناء پر دینی ذہن رکھتے ہیں۔ صوم و صلوة کے پابند اور شفیق و ہمدرد انسان ہیں۔ ان کی خواہش تھی کہ دنیوی علوم کے ساتھ ساتھ دینی علوم بھی حاصل کروں۔ اس مقصد کے لئے ایک عالم کا انتخاب کیا گیا جو مجھے گھر پر ترجمہ اور تفسیر اور ان سے متعلق دوسرے دینی علوم پڑھایا کرتی تھیں۔ اکثر حضرت جی کے دل میں بھی شامل ہوا کرتی تھی۔ کبھی کبھار حضرت جی ہمارے گھر تشریف لاتے وہ دن ہمارے لئے سعادتوں کا دن ہوتا۔ حضرت جی جب کبھی حق بولنے کی پاداش میں حاکمان وقت کے زیر عتاب ہوتے اور جیل میں ہوتے یا کبھی بیرونی من لک کے دوروں پر چلے جاتے تو ہم ان کی خیر و عافیت کے لئے دعا میں مشغول کرتے۔ ایک دن عشاء کے بعد پاپا نے مجھے کمرے میں بلایا، میں نے بھیجکتے ہوئے دروازے پر دستک دی۔

”ستارہ بیٹا آ جاؤ“۔ پاپا کی آواز میں اتنی اچنائیت تھی کہ میری سانسیں تڑپان ہو گئیں۔ ”بیٹا تشریف رکھیں میں آپ سے ایک ضروری بات کرنے والا ہوں، آپ اس وقت فارغ ہیں؟“

”جی پاپا!“

”دیکھو بیٹا! تم اب ماشاء اللہ جوان ہو گئی ہو، میں چاہتا ہوں کہ تمہاری شادی کر دی جائے۔ تمہاری کیا رائے ہے؟“

شرقی لڑکی ہونے کے ناطے میں پسینوں میں

ہاتھ پاؤں کی اگلیاں موٹی تھیں جس کی وجہ سے لمبائی بھی کم محسوس ہوتی تھی۔ چوتروں پر گوشت کم ہونے کی وجہ سے چٹون ڈھیلی ڈھالی تھی۔ میرے خیال میں اگر وہ شلوار قمیض پہنے ہوتے تو ان کے کئی جسمانی نقائص بادی النظر میں لگا ہوں سے پوشیدہ ہو جاتے۔

مجھے لڑکی کا ذوق سنگینی سا محسوس ہوا ورنہ وہ اسے لباس کے بارے میں مشورہ دے سکتی تھی۔ پھر میں نے سوچا لڑکی خوش باش ہے شاید اس کا آئیڈیل اسی طرح کا مرد ہو کیونکہ پسند ناپسند کا معیار مختلف ہوتا ہے۔ بہر حال میری نظر میں اگر اس جوڑے کا فرق زمین و آسمان جتنا بھی ہوتا تو میں خاموش رہتا لیکن یہ فرق زمین و آسمان کے فاصلے سے بھی کئی گنا زیادہ تھا۔ پھر مجھے ایک اور خیال آیا کہ شاید یہ لڑکا مالی طور پر مستحکم ہوگا اور دولت نے اس کے عیوب چھپا رکھے ہیں کیونکہ دولت بھی ماتحت الاسباب میں مشغول کشا اور حاجت روا ہوتی ہے۔ کسی نے شاید اسی لئے کہا تھا۔

میری غربت نے میری محبت کا اڑیا ہے مذاق تیری دولت نے تیرے عیب چھپا رکھے ہیں

محبت نہیں حادثہ

لڑکی کی چٹنی جس بلا کی تیز تھی وہ میرے چہرے کے اتار چڑھاؤ اور نظروں سے سمجھ گئی کہ میں ذہنی طور پر بد مزگی کا شکار ہو گیا ہوں۔

”مولانا صاحب! آپ جو کچھ محسوس کر رہے ہیں میں سمجھ گئی ہوں۔“ لڑکی نے کہا۔ ”اگر آپ کے پاس وقت ہو تو میں اپنے مختصر حالات آپ کو سنادیتی ہوں۔“

”میرے پاس کافی وقت ہے۔“ میں نے تجسس ہوتے ہوئے کہا۔ ”لیکن پہلے آپ اپنا مختصر تعارف کراؤ اور بجائے مولانا کہنے کے اگر آپ مجھے بھائی صاحب کہیں تو مجھے خوشی ہوگی۔“

حقیقت بھی یہی ہے۔ اس سے بڑی بیوقوفی اور کیا ہو سکتی ہے کہ جگہ میں رہنے والا محلات کے خواب دیکھے لیکن خوابوں پر تو کوئی پابندی نہیں ہر شخص کو حق حاصل ہے۔ خواب دیکھنے والا نہ مجرم ہے نہ گنہگار۔ دنیا کی سپر پاور کے پاس بھی یہ اختیار نہیں کہ وہ کسی کے خواب دیکھنے پر اس سے مواخذہ کر سکے۔ کسی ملک کے آئین میں بھی میرے خیال میں یہ شق نہیں ہوگی۔ سمجھڑوں کے خواب تو بلی کو بھی آتے رہتے ہیں.....

”دیکھو ستارہ! لمبی بات نہیں کروں گا۔ مجھے پتہ ہے میرا تمہارا کوئی جوڑ نہیں ہے لیکن تمہارے بغیر اس دنیا میں رہنا نرے بے وقوفی ہے اگر تمہیں ترس آ جائے تو اپنے بیمار کا علاج کرو دینا بصورتِ دیگر میں یا اپنی جان لے لوں گا یا تمہیں ختم کر دوں گا اور یہ اس لئے نہیں کہ خدا نخواستہ میں کوئی پیشہ ور قاتل ہوں۔ نہیں میں تو ایک چوٹی مارنے کا روادار بھی نہیں ہوں لیکن ہر قاتل کے پیچھے کوئی نہ کوئی انتہائی مجبوری ہوتی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ میں اپنی جان لینے کو ترجیح دیتا ہوں یا تمہاری جان لینے کو.....

تمہیں نہیں نہ کوئی محبت نامہ لکھتا چاہتا ہوں، نہ مجھے شعر و شاعری ہے کوئی لگاؤ ہے۔ سچی اور کھری بات کرتا ہوں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پہلے تمہیں قتل کروں اور پھر اپنی جان لے لوں۔ تمہیں بے گناہ کو مارنا اس لئے ضروری ہے کہ ہم اکٹھے اس جہاں سے اگلے جہاں کا سفر اختیار کریں تمہیں کسی اور کے سپرد کر کے اکیلے جانے کو جی نہیں چاہتا۔ اگر خود لکھ سکتا ہوتا تو کئی باتیں اور بھی تھیں لیکن مجبوری ہے اس سے زیادہ لکھوا نہیں سکتا۔ تمہارا بھولا!

بھولے کا رقعہ پڑھ کر میں پوری جان سے کانپ گئی۔ شاید ہی کسی لڑکی کو کبھی اس قسم کا محبت نامہ ملا ہو۔ بھولا میرے لئے کوئی اجنبی نہیں تھا بلکہ میرا چچا زاد بھائی تھا۔ میرا چچا اور پاپا ایک ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے

ڈوب گئی میرے لب جیسے سل گئے ہوں، دل کی دھڑکن تیز ہو گئی، میری سانسیں جیسے اکھڑ گئی ہوں۔ پاپا نے جب میری حالت دیکھی تو کہنے لگے۔

”دیکھو بیٹا اپنے آپ کو سنبھالو اگر تمہاری ماما زندہ ہوتی تو میں تم سے اس موضوع پر بات نہ کرتا ویسے بھی یہ کوئی ایسی بات تو نہیں کہ تم اتنی نروس ہو جاؤ۔ اچھا اب آپ اٹھ جائیں اور دیکھیں اس موضوع پر بات کرنے کے لئے اپنے آپ کو تیار کر لیں، اپنی پسند ناپسند سے بے دھڑک مجھے آگاہ کر دینا، اب کمزری ہو جائیں۔“

میں کمزری ہو گئی، پاپا میرے قریب آئے اور شفقت پوری سے میرا سر اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا اور بے در پے میرے سر کے پوسے لینے لگے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو بھرا آئے تھے۔ پھر انہوں نے ایک بند لفاظ میری طرف بڑھایا اور آہستہ سے کہنے لگے۔

”ستارہ بیٹا! ذرا اس کو کھول کر دیکھ لیتا۔“

میں اپنے کمرے میں آ گئی، میری زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا تھا۔ میں نے لفاظ کھولا ایک نوجوان لڑکے کی بلیک اینڈ وائٹ تصویر بینڈ پر گر گئی۔ میں نے تصویر دیکھی نوجوان بے کشش بھی تھا، سنجیدہ اور پُر وقار بھی لیکن اس کی آنکھوں میں شیطنیت تاجی صاف نظر آ رہی تھی۔ یمن برادری سے تعلق رکھتا تھا کسی امیر کبیر باپ کا بیٹا تھا۔ پاکستان کے ایک بڑے شہر میں رہتا تھا۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ، قد آور اور میری طرح ماں باپ کا اکلوتا تھا۔ میں نے اس کے کوائف دوبارہ پڑھے اور پھر غور سے تصویر دیکھنے لگی۔ مجھے ماما کی بڑی شدت سے یاد آئی اگر وہ زندہ ہو تو ان سے میں بے دھڑک مشورہ کر سکتی تھی۔

بھولا دودھ دینی والا

”ذیر ستارہ! لوگ مجھے بے وقوف کہتے ہیں اور

ہے؟ بھولا بغیر کچھ بولے میرے قدموں میں گر گیا اور بچوں کی طرح ہلکے ہلکے کر رونے لگا۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے اٹھایا اور جب وہ اٹھا تو اس نے روتے ہوئے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے اور کہنے لگا۔ ”ستارہ! خدا کی قسم میں مجبور ہوں۔ تمہارے عشق نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ میں انتہائی قدم اٹھانے پر تیار ہو گیا ہوں۔“

”دیکھو بھولے! میں تمہارے تایا ابو کی عزت ہوں۔ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”کیا تمہیں حق پہنچتا ہے کہ اپنی عزت اپنے ہاتھوں سے برباد کر دو۔ میں تو سمجھتی تھی کہ میرا حقیقی بھائی کوئی نہیں ہے پھر میں دل کو تسلی دے لیا کرتی تھی کہ کیا ہوا میرا حقیقی بھائی نہیں ہے بھولا جو میری عزت کا رکھوالا ہے۔ مجھے تم پر بڑا مان تھا لیکن تم غیروں سے میری عزت کی حفاظت کیسے کرو گے جبکہ تم خود ہی برباد کرنے پر تلے ہوئے ہو اپنی جان لے کر تمہیں کیا حاصل ہوگا۔ میری دعا ہے کہ اللہ تمہیں لمبی زندگی عطا کرے۔ بہتر یہ ہے کہ تم میری جان لے لو۔“ میں اٹھی اور سیف سے ريوالور نکال کر بھولے کو کہا۔ ”لو بھولے میرے جسم پر ريوالور سنگین خالی کر دو۔“

بھولے نے ريوالور ہاتھ میں پکڑا انگلی ٹریگر پر رکھی اور ريوالور کی نالی اپنی ٹانگی پر رکھ دی اس نے ٹریگر پر اپنی انگلی کا دباؤ بڑھایا، مجھے اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہوا اس سے خوشتر کہ میں آگے بڑھ کر بسل چھیننے کی کوشش کرتی بھولے نے ٹریگر دبا دیا۔ میری زبردست جھج بھند ہوئی اور ساتھ ہی ہلکی سی کلک کی آواز آئی۔ میگزین خالی تھی۔ بھولا جالی خولی نظروں سے ريوالور کو نکلے جا رہا تھا جبکہ میری باتیں جواب دے رہی تھیں۔ میں زمین پر بیٹھ گئی۔

”ستارہ! تمہارے سامنے مرنا تو میرے لئے عین سعادت ہے۔“ وہ انتہائی کرب کے ساتھ بولا۔ ”لیکن کیا کروں تمہارے عشق میں کڑھ کڑھ کر مرنا ہی شاید میرے

تھے لیکن پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں ویسے بھی اپنے اپنے مقدر کی بات ہوتی ہے۔ چاچا انتہائی غریب اور پاپا ترقی کرتے کرتے شہر کے امیر ترین لوگوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ میرے پاپا نے کئی دفعہ بھائی کی مالی مدد کی لیکن چاچو کی حالت نہ بدلی، اصل میں وہ علم سے محروم تھے۔ تقدیر کے قائل تھے لیکن تدبیر نہیں کرتے تھے۔

بھائی سے جو کچھ ملتا چند مہینوں میں اڑا دیتے۔ پھر ان کی اولاد جوان ہو گئی۔ میرے پاپا نے اپنی بھتیجیوں کی شادیاں اپنے خرچ سے کیں اور بچوں کو چھوٹے موٹے کام شروع کرائے۔ اب چاچو کے دن پھر گئے لیکن پاپا کہیں آگے نکل گئے تھے۔

بھولا نہ تو پڑھ سکا اور نہ کوئی ٹھنک کا کاروبار کر سکا۔ ایک دن میرے پاپا نے چاچو سے کہا کہ بھولا بالکل بیکار پھرتا ہے اور بُرے لڑکوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے تمہیں جتنے پیسے چاہئیں مجھ سے لے لو اور اسے کوئی دکان وغیرہ بنا دو۔ بھولا نہ تو پڑھا لکھا تھا نہ کوئی میٹیننگل کام جانتا تھا۔ آخر اسے ایک دوست نے مشورہ دیا کہ تم دودھ دہی کا کاروبار کر لو مکھ میں اور کوئی دکان نہیں ہے تمہارا کام خوب چلے گا۔ میرے پاپا نے ڈیڑھ لاکھ میں اسے دکان خرید کر دے دی۔ اس طرح وہ دودھ دہی کا کام کرنے لگا۔ کبھی کبھی ہمارے گھر آ جایا کرتا تھا لیکن میری کبھی اس سے تفصیلی بات چیت نہ ہوتی نہ کبھی اس نے محبت وغیرہ کا اظہار کیا نہ یہ بات میرے ویم وگمان میں تھی لیکن آج جب میں نے اس کا رقعہ پڑھا تو مجھے یقین ہو گیا کہ بھولے نے جو کچھ لکھا ہے ایک ایک خط حقیقت پر مبنی ہے وہ کسی بھی وقت کچھ بھی کر سکتا تھا۔ میں نے اس سے زبانی بات کرنے کا ارادہ کر لیا۔

اس دن میں گھر پر اکیلی تھی پاپا کسی اہم میٹنگ میں گئے ہوئے تھے۔ میں نے بھولے کو گھر بلایا اور بغیر کسی تمہید کے پوچھا۔ بھولے یہ رقعہ لکھنے کا تمہارا کیا مقصد

- Quality
- Reliability
- Efficiency

Starco FANS

بس یہی ہے بخروسہ

خریداری کے وقت دھوکے کا نقصان

بجلی کے بل سے ہمیشہ پریشان

ہوئے سارے لوگوں کو ساری دھوکے سے (EES) آپ کو جاننے سے قبل اس بات پر
کچھ خریدتے وقت دھوکے میں نہ آئیں کہ وہ جو بیرونی

یو ایس ڈی ایس کے ساتھ

9001:2008 (ISO-14001)

PSQCA کے ساتھ CE کے ساتھ



U.I Industries (P) Ltd., SMALL INDUSTRIES ESTATE, Gujrat-Pakistan
Phone: +92 33 3535001 Q2, +92 33 3521494 95 Fax: +92 33 3511307
website: www.starco.com.pk Email: info@starco.com.pk
www.starcolines.com Email: starcolines2011@gmail.com
www.facebook.com/starcolines

ہی جوان عورت کی علیحدہ علیحدہ پوز میں کھینچی مٹی تصویریں تھیں۔ ایک تصویر میں وہ خوبصورت عورت مسکرا رہی تھی جب کہ دوسری سنجیدہ اور پُر وقار دکھ رہی تھی۔ پھر میری تجسس نگاہیں ایک خط کی عبارت پر پھرنے لگیں۔

”جان سے پیارے عظیم! آپ یقین کریں مجھے آپ کی دولت سے کوئی سروکار نہیں۔ اگر آپ غریب بھی ہوتے تو بھی میری محبت کی شدت اسی قدر ہوتی، دراصل آپ کی شخصیت مجھ پر بڑی طرح سے چھا گئی ہے۔ ستارہ کی سبوروگی میں آپ بے شک مجھے گھرنے لائیں لیکن آپ مجھ سے شری نکاح تو کر سکتے ہیں۔ اس طرح میں خود کو محفوظ محسوس کروں گی۔ آپ جیسے سلجھے ہوئے سنجیدہ اور خوف خدا رکھنے والے انسان سے دھوکے کی امید تو نہیں کرتی لیکن انسان کا دل جیج کے پر کی طرح ہے جو ایک پھیل میدان میں پڑا ہو اور وہ ہوا کے ذرا سے جمونکے سے الٹ پلٹ جاتا ہے۔“

پھر میں نے کئی خط پڑھے۔ یہ ایک غیر اخلاقی حرکت تھی۔ میرے ذہن میں ایک دانشور کا قول پھرنے لگا کہ آپ کبھی بھی اپنے والدین کی نفی اور ذاتی زندگی میں جھانکنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ آپ کو شرمندگی اٹھانی پڑے گی۔ میرے پاپا ایک عورت سے نکاح کر چکے تھے۔ وہ عورت نہیں لڑکی تھی، نابادہ سے زیادہ مجھ سے چند سال بڑی ہوگی لیکن خطوط پڑھ کر مجھے پاپا کی پاکدامنی اور اصول پسندی صاف نظر آ گئی۔ نکاح کرنا پاپا کا حق تھا، وہ ابھی بوڑھے تو نہیں تھے گو پچاس کے پینے میں تھے لیکن پُر وقار اور وجہ شخصیت کے مالک تھے۔ اچھی صحت کے مالک ہونے کی وجہ سے اپنی عمر سے کہیں کم نظر آتے تھے۔

ماما میں ستارہ بول رہی ہوں

فون کی کھنٹی بجی، میں نے ریسورکان سے نکایا۔ ”ہیلو!“ پیاری سی آواز ابھری۔

”مقدر میں ہے۔“
”دیکھو بھولے! میں نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ تم اپنے آپ کو ختم کر لو، میں نے تو کہا تھا کہ مجھے اپنے ہاتھ سے مار ڈالو۔“

”نہیں میں تمہیں کبھی نہیں ماروں گا۔“ اس نے رندھی آواز میں کہا۔ ”بھولا تمہیں مارے گا کبھی خیال بھی دل میں نہ لانا۔“
”لیکن میں تمہارے ہاتھوں مرنا چاہتی ہوں۔“
”کیوں؟“

”اس لئے کہ مجھے اپنی جان سے پاپا کی عزت زیادہ پیاری ہے۔“ اور پھر میرے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے۔ زندگی میں یہ دوسرا موقع تھا کہ میری آنکھوں میں ساون لڈ آیا۔ ماما کی وفات پر بھی برعکاس اس زور سے برسی کہ میرا دامن تر ہو گیا تھا۔ بھولا آگے بڑھا میرے سر سے دوپٹہ اتر گیا تھا۔ اس نے دوپٹہ میرے سر پر کھانکھارہ بولا تو اس کی آواز رندھ گئی تھی۔ اس نے آسمان کی طرف نظر اٹھائی منہ ہی منہ میں پتہ نہیں کیا کہا اور پھر مستحکم لہجے میں بولا۔

”ستارہ! دوپٹہ اوڑھ لو تا یا ابو کی عزت صرف تمہیں ہی نہیں مجھے بھی جان سے پیاری ہے۔“ اور پھر وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا باہر چلا گیا۔

حیران کن انکشاف

میں لڑکھڑاتی ہوئی انھی لیکن ٹائٹلیں میرا بوجھ اٹھانے سے قاصر تھیں۔ میں قریبی صوفے پر بیٹھ گئی۔ ذرا دیر بعد میرے حواس بحال ہوئے، میں نے رپوالور دیکھی سے اٹھایا اور واپس سیف میں رکھنے لگی کہ اچانک ایک بھاری لفافہ سیف کی فلیٹ سے میرے قدموں میں گر پڑا۔ لفافے میں رکھے کئی خطوط اور ایک دو تصویریں باہر نکل آئی تھیں۔ میں نے تصویروں کو فور سے دیکھا وہ ایک

”جی، ماما! میں ستارہ بول رہی ہوں۔“

”کون ستارہ؟“

”وقار عظیم کی بیٹی۔“

”کون وقار عظیم؟“

”شہر کے معروف مل آؤز۔“

”دیکھو بھائی نمبر غلط مل گیا ہے۔“

”نہیں ماما نمبر غلط نہیں ہے، براہ کرم فون بند نہ

کرنا۔“

”لیکن میں کسی وقار عظیم اور ستارہ کو نہیں جانتی۔“

”ماما پلیز! میری بات سنیں۔“ میں نے التجا کی۔

”میں آپ کو ابھی سمجھا دیتی ہوں لیکن ماما اس میں میری

کوئی غلطی نہیں ہے، بس اتفاقاً بابا کا سیف کھلا ہوا تھا،

میں اس میں کوئی چیز رکھ رہی تھی کہ اچانک میری پیاری ماما

کی دو عدد تصویریں اور ڈھیر سارے خطوط نیچے کر گئے۔

ماما! واقعی آپ اتنی ہی خوبصورت ہیں جتنی تصویر میں نظر

آتی ہیں؟“ دوسری طرف مکمل خاموشی تھی۔

”ماما! پھر میں نے چند خطوط پڑھے یہ غیر اخلاقی

حرکت ہے، میں مجھ سے کیوں سرزد ہو گئی۔ شاید انسانی

فطرت مجھس واقع ہوئی ہے لیکن میں نے حد سے تجاوز

نہیں کیا بس مطلب کی بات تک ہی محدود رہی۔“

”ٹھیک ہے ستارہ! میں اب انکار نہیں کروں گی۔“

آواز آئی۔ ”کیا تمہیں کوئی اعتراض ہے؟“

”ہرگز نہیں ماما! مجھے تو خوشی ہوئی ہے۔“ میں نے

کہا۔ ”دیکھو ماما! یہ بات میرے اور آپ کے درمیان ہی

رہے نہ آپ بابا سے ذکر کریں اور میرا تو سوال ہی پیدا

نہیں ہوتا۔ ہاں، البتہ میں جلد از جلد آپ سے ملنا چاہتی

ہوں۔“

”ٹھیک ہے، بیٹا اس میں کیا حرج ہے۔ کیا خیال

ہے کل ہو جائے پروگرام؟“

”ٹھیک یو ماما!“ میں نے دل میں سوچا بابا آپ تو

چھپے رستم نکلے اگر مجھے بھی مشورے میں شامل کر لیتے تو

بس حیرت ہی آ جاتا۔

”ستارہ بیٹا! کیا سوچ رہی ہو، خاموش کیوں ہو؟“

ماما نے بڑی اہمیت سے کہا۔

”کچھ نہیں ماما! سوچ یہ رہی ہوں کہ کون سا بہانہ

چلے گا۔“

”اچھا ٹھیک ہے تم کوئی معقول سا بہانہ سوچ لو اور

کل میں ہوٹل میں شدت سے تمہاری خنجر ہوں گی۔“

”اوکے ماما!“ میں نے جوش بھری آواز میں کہا۔

رات کو میں نے بابا کے دروازے پر ہلکی سی دستک

دی۔ ”ستارہ بیٹی آ جاؤ، میں اندر داخل ہوئی تو بابا نے

خطوط سمیٹ کر سر ہانے کے نیچے دکھ دیئے اور ننگے پاؤں

بند سے نیچے اتر کر کھڑے ہو گئے اور میری طرف بڑھے مجھے

کندھوں سے پکڑ کر میری پیشانی پر پیا لیا اور کہنے لگے

زبے نصیب آج ہماری ستارہ کیسے نازل ہو گئی اور پھر

انہوں نے بے ساختہ قبچہہ لگایا اور کہنے لگے آؤ میں بیٹا

آؤ میں کیا آج کوئی خاص بات ہو گئی۔

”جی نہیں کوئی خاص بات تو نہیں دراصل مجھے چند

سہیلیوں نے گل ڈنڈر پر بدعو کیا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں

آپ سے اجازت لینے کے لئے آئی ہوں۔“

”ٹھیک ہے بیٹا! لیکن میں کل بالکل فارغ نہیں

ہوں، آپ کو ڈرائیور کے ساتھ جانا پڑے گا۔“ بابا نے

کہا۔ ”لیکن اگر تھوڑا سا بھی وقت ملا تو تمہیں خود ڈراپ

کر دوں گا۔“

”نہیں بابا! میں ڈرائیور کے ساتھ چلی جاؤں گی،

بس صرف آپ کی اجازت چاہئے۔“

”اجازت ہے، اجازت ہے، اجازت ہے لیکن

دیکھو کسی دن اپنی سہیلیوں کو جوابی ڈنڈر بھی دینا ہوگا۔“ بابا

نے کہا۔ ”اور یہ ہمارا آرڈر ہے۔“

”ٹھیک ہے بابا!“

سچی باتیں

☆ اللہ اُن کو دوست رکھتا ہے جو دوسروں پر رحم کرتے ہیں، احسان کرتے ہیں اور ان کی بھلائی چاہتے ہیں۔ (القرآن)

☆ اللہ تعالیٰ اُس شخص پر رحم نہیں کرتا جو لوگوں پر رحم نہیں کرتا۔ (المحدث)

☆ عقل محدود ہے جو دوسروں کی نصیحتیں سنتا ہے۔ (حضرت سلیمان)

☆ اگر تم لوگوں کے قصور معاف کرو گے تو اللہ تمہارے قصور معاف کرے گا۔ (حضرت ادریس)

☆ تین چیزیں محبت برحمانے کا ذریعہ ہیں: (1) سلام کرنا (2) دوسروں کے لئے نیک کلمے میں جگہ خالی کرنا (3) مخاطب کو بہترین نام سے پکارنا۔

(حضرت عمر فاروق)

☆ خاموشی غصے کا بہترین علاج ہے۔ (حضرت عثمان غنی)

☆ کسی پر احسان کرو تو اس کو چھپاؤ اور اگر تم پر کوئی احسان کرے تو اسے ظاہر کرو۔ (حضرت علی)

☆ محمد زہیر - لاہور

نے اسے چائے وغیرہ کا آرڈر دیا۔ تھوڑی دیر بعد ملازمہ لوازمات سے بھری ٹرالی لے آئی۔ میں نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔ ”ماما ایک بات کروں، آپ بُرا تو نہیں محسوس کریں گی؟“

”ستارہ! تم کیسی باتیں کرتی ہو، بھلا میں اپنی ستارہ کی بات کا بُرا محسوس کروں گی؟“

”تو پھر ہو جائے لو سُوری“۔ میں نے مسکراتے ہوئے جلا جھبک کہا۔

ماما نے زوردار تہقید لگایا اور پھر میرے کال پر پینا۔

”بیموگی نہیں۔“

”نہیں پاپا! مجھے زور کی فینڈ آرہی ہے۔“ میں نے

کہا۔ ”اور پھر میں نے چھوٹی موٹی تیاری بھی کرنی ہے۔“

”ٹھیک ہے بیٹا، خدا حافظ!“

میں نے احتیاط کی بنا پر ڈرائیور کو ہوٹل سے کچھ دور

ہی رکنے کا اشارہ کیا اور خود پیدل چلتی ہوئی ہوٹل تک

پہنچی۔ ماما ہوٹل کے دروازے پر میری منتظر تھیں۔ سلام

اور آداب کے بعد ماما نے مجھے سینے سے لگا کر اس زور

سے بھیچا کہ بس مزہ ہی آ گیا۔ ماما کے سینے سے پیار کی

مقتناطیسی لہریں میرے سینے میں رایت کرتی چلی گئیں میرا

سینہ ٹھنڈک سے بھر گیا۔

”ماما! پاپا سے ٹھکس ہیں۔“ میرے دل سے آواز

آئی کیونکہ ارواح میں موافقت ربیعہ مسکونہ میں آنے سے

سے پشتر ہی رکھ دی گئی تھی۔ ماما کی شخصیت میری روح

کی گہرائیوں میں اتر گئی۔

”ستارہ بیٹا! کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ بجائے ہوٹل کے

ہم اپنے گھر چلے جائیں اور وہاں گپ شپ کریں؟“

”ٹھیک ہے ماما! جیسے آپ کی مرضی۔“ ہم ہوٹل

کے پارکنگ میں آ گئے۔ ماما نے ڈرائیور کو اشارہ کیا چاک

و چونڈ ڈرائیور نے گاڑی کو پورس کیا اور پھر لی سے

گاڑی سے باہر نکلا اور ہمارے لئے کار کا پچھلا دروازہ

کھولا جب ہم گاڑی میں بیٹھ گئیں تو ڈرائیور نے سنیئر تک

سنجبالا اور گاڑی کو نہایت احتیاط سے منزل مقصود کی

طرف موڑ دیا۔ ماما نے اپنا دایاں ہاتھ میری تھوڑی کے

نیچے رکھ کر میرا چہرہ اوپر اٹھایا پھر شفقت سے اپنے ہونٹ

میرے کال سے مس کر دیئے۔ ماما کی خوشگوار سانسوں کی

مہک میرے دماغ سے ٹکرائی تو میرے من میں جیسے کلیاں

چل گئی ہوں۔ گاڑی ایک شاندار کوشی کے گیٹ پر رکی۔

ہم گاڑی سے باہر نکلیں ماما مجھے لئے ہوئے ایک شاندار

ڈرائنگ روم میں آئیں۔ ملازمہ دوڑتی ہوئی آئی۔

میرے پاپا کو ظالموں نے قتل کر دیا تھا۔ ساتھ والے کمرے میں میرے پاپا کی لاش پڑی تھی اور ظالم دوسرے کمرے میں میرے ساتھ درندگی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ وہ چار تھے، سفاک قاتل، بے رحم ڈاکو انہوں نے پاپا کو قتل کیا۔ مال لوٹا، میری عزت لوٹی، ملازم کو زخمی کیا اور چلے گئے۔ نہ قانون کے لیے ہاتھ ان تک پہنچے، نہ آسمان ان پر مگر نہ زمین نے انہیں نکالا۔ میڈیکالوں نے ہسپتال میں میری تصویریں کھینچیں اور پورے ملک کو میری داستان الم سنا ڈالی۔ انہیں سنسنی خیز خبر ملی۔ ”ظالموں کو بہت جلد قانون کے شکنجے میں کس دیا جائے گا“ درباب اختیار کے رکھی بیان آئے۔ این جی اوز نے وہی مجھے پٹے بیان دیئے، واعظان شہر نے جمعہ کے خطبات میں جذباتیت کے مظاہرے کئے قرار وادیں پاس ہوئیں اور پھر جلد ہی یہ واقعہ قصہ پارینہ بن گیا۔

اور پھر ایک دن مجھے ڈاک سے ایک خط ملا میں نے پڑھا۔ لکھا تھا۔ ”جنا مجھے افسوس ہے میں تمہارے ساتھ شادی نہیں کر سکتا، جس لڑکی کو چار مرد پامال کر چکے ہوں اس کے لیے اب کیا رہ گیا ہے۔ یہ میرے مگھیر کا خط تھا۔“

”بس کریں ماما! خدا کے لئے رہنے دیں۔“ میری ہچکیاں بندھ گئیں، میں نے دونوں بازو ماما کے گلے میں جامل کر دیئے۔ چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی ویسے بھی اس جیسے غمگین ماحول میں چائے کے کھونٹ زہر کی مانند تھے۔ ماما نے نشو و نما سے میرے آنسو خشک کئے اور مجھے سینے سے لگا کر خوب بھینچا اور پھر مسکراتی ہوئی کہنے لگیں۔

”ستارہ میری جان! تم تو بہت ہی کمزور اعصاب کی مالک ہو، بس اب اس بات کو مت سوچنا اب میں تم کو ایک ایسی بات بتانے والی ہوں جس نے مجھے سب کچھ

سے ہلکی سی چپٹ لگا اور پھر کہنے لگیں۔ ”برری بات، کوئی اور بات کرتے ہیں۔“

”نہیں ماما! میں نلنے والی نہیں ہوں، بس آپ جلدی سے شروع ہو جائیں۔ ہاں اتنی رعایت کر سکتی ہوں کہ آپ تفصیل میں نہ جائیں میں بس ہیڈ لائنز پر ہی گزارہ کر لوں گی۔“

”تو سنو۔“ ماما نے کہنا شروع کیا۔

”آپ کے پاپا پنڈت، مخلص، دیانتدار، اصول پسند، صوم و صلوة کے پابند، ایماندار، خدا ترس اور محبت کرنے والے انسان ہیں۔ بس وہ مجھ سے شادی کرنے پر رضامند ہو گئے۔“

”ماما! یہ کیا بات ہوئی ان میں اتنی خیریاں گنا کر تو آپ کو رضامند ہونا چاہئے تھا۔“

”ہاں، ستارہ! انہوں نے مجھے قبول کر لیا۔ یہ ان کا بول چال ہے۔“

”پھر آپ میں کیا خرابی تھی؟“

”مجھ میں بذات خود خرابی نہیں تھی۔“ ماما نے بتایا۔ ”لیکن میں بھیا ایک حالات کی بھینٹ چڑھ گئی تھی۔ میں بے گناہ ہو کر بھی معاشرے کی نظروں میں گنہگار تھی۔ مجھے ناکردہ گناہ کی سزا مل گئی تھی۔ میں بغیر گناہ کے مجرم بن گئی تھی، عورت تھی ناں۔“

”عورت ہونا کوئی جرم تو نہیں، کیا خود میں خدا کی مخلوق نہیں ہیں؟“

”ستارہ بیٹا! عورت ہے تو خدا کی مخلوق لیکن عورت ہونا ایک جرم ہے۔“ ماما نے کہا۔ ”مرد گناہ کر کے بھی پاک ہوتا ہے مگر عورت گناہ نہ کر کے بھی ناپاک سمجھی جاتی ہے اور اُسے ناپاک بھی مرد ہی کرتا ہے اور پھر اُس سے نفرت کرنے والا بھی مرد ہی ہوتا ہے۔“

”میں کبھی نہیں ماما!“

”ستارہ بیٹا! میں گینگ پر کا شکار ہو گئی تھی

اس کے جذبات کی خبر تک بھی نہیں ہے۔ میرے ذہن میں حالات و حوادث محبت کو جنم دیتے ہیں۔ یہ ہونٹیں جاتی، کی جاتی ہے۔

”لیکن میں نے تو سنا ہے کہ محبت کی نہیں جاتی ہو جاتی ہے۔“ ماما نے متذبذب ہوتے ہوئے کہا۔

”ماما! آپ نے غلط سنا ہے میں یہ کلیہ ماننے کے لئے جانا نہیں ہوں۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے۔

میں تو شبنم تھی، پھیلی پہ تری کم ہو مٹی وہ ستارہ تھی سو تیرے حیرت پر سچ مٹی شبنم کو چھوڑ کر ستارہ کو اپنا لیا اگر دل کو دل سے راہ

ہوتی تو شبنم کو چھوڑ کر ستارہ کی طرف کیوں جاتا لوگ شعر صرف پڑھتے ہیں سمجھتے نہیں۔

”ماما! کسی دل کو دل سے راہ نہیں ہوتی، سب فضولیات ہیں۔“

شہر وفا میں دھوپ کا ساتھی کوئی نہیں۔ سورج سروں پہ آیا تو سائے بھی گھٹ گئے دیکھو ماما! کوئی یوں بھی کہتا ہے۔

ٹوٹا ہوا کچھ نہیں لگتا مگر جان حیات! جانے کیوں تیرے لئے دل کو دھڑکنا دیکھوں وہ کسی اور کو ذہن میں بٹھا کر لے گیا، کسی کا صرف

دل ہی دھڑکتا رہ گیا۔ اسی لئے لڑکیوں کے دکھ عجیب ہوتے ہیں، بلکہ اس سے عجیب

نہیں رہی ہیں اور کاہل بھیگتا ہے ساتھ ساتھ پھر ساری عمر منافقانہ زندگی گزارتی اور کرب و

طرب سے گنتاتی پھرتی ہیں۔

اب کون سے موسم سے کوئی آس لگائے برسات میں بھی یاد نہ جب ان کو ہم آئے

اس لئے ماما میں محبت وغیرہ کی قائل نہیں ہوں میں کسی کے سبب تو جاؤں گی اب بھولا راتوں کو تارے گئے،

خودکشی کرے اس میں میرا کیا قصور؟ میں نے تو اسے نہیں

سوالیہ نظروں سے ماما کی طرف دیکھنے لگی۔

”دیکھو، ستارہ! میں بھی ہمت ہار گئی تھی لیکن پھر ایک زندہ جاوید جذبے نے مجھے حوصلہ دیا اور میرے مردہ

جسم میں روح پھونک دی مجھے جینے کا حوصلہ دیا۔ میں نے خواب آور گولیوں کی شیشی ٹالی میں پھینک دی اور دل

میں ہد کر لیا کہ اب میں زندہ رہوں گی مجھے ایک میخا مل گیا تھا اور ایک زندہ جاوید جذبہ جو مردہ دلوں میں زندگی

کی ترنگ پیدا کرتا ہے۔“

”ماما! وہ جذبہ کیا تھا؟“

”ستارہ! محبت۔“

”محبت؟“ میں نے چونکتے ہوئے کہا۔

”ہاں، ستارہ! محبت۔“ ماما نے غور آنکھوں سے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

”لیکن ماما محبت تو.....“

”ہاں ہاں، کہو۔“

”ماما! محبت تو ایک فضول چیز ہے، یہ مردہ جسم میں روح نہیں پھونکتی بلکہ زندہ جسم سے روح نکال دیتی ہے۔“

”دیکھو ستارہ! تمہیں اپنا موقف بیان کرنے کے لئے دلیل دینی ہوگی۔“

”ٹھیک ہے ماما!“ اور پھر میں نے بھولے والا واقعہ ماما کو سنا دیا۔

”ماما بھولے کی محبت نے تو میری روح تک ہلا دی ہے۔“

”ستارہ! کیا تم نے اس کے بارے میں کبھی سوچا ہے؟“

”ایک منٹ کے لئے بھی نہیں۔“ میں نے دونوں الفاظ میں کہا۔

”کیا تم اس بات پر یقین رکھتی ہو کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے؟“

”ہرگز نہیں ماما!“ میں نے کہا۔ ”اس سے بڑا

بھٹ اور ہو ہی نہیں سکتا جو حالت بھولے کی ہے مجھے تو

رائدہ درگاہ کیوں نہیں ہوتا جبکہ عورت کی عزت کوئی جبراً لوٹ لے تو بھی وہ رائدہ درگاہ کیوں ہو جاتی ہے۔ طعنہ دینے والے، بیٹی، ماں، بہن کا ہی طعنہ کیوں دیتے ہیں۔ بیٹے، بھائی اور باپ کا طعنہ کیوں نہیں دیتے۔ جی گناہ کرے تو سات پائیس تاپاک ہو جائیں، بیٹا گناہ کرے تو باپ کو شرم تک نہ آئے بلکہ فخر کرے کہ میرے بیٹے نے کوئی بڑا کارنامہ انجام دیا دے دیا ہے۔ حالانکہ گناہ گناہ ہے اس میں تذکیر و تائید کی کوئی تفریق نہیں ہے۔ رب تعالیٰ فرماتے ہیں۔ ترجمہ: زانی عورت ہو یا زانی مرد ہر ایک کو سزا دے لگاؤ۔

جب اللہ نے دونوں جنسوں کو گناہ میں برابر کا مجرم تسلیم کیا ہے تو پھر کسی کو کیا حق ہے کہ ایک کے جرم کو بہت بڑا اور ناقابل معافی جرم سمجھے اور دوسرے کے جرم کو ہلکا بلکہ قابل فخر سمجھے۔ جبکہ زنا بالجبر میں متاثرہ فریق کو قرآن مجرم ہی نہیں سمجھتا۔

”پھر مجھے کس جرم کی سزا دی گئی؟“ ماما نے گلوگیر آواز میں کہا۔

”ماما! صرف عورت ہونے کی۔“ میں نے دوا لکھ الفاظ میں کہا۔

”ستارہ! تم محبت کی واقعی قائل نہیں ہو۔“ یہاں میں نے ستارہ کی کہانی روک کر اس سے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں، بھائی جان! میں لڑکیوں، لڑکوں کی جذباتی اور لائٹہالی محبت کی قائل نہیں ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”میاں بیوی کی محبت کی ضرورت قائل ہوں۔“

”کیا جہیں اپنے میاں سے محبت تھی؟“

”نہیں۔“ اس نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

”پھر تم نے شادی کیوں کی؟“

”بھائی جان! ان سے شادی ایک حادثہ تھا لیکن

کہا تھا کہ میرے عشق میں خوار ہوتا پھرے یا پھر دل کو دل سے راہ ہوتی تو میرا دل بھی اس کی طرف مائل ہو جاتا لیکن ادھر تو بھولے کا نام و نشان بھی نہیں۔“ میں نے اپنے دل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”یہ تو وہی بات ہوئی! مان نہ مان میں تیرا مہمان ماما میری پیاری ماما اگر خدا نخواستہ اس دن پستول لوڈ ہوتا تو بھولے کی موت میرے اور میرے پاپا کے لئے ہزار رسوائی کا باعث بنتی۔ اچھا ماما ایک بات بتائیں۔“

”جی بیٹا! پوچھو۔“ ماما نے گہری سوچ سے چوکھٹے ہوئے کہا۔

”آپ کے منگھیر کو آپ سے محبت تھی؟“

”ہاں، بیٹا! اس کا کہنا تو یہی تھا وہ تو کہا کرتا تھا۔“

یہ کالی بھوری آنکھیں

”یوں لگتا ہے شام نے رات کے ہونٹ پہ اپنے ہونٹ رکھ دیئے ہیں۔“

”تمہاری آنکھیں، اتنی اچھی، اتنی بچی ہیں! اس حسن اور سچائی کے سوا، دنیا میں کوئی چیز نہیں۔“

اور میں بہت کمبو جو میں جہیں سنا نہیں سکتی۔

”ماما! کیا آپ سمجھتی ہیں وہ ٹھیک کہتا تھا؟“

”ہاں بیٹا! اس وقت تو میں یہی سمجھتی تھی۔“

”کیا اس کے یہ سب دعوے، وعدے صحیح نکلے؟“

”نہیں بیٹا! میں تو سمجھتی ہوں یہ سب جھوٹ تھا۔“

”نہیں، ماما! یہ سب سچ تھا۔“ میں نے کہا۔

”پھر اس نے ایسا کیوں کیا جب کہ اسے یہ بھی تھا کہ میں نے اپنی رضا سے یہ سب کچھ نہیں کیا بلکہ مجھ پر ظلم نہیں ستم ہوا ہے۔“ ماما نے سوال کیا۔

”ماما! صرف اس لئے کہ وہ مرد تھا۔ جب عورت کو مرد کی نفسیات سمجھ آ گئی تو سمجھ لینا کہ اسی دن عورت وجود میں آ گئی ہے۔ مرد کسی عورت کی عزت سے کھیلے تو وہ

اب میں ان سے محبت کرتی ہوں۔“

”کیوں؟“

”اس لئے کہ محبت ہو نہیں جاتی کی جاتی ہے۔“ وہ اپنے موقف پر بدستور قائم تھی۔

”کیا یہ بہت زیادہ امیر ہیں؟“

”نہیں بھائی جان! بہت زیادہ غریب تھے۔“

”کیا یہ آپ کو اچھے لگے؟“

”نہیں، یہ آپ کے سامنے ہیں، آپ خود دیکھ کر فیصلہ کر لیں۔“

”ان کی تعلیم کتنی ہے؟“

”مڈل کلاس ہے۔“ ستارہ نے تھوڑا سا ہنستے ہوئے کہا۔ ”لیکن اب بی اے کی تیاری میں خود انہیں کر رہی ہوں۔ ایف اے کر چکے ہیں۔“

”نہ تعلیم، نہ حسن، نہ چہرہ۔“ میں نے صاف گوئی سے پوچھا۔ ”پھر ان میں کیا کمال ہے؟ معاف کرنا کرتی جیسی امیر، تعلیم یافتہ اور خوبصورت لڑکی ان سے شادی کرنے پر تیار ہو گئی؟“

”تیار نہیں ہو گئی بلکہ شادی کر لی۔“ ستارہ نے ایک بھر پور قبضہ لگایا۔

صاحب بہادر ہونٹوں کی طرح ہمیں دیکھ رہے تھے پھر بے سُرئی سی ہنسی ہوتے ہوئے بھدی اور بھاری آواز میں کہنے لگے۔

”مولانا صاحب! آپ کو ستارہ سے یہ سوال نہیں کرنا چاہئے آپ ماشاء اللہ تعلیم یافتہ نوجوان ہیں ہمارے حضرت صاحب کے شاگرد بھی آپ کو ہم سے زیادہ پتہ ہے کہ جوڑیاں آسمان پر بنتی ہیں زمین پر نہیں۔“

”ہاں صاحب! یہ تو ٹھیک ہے لیکن یہ جاننے میں تو کوئی حرج نہیں کہ یہ ناقابل یقین واقعہ پیش کیسے آ گیا؟“

ستارہ ایک بار بھر زور سے ہنسی اور پھر ہنستی چلی

گئی۔ وہ سنجیدہ سنجیدہ ہی نظر آنے والی شوخ و شنگ لڑکی کا روپ دھار گئی۔ میں سمجھ گیا کہ اس کی پھٹی حس کے ساتھ ساتھ حس مزاح بھی کافی تیز ہے اس نے دوپٹے کے پلو سے آنکھوں میں آنے والے پانی کو پونچھا اور پھر کہنے لگی۔

”بھائی جان! محبت کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟“

”دیکھو بھئی، محبت کے بارے میں میں تمہارے خیالات سے متفق ہوں لیکن محبت کرنی ضرور چاہئے بس تاہنگ کا خیال رکھنا ضروری ہے۔“

”کیا مطلب ہے؟“

”مطلب یہ کہ محبت شادی سے پہلے نہیں شادی کے بعد اپنے شوہر سے کرنی چاہئے لیکن تمہارے نظریے سے تھوڑا سا اختلاف کروں گا۔“

”ہاں، آپ کو حق حاصل ہے۔“ اس نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

”دیکھو، ستارہ! محبت صرف کی سی نہیں جاتی ہو گئی جاتی ہے۔“

”جیسی اپنے آپ؟“ اس نے اختلافی لہجہ میں کہا۔

”ہاں، اپنے آپ۔“ میں نے ہاں پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”مجھے تو کبھی محبت نہیں ہوئی، ہاں البتہ لیکن اب میں ان سے محبت کرتی ہوں میرا نظریہ یہی ہے کہ محبت ہوتی نہیں کی جاتی ہے۔ آپ بتائیں کسی لڑکی کو کسی غیر لڑکے سے قتل از نکاح محبت کرنا جائز ہے؟ اس کے بارے میں سوچنا، اس کو خطوط لکھنا، تنہائی میں ملنا وغیرہ؟“

”نہیں یہ تو گناہ ہے۔“ میں نے کہا۔ ”نوجوان لڑکے اور لڑکی کا اس قسم کا تعلق خدا اور رسول کے حکم کے مطابق ٹھیک نہیں ہے۔“

ہے؟ اس نے کہا ہاں۔ ابو ہریرہؓ نے فرمایا میں نے اپنے محبوب ابوالقاسم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جو عورت مسجد میں خوشبو لگا کر آئے اس کی نماز اس وقت تک قبول نہیں ہوتی جب تک وہ گھر جا کر غسل نہ کرے۔

(ابوداؤد، ابن ماجہ، احمد، نسائی)

ابوداؤد شریف میں ہے کہ رسول اللہ کی ہدایت یہ تھی کہ عورتوں کو وہ خوشبو استعمال کرنی چاہئے جس کا رنگ تیز ہو اور بو ملکی ہو۔

عورت کو بغیر محرم کے سفر سے منع کر دیا گیا ہے اور کسی مرد کو عورت کے ساتھ خلوت میں ملنے کی اجازت بھی نہیں ہے۔ عورت عورت اپنی آواز غیر محرم کو نہیں سنا سکتی البتہ ضرورت پڑنے پر بات کرنے کی اجازت ہے۔ امہات المؤمنین کو کون کونساں مسائل بتایا کرتی تھیں۔

بھائی جان! جو دین خدا کے گھر میں عبادت کے موقع پر بھی مرد اور عورت کو حلال ملنا نہیں ہونے دیتا اس کے متعلق کون تصور کر سکتا ہے کہ وہ کالجوں میں، دفاتروں میں، کلبوں میں اور جلسوں میں اس لحاظ کو جائز رکھے گا آپ محبت کی بات کرتے ہیں اسلام کے خوشبوئی خیالات جو دل و دماغ میں آتے ہیں ان سے بھی منع کیا ہے۔ ہاں محبت کرنی ہے تو اپنے میاں سے کرو۔ شادی کے بعد محبت کے بارے میں میرا یہی نظریہ ہے مجھے کسی رائے یا دانشور کو بڑھنے کی ضرورت نہیں ہے میرے نزدیک رسول اللہ سے بڑھ کر کوئی دانشور پیدا نہیں ہوا۔

وہ جذباتی ہو گئی تھی اور پھر اس نے اسی وقت غائب اوڑھ لیا۔ میں نے اس سے اس کی وجہ پوچھنے کی جسارت نہیں کی۔ صاحب بہادر نے میری طرف غور سے دیکھا اور پھر مطمئن ہو گئے کیونکہ میرے چہرے پر آسودگی اور تحسین نے ڈیرے بجالائے تھے۔

(جاری ہے)

”لیکن آج کل کے لڑکے اور لڑکیاں اسے ہی محبت کہتے ہیں۔“ ستارہ نے ذرا جو شیلے انداز میں کہا۔ ”قرآن اور حدیث میں آپ کو اس قسم کی محبت کا کہیں جواز نہیں ملے گا بلکہ اس سے سختی کے ساتھ منع کیا گیا ہے۔“ ستارہ نے سورہ نور کی آیات مبارکہ فر فر پڑھنی شروع کر دیں۔ اب اس کی شخصیت کا ایک اور پہلو میرے سامنے آ گیا وہ ایک منجھے ہوئے عالم دین کی طرح قرآن کے موتی بکھیرتی چلی جا رہی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کے عالمانہ انداز سے میں خود مرعوب ہو گیا تھا۔ اس کے چہرے پر نور کا ایک خوبصورت ہالہ اور آنکھوں میں عالمانہ وجاہت مجھے احساس کسری کا شکار کر رہی تھی اس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور پھر قرآن پاک کی آیت مبارکہ اتنے نفیس سبجے میں پڑھی کہ واقعی اس کے منہ سے موتی جھڑنے لگے۔

ترجمہ: وہ اپنے پاؤں زمین پر مارتی ہوئی نہ چلا کریں کہ اپنی جو زینت انہوں نے چھپا رکھی ہو اس کا لوگوں کو علم ہو جائے۔ اے مومن! تم سب مل کر اللہ سے توبہ کرو تو فتح ہے کہ کامیاب ہو جاؤ گے۔

(سورہ نور آیت 30)

اور اس قرآنی حکم کو رسول اللہ نے صرف زیوروں کی جھنکار تک منع نہیں لکھا ہے بلکہ اس سے یہ اصول اخذ فرمایا ہے کہ نگاہ سے سوا دوسرے حواس کو مشغول کرنے والی چیزیں بھی اس مقصد کے خلاف ہیں جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو اظہار زینت سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ آپؐ نے عورتوں کو حکم دیا کہ خوشبو لگا کر باہر نہ نکلیں۔ (ابوداؤد، احمد)

ایک عورت مسجد سے نکل کر جا رہی تھی کہ ابو ہریرہؓ اس کے پاس سے گزرے اور انہوں نے محسوس کیا کہ وہ خوشبو لگائے ہوئے ہے، انہوں نے اسے روک کر پوچھا۔ اے خدائے جبار کی بندی کیا تو مسجد سے آ رہی

ہربل مساج آئل
قدیم نایاب
شاہی نسخہ

مال کنگنی

اس قدیم نسخے سے ان امراض میں مبتلا افراد مستفید ہو سکیں گے

کمر درد	گردن درد	گھٹنوں کندھوں ایڑھی کا درد
کولہے کا درد	شیاہیکا (لنگڑی) کا درد	گردن، کمر کے مہروں کا درد
ڈسک سلپ	جوڑوں کی سوزش	ٹوٹی ہڈی، ایکسیڈنٹ کا درد
سر درد / مائیگرین	پرانی جوڑوں کا درد	جوڑوں کے گرد پٹھوں کا کھپاؤ
احصاب (پٹھوں کا کھپاؤ)	ہڈیوں کا گھٹنا	درد کا ٹانگ میں اترنا
ہر قسم کی سوجن	فالج / لقوہ	موج / اکڑاؤ

عازمین حج و عمرہ کیلئے
ایک نایاب تحفہ

قیمت
Rs:750
Rs:450

کھلاڑیوں کیلئے
عظیم لازوال نعمت

ایسے لوگ جو اپنے آپ کو ضائع کر کے اب خاص طاقت سے بالکل فارغ ہو چکے ہوں
تیل کی مالش اور 25/20 قطرے نیم گرم دودھ میں لیس پھر تیل کا کمال اور فائدہ دیکھیں

2nd فلور صادق پلازہ 26 پیالہ گراؤنڈ لنک میٹروڈ روڈ لاہور
0323-4454249 0323-4329344 0306-6821300



حیات

0345-6875404

☆ ڈاکٹر مبشر حسن ملک

اس کے گھرانے میں دو خصوصیات بڑی اہم تھیں۔ ان کے ہاں بچے بہت خوبصورت پیدا ہوا کرتے تھے اور جنم اکثر لڑکیاں لیا کرتی تھیں جو صحت مند اتنی ہوتیں کہ چھوٹے بچے کے گھٹنے میں نیم کے پتوں کو بھی مات دیا کرتی تھیں۔

آبرو کے گھرانے کو محمد حسن وزیر پر تو ہوسکتا تھا، اپنے کردار پر نہیں۔ آبرو کے والد بھی چھوٹی موٹی تجارت کر لیا کرتے تھے مگر اب نہیں۔ وہ قومیت سے نشہ کرنے کے عادی ہو چکے تھے اور صرف اس لئے زندہ تھے کہ گھرانے کو تحفہ نوائی سے روشناس کئے رکھیں۔ ماں غم دوراں میں بری طرح الجھ کر پس چکی تھی۔ صبح سویرے کسی ٹیکسٹر کی راہ لیتی اور رات گئے واپس گھر لوٹتی تو بری طرح تھک چکی ہوتی۔ ایسے میں خوبرو لڑکیوں کا منہ زور ہو جانا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ منصف نازک میں جوانی اپنا پہلا اظہار دنیا کو ضرور دکھاتی ہے اور کئی دیکھنے والے گل خندہ کو پرکھ لیتے ہیں۔

آبرو خاندان بھری پرہیز کی رانی تھی۔ اتنی سندر جیسے پھول کنول۔ سفید، تازہ اور بھرپور۔ قدرت نے اس کے چہرے پر اجزا سلپتے سے سجا دیئے تھے اور ان میں اپنے رنگوں سے جن کر آمیزش بھی کر دی تھی۔ جو تو اوزن میں شاہکار تھی۔ سیاہ دہری کمان کے زیر سایہ پٹلوں آ نکھیں اور دلفریب یا قوتی ہونٹ، نینوں میں رد بھری نظر آتی تھی۔ چہرے کو زلفوں کے سیاہ ابرو نے ڈھانپ لیا تھا۔ حسن مجسم تھا جس کا شمار کسی قدر فرد کو جنم دیا کرتا تھا مگر آبرو کے حسن ذوق میں بھی کمی دکھائی نہ دیتی تھی۔ وہ شب کی چاندنی میں پڑ سکون پانچوں میں پورے چندا کا

تھی۔ کچھ عرصہ تو فیکٹری مدد کرتی رہی، وہاں سے دوادارو بھی ملتا رہا مگر آخر کرب تک۔ ایک روز ماں کو ملازمت سے جواب مل گیا۔

آبرو نے بمشکل ایف اے تک تعلیم حاصل کی۔ اس بچہ گھرداری کا تمام بوجھ اس کے کندھوں پر آن پڑا تھا۔ اس نے بہادری سے حالات کا مقابلہ کیا اور کسی حد تک ماں کا سہارا بن گئی۔ ماں کے رنجے بھی صبراً کھا گئی۔ مگر گھر معاشی سہاروں کے بغیر کہاں چلتے ہیں۔

حیا ایک باحیا لڑکی تھی۔ اسے گھر کی پناہ میں رہنا اچھا لگتا تھا۔ وہ دنیا سے بہت ڈرتی تھی اور ان راہوں سے شدید نفرت کرتی تھی، جن پر بھی اس کی ہمیں چل نکلی تھیں۔ اس نے اپنا سر ردا سے ڈھانپ لیا تھا مگر اس ردا کا تقدس منواتا کسی دشوار مرحلے سے کم نہیں تھا۔

چند گھرانوں کے بچے وہ پڑھا دیا کرتی تھی مگر عوضانہ قلیل تھا۔ تنگ دہی کے باعث شام اسے گھر کا چراغ بجھانا پڑتا تھا۔ حالات نے مجبور کیا تو اسے باہر نکھٹا پڑا۔ اب وہ بادل ناخواستہ ملازمت کا پھندا موٹ رہی تھی ورنہ اس کا گھرانا جل کی سمت بڑھ جاتا۔

تلاش کے مراحل بڑے پُر آشوب تھے، صبر و بردباری بھی۔ بالآخر آبرو کا سران ٹھہری۔ اسے سبز کے شعبے میں ملازمت ملی تھی، جس کے اپنے مخصوص تقاضے تھے۔ وہ ایک ایسی فرم کے ساتھ منسلک ہوئی تھی جو طبی آلات درآمد کر کے فروخت کیا کرتی تھی۔ یہ فرم اپنا لوہا منوار ہی تھی۔ آبرو سختی لڑکی تھی، جلد ہی ذمے داریاں بطریق احسن نبھانے لگی۔ اسے رہنمائی بھی بہتر ملی۔

عملی زندگی میں حیا کو وہ تمام مسائل پیش آئے جن کے خدشات وہ رکھتی تھی۔ حرص و ہوس کے طوفانوں میں اسے اپنا وجود منہ حار میں پھنسی تاؤ کی طرح دکھائی دیتا تھا جو اپنے بچاؤ کی خاطر ہچکولے کھا رہی تھی۔ حیا کبھی دنیا کے رویوں پر آنسو بہاتی تو کبھی اپنے حالات پر ہنسنے لگتی۔

آبرو کی دو بڑی بہنیں تھیں، سویرا اور نگاہ۔ نہ تو سویرا صبح جوانی میں زیادہ سنبھل سکی اور نہ ہی نگاہ اپنی نظریں سنبھال سکی۔ دونوں کے پچھن عمومی تنقید کا باعث بن گئے اور ان معاشرتی صیادوں کے لئے دلچسپی کا باعث ٹھہرے، جو اڑتی چڑیوں کے پر گمن لیا کرتے تھے۔

دونوں بہنوں نے میٹرک کے بعد فلاحی اداروں کا رخ کر لیا تھا۔ بڑی بی اے کرنے میں کامیاب ہو گئی جبکہ منجھلی نے مڈوائفری کی تعلیم حاصل کی۔ دونوں خوش نصیب و کامران ٹھہریں۔ بڑی کو ایک نامور فرم میں بطور پی اے ملازمت ملی جبکہ منجھلی کو ہسپتال میں نرس کی حیثیت سے نوکری ملی گئی۔ دونوں کی نوکریاں اوقات کی پابندی سے بے نیاز تھیں۔ کئی بار ان کی راتیں بھی گھر سے باہر گزرتی تھیں۔ آبرو کو اچھا ہوا جب ہمیشہ گمان کی کلاہیاں مہینوں میں زیورات سے لد لگئیں، اتنی جلد کہ دیگر احباب بھی انگشت بدنداں رہ گئے۔

ماں نے ان سے یا انہوں نے ماں سے بہت کچھ منوالیا تھا۔ دونوں نے اپنے لئے لڑکوں کا انتخاب بھی کر لیا۔ لڑکے بھی ایسے جوان پر فدا دکھائی دیتے تھے۔ ان لڑکوں نے نہ صرف چاہت سے شادیاں کیں بلکہ شادیوں کے سلسلے میں لڑکیوں کی مالی اعانت بھی کی اور برتر ہونے کے باوجود ان پر جان چھڑکتے رہے۔ بعد ازاں دونوں بہنیں اولاد کی نعم سے بھی سرفراز ہوئیں۔ وقت کے ساتھ ان کی دلچسپی آبائی گھر اور ماں سے معدوم ہو گئی۔

ہمیشہ گمان کی شادیوں نے گھر ویران کر دیا۔ پھر دورانے نے گھر کے نقوش ہی بدل ڈالے۔ حیا کے والد دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئے۔ بعد ازاں ماں کو بھی یہی قلبی عارضہ لاحق ہو گیا۔ ماں کی بیماری خصوصاً بڑی شدید تھی۔ لگتا، اسے ہر دم دل کا دورہ پڑا رہتا تھا اور وہ ہسز پر پڑی کراہتی رہتی تھی۔ کام کے لئے نہیں جاسکتی

گئی اور ناظم کا دم بھرنے لگی۔

ادھر ناظم بھی اسے دل و جان سے قبول کر چکا تھا۔ وہ حیا کے گھریلو حالات جانتا تھا، پھر بھی اسے اپنا نا چاہتا تھا۔

”اتنا بھی نہ چاہو کہ دم نکل جائے۔“ ایک دن حیا کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ وہ ناظم کو نصیحت کر رہی تھی۔ ان دنوں ناظم جذبوں کی رو میں بہنے لگتا تھا۔ ”سمندر کے مقابل بند نہیں ٹھہرا کرتے۔“ ناظم نے اسے جواب دیا۔

”میں اونچی ہواؤں میں نہیں اڑنا چاہتی، مری تو پاش پاش ہو جاؤں گی۔“ حیا اسے کئی بار کہہ چکی تھی۔ ”سورج ماند پڑ سکتا ہے مگر جذبے ہمارے دلوں میں دیکھتے رہیں گے۔“ ناظم نے پھر بڑا دعویٰ کیا۔ ”میں لفظوں پر یقین نہیں رکھتی، جذبے حقائق کا وار نہیں سہہ سکتے۔“ حیا حقائق پر جتنی رو ہوں پر قائم رہا کرتی تھی۔

”کیا جذبے حقائق نہیں ہوتے؟“ ناظم نے جو پوچھا۔

”حقائق ان کا روپ بدل ڈالتے ہیں۔“ حیا نے جواب دیا۔

”مروں گا فقط تمہاری چاہ میں اور مر کر بھی صرف تمہیں چاہوں گا۔“ ناظم نے حسبِ عادت لفظوں کا سہارا لیا۔

”وہی کہو جو کر سکو۔“ حیا نے اسے تھریا ٹوک دیا۔ ”آزمانے کی کوشش نہ کرنا۔“ یہ ناظم کا آخری حربہ ہوا کرتا تھا۔

”دستور حیات ہے ناظم! الفت آزمائش میں ڈالتی ہے پھر کبھی آزمائش بھی بن جاتی ہے۔“ حیات حقیقت پسندی پر قائم رہی۔ ناظم نے حیا کو اعتماد دینے کی ٹھان لی۔ والدین

”مجھے اپنا وجود کسی دیدہ زیب میٹری کی طرح دکھائی دیتا ہے جو شاید بہت خوش ذائقہ بھی ہو، جس کی جانب کئی حریص ہاتھ بڑتے ہیں مگر میرے اوصاف کے شوکیں پر ٹکرا کر واپس پلٹ جاتے ہیں، مجھے چھو نہیں پاتے۔“ ایک روز آبرو نے اپنی ماں کو بتایا۔ ”جس دن میری شرم و حیا کا شیشہ ٹوٹ گیا، میں نیست و نابود ہو جاؤں گی۔“ وہ بولی تو اس کی ماں ڈر گئی۔ اس کی دختر بھینڑ یا صفت انسانوں کی خلقت میں تنہا کھڑی تھی۔

حیا کی تنخواہ اتنی تھی کہ گھر کی سفید پوشی قائم تھی۔ کبھی اسے اور ناظم بھی مل جاتا تھا، جس کے سہارے گھرانے کی وضع قائم رہتی تھی۔ حیا میں خداداد صلاحیتوں کی کمی نہ تھی۔ اس کی آواز فرم کے اشتہاروں میں بھی گونجا کرتی تھی۔ وہ جتنی خوش وضع اور خوش اخلاق تھی، اتنی ہی ذوق شناس بھی تھی۔

ناظم اس کی خوش ادائیگی کا اسیر ہوا تھا۔ اب اس پر بری طرح فریفتہ ہو چکا تھا۔ حیا اور ناظم ایک ہی فرم میں کام کرتے تھے۔ ناظم نسبتاً اعلیٰ عہدے پر فائز تھا اور خوشحال بھی زیادہ تھا۔ اپنی خوبروی پر اتراتا تھا مگر اس کا یوں متوجہ ہو جانا حیا کے لئے بھی غیر معمولی بات نہ تھی۔

”اگر تم نے میری طرف التفات نہ برتا تو اپنی جان دے دوں گا۔“ ناظم نے دو ٹوک لفظوں میں حیا کو بتلا دیا۔ اگلے ہی لمحے اس نے اپنی کلائیوں پر بلیڈ سے وار کرنا شروع کر دیے۔ خون کے قطرے اس کے لباس میں جذب ہونے لگے۔ دونوں فرم کے کئی روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ حیا اسے سمجھتی ہوئی مچلی منزل پر ڈنڈہ مرنی کی طرف لے گئی۔

اس روز ناظم کی کلائیوں میں چند ٹانگے لگ گئے، جن کی کک حیا نے اپنے دل میں محسوس کی۔ وہی لمحے تھے جب وہ اپنا دل ناظم کو دے بیٹھی۔ شروع میں وہ خاصی محتاط رہی مگر وقت کے ساتھ زیادہ بے تکلف ہوتی

”شرافت شخصی اطوار کا حصہ سمجھی جاتی ہے۔ کسی کے دیکھ لینے سے ختم نہیں ہو جاتی۔“ حیانے جواب دیا۔
 ”حیادل کے سیپ میں موتی کی طرح تھی رہ جائے تو بھلا کیا معنی؟ اتہارے خیال میں اسے عریانی کا لباس دے دینا چاہئے۔“ ناظم نے دل کی بات کر دی۔

”ضرورتیں انسان کی مجبوریاں بن جاتی ہیں۔“ حیا نے مدہم آواز میں جواب دیا۔ ان دنوں اس کی ماں خاصی بیمار رہنا شروع ہو گئی تھی۔ قلب کا عارضہ گراں علاج کے تقاضے کرتا تھا۔

”میں حیار پروردہ ہوتی تو آج بہنوں کی طرح بچے میں کھیل رہی ہوتی۔“ حیا نے بڑبڑاتے ہوئے کج بیانی کی۔

”تو گویا تمہیں اپنے اطوار پر پچھتا ہے؟“ ناظم نے چونک کر سوال کیا۔

”نہیں، میرا روزگار مجھے چند تقاضوں پر مجبور کرتا ہے، گو مجھے وہ پسند نہیں۔“ حیا نے معاملہ منسایا۔

چند روز بعد اس کی ماں شدید بیمار پڑ گئی۔ ایک صبح چکر اکر ایسا گری کر ناک سے خون پھوٹ پڑا، حیا اسے عموماً قریبی ڈسپنسری میں لے جایا کرتی تھی، جسے خیر حضرات کی امداد حاصل رہتی تھی۔ اس روز ماں کو ڈسپنسری پہنچانے میں اہل محلہ کو بھی مدد کرنا پڑی۔

”اس بار معاملہ سنجیدہ لگتا ہے۔“ ڈاکٹر نے مریض کو دیکھا تو یکدم پریشان ہو گیا۔ ”شاید کسی بڑے ہسپتال کی طرح رجوع کرنا پڑے۔“ اسے خدشہ ہوا۔ ”داخلہ بھی کروانا پڑے گا۔“ وہ بے بسی کے عالم میں بولا۔

”۔۔۔ کتنا چنچہ لگے گا؟“ حیا بے ساختہ چیخ پڑی۔ اس پر دکھوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔

”میں اپنی سی کوشش کر لوں، پھر آپ کو بتاؤں گا۔“ ڈاکٹر نے منجھل کر جواب دیا۔ اس نے دوسرے ڈاکٹر کو بھی بلوالیا۔

کے ہمراہ وہ اس کے گھر گیا اور اس کا ساتھ مانگ لیا۔ حیا کے کہنے پر اس کی ماں نے بھی دلچسپی ظاہر کر دی اور یوں دنوں میں دونوں کے بیچ نسبت طے ہو گئی۔ دونوں کے خواب یکجا ہو گئے۔ ماں کی مگر تھی ہوئی صحت میں بھی تھوڑا سا سکون رونما ہو گیا۔

”تم نے احتساب کے مراحل طے کر کے اپنی حیا اور میری حیا کو سرخرو کر دیا۔“ حیا اکثر ناظم سے تشکر ا کیا کرتی تھی۔

مرد جب شوہر بنتا ہے تو اس میں مخصوص خصلتیں جنم پانا شروع کر دیتی ہیں۔ ایسی تبدیلیاں بھی پیدا ہوتی ہیں جن کا پہلے اندازہ بھی نہیں ہوتا۔ کنبے کے سربراہ کی حیثیت میں دطیرہ بسا اوقات لڑکے کے والدین کو بھی حیران کر دیتا ہے۔ ناظم اب حیا سے تقاضے کیا کرتا تھا۔ اس نے حیا کے ارادوں پر بھی کڑے پھرے لگا دیئے تھے۔

ان دنوں فرم کو حیا کی بہت ضرورت تھی۔ ایک انٹرنیشنل میڈیکل کانفرنس منعقد ہو رہی تھی۔ اندازہ تھا کہ اس دوران کاروباری اشتہار بازی اپنی حدیں چھوئے گی۔ کانفرنس کے اختتام پر حیا کو اسکیلر کے پاس ایک بڑا بے کارڈ تھا۔ کھڑا ہوتا تھا، جس پر درج اشتہاری مواد تمام شرکاء مندوبین نے وہاں سے گزرتے وقت پڑھنا تھا۔ اس اشتہاری مہم کا دورانیہ تقریباً بیس منٹ پر محیط رکھا گیا تھا مگر معاوضہ بہت پرکشش تھا۔ حیا اپنے چناؤ پر بڑی سرور تھی۔ ناظم کو حیا کا یہ روپ پسند نہ آیا۔

”لوگ اشتہار کو کم اور تمہیں زیادہ دیکھیں گے۔“ اس نے اپنی رائے دے دی اور انکشاف کیا کہ مختصر اشتہاری مہم کے دوران اسے نیم عریاں لباس پہننا پڑے گا، جسے ہر شریف آدمی معیوب خیال کرے گا۔ اس نے بڑا اظہار کر دیا۔

رہی تھی۔ ہاتھوں کی انگلیوں کی حرکت اس کے وجود میں
مچی بے چینی کی غمازی کر رہی تھی۔ یکا یک بگ باس اسے
خونخوار شیر کی طرح دکھائی دینے لگا جو اپنے شکار پر جھپٹنے
کے لئے تیار ہو چکا تھا۔

”اگر تم مجھے اس اشتہار میں کامیاب دکھائی دیں تو
میں تمہیں سکرین پر اشتہاروں کی پیشکش بھی کروں گا۔“
باس نے اسے رام کرنے کی کوشش کی۔

اگلے روز حیا کو ماں کی جان لیوں پر نظر آئی۔ کبھی
اس کا درد اس قدر بڑھ جاتا کہ وہ چھین مارنے لگتی، کبھی
اس کے ہونٹ نیچے پڑ جاتے اور سانس اکھڑنے لگتی۔

”معلوم نہیں مریمہ کیسے نپٹ جائے گی یا نہیں؟ ہم
نے حتی المقدور کوشش کی ہے۔ اسے کسی اعلیٰ ہسپتال میں
بھرپور توجہ ملنی چاہئے اور آج شب یہ مرحلہ طے ہو جانا
چاہئے۔“ ڈاکٹر نے حیا سے دونوں بات کی۔

”ڈاکٹر صاحب! شام تک میں رقم کا انتظام کر لوں
گی۔ رات گہری ہونے سے پہلے آپ کی مدد سے ہم
مریمہ کو یہاں سے منتقل کروالیں گے۔“ حیا نے حیرتزلزل
لہجے میں جواب دیا۔

”خدا کرے کہ رات پڑنے تک تاخیر نہ ہو
جائے۔“ ڈاکٹر نے وہی گفتگوں میں شدید خطرے کا
اظہار کر دیا۔

ہوٹل میں کانفرنس ختم ہو چکی تھی۔ مندوبین بڑے
بڑے ہال کمروں سے برآمد ہو رہے تھے۔ ان سب
خواتین و حضرات کو دو اسکیلٹر ز کی مدد سے گراؤنڈ فلور کی
جانب جانا تھا۔ حیا کے لئے جگہ کا چناؤ ہو چکا تھا۔ طے
کارڈ اٹھا کر وہ ریپرسل بھی کر چکی تھی۔ اس دم وہ سفیدی
شرت اور نیلی جینز پینٹ میں لمبوس تھی۔ دوپٹہ اس کے
سینے پر آراستہ کر دیا گیا تھا۔ اس نے میک اپ کھار میں
ہلکا مگر نفاست میں اعلیٰ کیا تھا۔ اگلا نصف گھنٹہ اسے لیوں
پر مسکان سجائے رکھنا تھی اور طے کارڈ کے باعث تھکاوٹ

پہنچنے کے پاس موجود نہیں تھا اور ماں کی تکلیف
اس سے دیکھی نہ جاتی تھی، جوالم کے مارے کراہ رہی
تھی۔ ڈاکٹر اسے بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ رات
بھیک چکی تھی، جب حیا کی دعائیں قبول ہوئیں۔ ماں
قدرے پرسکون ہو گئی۔ حیا کی رات البتہ آنکھوں میں
کٹ مٹی۔

صبح جائے ملازمت پر پہنچی تو وہ ہر کسی کو تھکی ماندی
اور بے حد رنجیدہ دیکھی۔ اس نے ہر جاننے والے سے
ہمدردی چاہی اور قرض کا تقاضا کیا۔

”آج میں اپنی ماں کی خاطر خیرات بھی قبول کر
لوں گی۔“ اس نے لی روم میں بات کی تو ناظم نے اسے
بری طرح ڈانٹ دیا۔

”اپنی عزت نفس کا کچھ خیال کر لو۔“ اس نے کہا۔
حیا اپنے آنسو پونچھتی رہ گئی۔ وہ صبح سے مسلسل دوری
میں تھی۔

پچھنی سے ذرا پہلے وہ اپنے باس کے دفتر چلی گئی
اور اس سے اپنی مشکل بیان کی۔

”میں نے تمہیں ایک اشتہار میں ذمہ داری
نہانے کی پیشکش کی تھی، باس نے اسے کہا اور معنی خیز
نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”سر! اس اشتہار میں تو میں خود اشتہاری عنصر بن
جاؤں گی۔ لوگ پراڈکشن کا نام کم پڑھیں گے، میرا
تعارف زیادہ جانچیں گے۔ میں بدنام ہو جاؤں گی۔ جم
غفیر کے سامنے نمائش بن جانا بڑا سنگین مرحلہ ہوتا ہے۔“
حیا نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ پھر نظریں جھکا لیں۔

”فرم کی جانب سے یہ پیشکش ابھی تک موجود ہے
بلکہ تمہاری تمام مالی اعانت اسی اشتہار سے شروٹ ہے۔
جتنا گڑ ڈالو گی، اتنی مناس آئے گی۔ میں نے خود تمہارا
چناؤ کیا ہے۔ تم چاہو تو ہم ابھی معاہدہ کر لیتے ہیں۔“
باس نے حیا کی طرف دیکھا، جو نظریں جھکائے بیٹھی سوچ

کو نظر انداز کرنا تھا۔
تھوڑی دیر میں اسے اُن گنت نگاہیں اپنے وجود پر
چبھنے لگیں۔ اسے لگا جیسے مردانہ ہوس کے تیر اسے چسید
رہے تھے۔ اس نے نگاہیں اٹھا کر دیکھا تو جان گئی کہ جم
غیر میں تنہا کھڑی تھی۔ اسے اپنی اطراف میں چہل چاہل
کے زلزلے بھائی دینے لگے۔
”لڑکی سمارٹ ہے“ کسی نے کہا۔
”بہت حسین ہے“ کسی دوسرے نے جواب دیا۔
”میری طرف سے بڑا آؤر بک سمجھیں“ کہیں قریب
سے بھاری آواز ابھری۔

حیا کے ماتھے پر جب چھلکنے لگا۔ اس نے نگاہیں
جھکا لیں۔ لمحے اس پر قیامت من گئے۔ یک دم ماں کا
افسردہ چہرہ اس کے ذہن میں ابھر آیا، فکرات میں الجھاؤ
حیا کے لئے سوندھا جارت ہوا چند منٹ ہی کیفیت میں گزر
گئے، پھر وہ ماں کے علاج پر سوچنے لگی۔ اسے احساس ہوا
کہ اس نے حیا ماں کی تکلیف کم کرنے کے لئے عارضی
طور پر گروی رکھ دی ہے۔ پھر اسے وقت گزر جانے کا
احساس ہوا کیونکہ اس کی اطراف میں ہجوم ہلکا پڑ چکا تھا۔
سینئر پروفیشنل اس کے پہلو سے گزر رہے تھے۔ چند
خواتین اس کے قریب ٹھہر گئیں اور اسے سراہتے ہوئے
اعتماد دینے لگیں۔ حیا کی آزمائش کم ہونے لگی۔ اس کے
سامنے راستوں پر ویرانی چھانے لگی تھی۔ ہال کمروں میں
رکے اکا دکا شرکاء دروازوں سے برآمد ہو رہے تھے۔
اگلے لمحے حیا کے ذہن میں ایک بھیاں تک خیال ابھرا یا اور
پھر اس کے وجود میں چپک کر رہ گیا۔ وہ بے حد پریشان
ہو گئی۔

”ناظم، کیا تم نہیں جانتے؟ کیا تم واقعی میری
مجبوریاں نہیں جانتے؟“ حیا نے التجا کا انداز اپناتے
ہوئے کہا۔
”اس بے حیائی کی توجہ نہ جانا بھی نہیں چاہتا۔“
ناظم غصے میں آگ بھولا دکھائی دینے لگا۔ بات سن کر حیا
کو نظر انداز کرنا تھا۔

”ناظم کار و عمل کیا ہو گا؟“ سوچیں اس کے دماغ
میں منزلانے لگیں۔ بے چینی اس کے رگ و پے میں
سرایت کر گئی۔ پلے کارڈ اسے منوں بھاری محسوس ہونے
لگا۔ وہ پسینے میں بری طرح بھیگ گئی۔ پھر مناظر اس کی

سکتے تھے۔ تمہارے پاس خدا کا دیا بھی وافر تھا۔ تم نے مجھے اور میری ماں کو رشتہ دار نہ سمجھا، حالانکہ میں ہر کسی سے مدد کی طلبگار ہوتی تھی۔ یاد کرو کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟“ حیانے تلخ حقائق پر موثر بات کی۔ ناظم اس کا منہ دیکھتا رہ گیا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر بھلا کر چپ رہ گیا۔

”میں اگر بد چلن ہوتی تو اس وقت ماں کا علاج بہترین ہسپتال میں ہو رہا ہوتا۔ تمہارے اس آفس میں ایسی لڑکیاں موجود ہیں جن کی تنخواہیں مجھ سے کم ہیں مگر ان کا ٹھانڈا ہاتھ شہزادوں سے کم نہیں۔ کیا ان کے گرد گاڑیاں نہیں گھومتیں؟ کیا میری سچائی تمہیں دکھائی نہیں دیتی؟“ حیانے اپنی مغالی میں دلائل جاری رکھے۔

ناظم اب خفت کا شکار نظر آنے لگا تھا مگر سر ہینا وہ اپنے جارحانہ رویے پر قابو نہ پاسکا۔ ادہام بھی اس کی شخصی زندگی کا جزو بن چکے تھے۔

”جان لو حیا! کہ میں جیون میں تم سے نبھاؤ نہیں

کو بھی غصہ آ گیا مگر اس نے لہجہ قابو میں رکھا۔ اسے سمجھاتے ہوئے بولی۔

”تم نے مجھے دوسری بار بے حیا کہا ہے ناظم! مجھے اپنا سابقہ باس یاد آ گیا ہے جس نے مجھ پر دست درازی کی تھی۔ میں نے اس کا مقابلہ کیا تو اس نے مجھے چھوڑ دیا اور ”حیا آلود“ کہہ کر طفر کیا۔ وہ مجھے احقر سمجھ رہا تھا۔ خدا را اس معاملے کو ختم کر دو اور مجھ پر تہمت نہ لگاؤ۔“ حیا بری طرح رونے لگی۔

”مگر مجھ کے آنسو نہ بہاؤ، میں تم جیسی عورتوں کو خوب جانتا ہوں۔“ ناظم کا رویہ انتہائی جارحانہ ہو چکا تھا۔ حیانے دائیں بائیں دیکھا۔ ہونٹ کے سبزہ زار میں لوگ زیادہ نہیں تھے، پھر بھی وہ اپنی متوجع تو ہیں سے ڈر چکی تھی، اب مضطرب بھی دکھائی دینے لگی تھی۔

”دیکھو، ناظم! تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میری ماں بستر مرگ پر پڑی ہے۔ تم میری خاطر اس کا علاج کروا

الریاضین

20۔ اے سال انڈسٹریل اسٹیٹ، جی ٹی روڈ، گجرات

Ph: 053-3521253-3532224-3532225. Fax: 053-3535224

رقم ملی تھی۔ سفید لفافہ اس کے ہینڈ بیگ میں سر بہر پڑا تھا۔

ہسپتال میں تھوڑی دیر رکنے کے بعد وہ دوبارہ سڑک پر نکل آئی تھی۔ اب وہ سڑک کے کنارے آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ اس سڑک پر پہلے بھی وہ کئی بار چلتی رہی تھی مگر اس روز اس کی کیفیت یکسر مختلف تھی۔ اسے ہر نظر آنے والا منظر معمول سے مختلف دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا دل رورہا تھا جبکہ آنکھیں بار بار اشکوں سے لبریز ہو جاتی تھیں۔

حضرت مولانا کے دروازے پر کی تو اس کی ہاتھیں کانپ رہی تھیں۔ اس نے ہمت کر کے کال بتل پر ہاتھ رکھ دیا۔ حضرت مولانا اسے سہارا دے کر اندر لے آئے۔ حیات نے بند لفافہ ہینڈ بیگ سے نکالا اور ان کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ پھر آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

”یہ میسے میں نے ماں کے علاج کے لئے کمائے تھے مگر اسے زندگی میں نہ مل سکے۔ اس کی لاش ہسپتال میں پڑی ہے۔ میرا دنیا میں کوئی نہیں۔ آپ احسان کر دیں، اس کا کفن دفن کروادیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس کے ختم قل کے لئے پیسے بچ جائیں گے۔“

حضرت مولانا کے چہرے پر درد کا تاثر ابھرا آیا، وہ حیات کا غم سمجھ چکے تھے۔

”تمہاری بہنیں اور دیگر احباب؟“ انہوں نے پوچھا۔

”جو زندگی میں اس کی خدمت نہ کر سکے، انہیں اس کی مرگ پر رونے سے کیا ملے گا؟“ حیات نے جواب دیا۔

حضرت مولانا اپنا فرض ادا کرنے کے لئے باہر نکلے تو وہ جب حضرت مولانا کے پیچھے لگی تو اسے خدشہ ہوا کہ اس کا دل جذبوں کے بوجھ تلے پھٹ پڑے گا۔

کر سکوں گا۔“ اس نے یک دم ہم گرا دیا۔ حیات کو لگا جیسے اس کے دل کی کائنات میں درخشاں ستارہ ٹوٹ کر انگاروں کی صورت بکھر گیا ہو اور انتہائی حدت میں وہ اندر ہی اندر جل اٹھی ہو۔ افتاد کو سنبھالتے ہوئے وہ بے جان سی دکھی۔ آہستہ آہستہ اس کا رنگ زرد پڑ گیا۔

”وہ تعلق کی موت بھی کبھی انسانی اموات کی طرح گہری دکھتی ہے۔“ تصور اس کے ذہن میں گھر کرنے لگا۔ لب سل جائیں تو آنکھیں بول پڑتی ہیں۔ حیات نے منگنی کی انگوٹھی لوٹائی اس کے اشک باطم کے ہاتھوں پر گر پڑے جو اسے گرم چشموں سے ابھرتے ہوئے آنکھیں بھائی دیتے۔

شام گہری ہو چکی تھی۔ حیات ڈسپنری پہنچی تو فضا سوگوار تھی۔ جائگاہ منظر اس کا مختصر تھا۔ وہ سیدھی مختصر عمارت کے دوسرے کمرے میں چلی گئی جہاں اس کی ماں کو رکھا گیا تھا۔ کمرے میں خاموشی تھی۔ ماں کا بدن چادروں میں ڈھکا ہوا تھا۔ حیات کو دھچکا لگا۔ اگلے لئے اسے اپنا دل ڈھونڈنا ہوا محسوس ہوا۔ وہ سہارے کے لئے دیوار کی طرف ہلکی مگر کاپتے بدن کے ساتھ دھڑام سے فرش پر گر پڑی۔

”ہاں، حیات! ہم تمہاری والدہ کو نہیں بچا سکے۔“ ڈاکٹر نے بعد ازاں اسے نرم لہجے میں بتا دیا۔ ”تم نے اپنا سیل فون بھی بند کر رکھا تھا، ورنہ ہم تم کوں بلا لیتے۔“ اس نے حزیہ کہا۔ حیات نے بات کرنے کی کوشش کی مگر اس کے ہونٹ ٹھنڈے لرز کر رہ گئے۔

”موت سے پہلے والدہ نے تمہارے ساتھ بات کرنے کی خواہش کی تھی۔“ قریب کھڑی سٹاف نے اسے سہارا دیتے ہوئے بتلایا۔

”فون مجبور یوں نے بند کروا رکھا تھا۔“ سسکی حیات کے لبوں پر ٹوٹ گئی۔ اس کے بعد وہ زار و قطار رو پڑی۔ حیات نہیں جانتی تھی کہ اشتہار کے عوض اسے کس قدر

یہ اُس زمانے کی کہانی ہے جب موبائل فون نہیں تھا۔ ایک ہتے ہتے مگر کو ایک راگ
نمبر نے برباد کر کے رکھ دیا۔ آج ہر فرد کے پاس موبائل فون ہے۔ خواتین و حضرات
سے گزارش ہے کہ اگر راگ نمبر سے کوئی کال آئے تو اسے راگ ہی سمجھیں ورنہ.....!

قصہ
کائنات

☆ محمد یونس



”آپ پلیز فون بند نہ کیجئے گا آپ صرف میری بات سن لیں۔“

”کیا کہنا ہے آپ کو؟“ ناہید نے بیزارى سے کہا۔

”آپ کی آواز بہت اچھی ہے۔“ اس شخص نے کہا۔ ”یقیناً یہ کسی انتہائی خوبصورت خاتون کی ہی ہو سکتی ہے۔“

”تو، آپ کا اس سے مطلب؟“ ناہید نے سختی سے کہا۔

”مطلب یہ کہ مجھے خوبصورت لوگ اچھے لگتے ہیں۔“ اس شخص نے کہا۔

ناہید نے فون فغ دیا، فون پھر بجنے لگا تو ناہید نے ریسیور نیچے رکھ دیا۔ کچھ وقفہ کے بعد دوبارہ ریسیور پر رکھا کیونکہ ناہید کو اپنے شوہر کے فون کا بہت انتظار ہوتا تھا۔ تو پھر کھنٹی بجی۔ فون اٹھانے پر پھر وہی شخص مخاطب تھا۔

”فلاں مارکیٹ میں میری اپنی ٹیلرنگ شاپ ہے۔ میں خود ہی ایک اچھا ٹیلر ہوں اور دیگر کارمگر میری شاپ پر کام کرتے ہیں۔“ مظہر نے بغیر رکے اپنا تعارف کرا ڈالا۔

”مجھے اس سے کیا سروکار کہ آپ کیا ہیں اور کیا کرتے ہیں۔“ ناہید نے کہا۔ ”بس یہاں ٹیلیفون مت کیا کیجئے گا۔ خدا حافظ۔“ ناہید نے ساتھ ہی فون بند کر دیا۔

پھر فون کی کھنٹی بجی، ناہید نے فون اٹھا لیا۔ اس مرتبہ یہ اس کے شوہر کا فون تھا۔

”ناہید تمہارا فون engage تھا۔“ شوہر نے پوچھا۔ ”کہاں گپ شپ ہو رہی تھی۔“

”ایک رائنگ نمبر فون آنے لگا ہے۔“ ناہید نے کہا۔ ”کوئی ٹیلر ہے، پیچھے ہی پڑ گیا ہے۔ بار بار فون کرتا ہے۔“

1970ء کے اوائل میں رومنا ہونے والے اس واقعہ کے کچھ کردار زندہ ہوں گے لہذا ان کے اصلی نام اور لاہور شہر کی متعلقہ مارکیٹ کا نام بھی نہیں لکھوں گا۔ باقی واردات کی ہو بہو نقل پیش خدمت ہے۔

ناہید، شہر کی ایک مصروف مارکیٹ میں ہوزری کے سامان کے معروف تاجر مرزا اشرف بیگ کی بیوی تھی۔

ان کے ہاں دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی جن کی عمریں آٹھ، چھ اور چار سال تھیں۔ یہ ایک خوشحال گھرانہ تھا۔ شہر کے پوش علاقہ میں ان کا ذاتی عالی شان گھر تھا۔ یہ جواں سال جوڑا مثالی زندگی بسر کر رہا تھا۔ تینوں بچے کانونٹ سکول میں پڑھتے تھے۔

ایک صبح حسب معمول ناہید نے بچوں کو ناشتہ کرایا اور انہیں تیار کر کے اپنی گاڑی میں سکول چھوڑ آئی۔ واپس آ کر اپنے اور شوہر کے لئے ناشتہ تیار کرنے کے لئے وہ کچن میں مصروف ہو گئی۔ ساڑھے نو بجے دونوں میاں بیوی نے اکٹھے بیٹھ کر ناشتہ کیا۔ ساڑھے دس بجے وہ اپنے شوہر کو دکان پر جاتے ہوئے الوداع کہنے گیٹ تک آئی۔

پھر واپس لوٹ کر دوبارہ کچن میں مصروف ہو گئی تاکہ بچا کھچا کام نٹا سکے۔ اسی اثنا میں ڈرائنگ روم میں رکھے ٹیلیفون کی کھنٹی بجنے لگی۔ ناہید نے اپنا کام چھوڑ کر جلدی جلدی میں جا کر فون اٹھا لیا۔ فون پر کسی مردانہ اجنبی آواز نے ہیلو کہا۔ ناہید نے پوچھا کہ آپ کون ہیں اور کس سے بات کرنی ہے؟

”جی، میرا نام رانا مظہر اقبال ہے اور میں نے آپ سے بات کرنی ہے۔“ جواب میں اس شخص نے کہا۔

”لیکن میں تو کسی ایسے شخص کو نہیں جانتی۔“ ناہید نے سوری رائنگ نمبر کہہ کر فون بند کر دیا۔

ٹیلیفون پھر بجنے لگا۔ ناہید نے دوبارہ فون اٹھا لیا تو دوسری طرف سے اس شخص نے کہا۔

”لیکن میں تو کسی ایسے شخص کو نہیں جانتی۔“ ناہید نے سوری رائنگ نمبر کہہ کر فون بند کر دیا۔

ٹیلیفون پھر بجنے لگا۔ ناہید نے دوبارہ فون اٹھا لیا تو دوسری طرف سے اس شخص نے کہا۔

”لیکن میں تو کسی ایسے شخص کو نہیں جانتی۔“ ناہید نے سوری رائنگ نمبر کہہ کر فون بند کر دیا۔

ٹیلیفون پھر بجنے لگا۔ ناہید نے دوبارہ فون اٹھا لیا تو دوسری طرف سے اس شخص نے کہا۔

”لیکن میں تو کسی ایسے شخص کو نہیں جانتی۔“ ناہید نے سوری رائنگ نمبر کہہ کر فون بند کر دیا۔

ٹیلیفون پھر بجنے لگا۔ ناہید نے دوبارہ فون اٹھا لیا تو دوسری طرف سے اس شخص نے کہا۔

”لیکن میں تو کسی ایسے شخص کو نہیں جانتی۔“ ناہید نے سوری رائنگ نمبر کہہ کر فون بند کر دیا۔

دکان پر مصروفیت کی بناء پر اسے دن کے وقت گھر کا چکر لگانے کی تو فرصت نہ ملتی البتہ فون کرنے پر اگر ناہید گھر پر نہ ملتی تو بوجھنے پر وہ با آسانی بازار جانے یا کسی سبکی کے ہاں کسی فٹیشن کا بہانہ گھر لیتی۔ دن گزرتے گئے اور خفیہ ملاقاتیں رنگ لاتی گئیں۔ ناہید اور مظہر اقبال کے تعلقات پختہ ہوتے چلے گئے جن کی ناہید نے اپنے شوہر نامدار کو ہوا بھی لگتے نہ دی۔ آخر وہ دن بھی آ گیا جب ان دونوں نے مل کر تاجر مرزا اشرف بیک کا کٹا اور میان میں سے نکال دینے کا پروگرام بنالیا اور اس کے بعد آپس میں شادی کر لینے کی ٹھان لی۔ اب ان کی ملاقاتوں میں گفتگو کا بڑا موضوع یہی ہوتا کہ کس طرح مرزا اشرف بیک کا درمیان میں سے ہٹا کاٹا جائے۔ آخر ان کے ذہن میں ایک ترکیب آئی تھی اور دونوں نے اس پر عمل کرنے کے لئے اتفاق کر لیا۔

پھر وہ رات بھی آ گئی جب رانا مظہر اقبال، ناہید کے شوہر کے گھر آنے سے پہلے ہی اس کے کمرے میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ رات کھانا کھانے کے بعد مرزا اشرف بیک کچھ دیر ناہید اور بچوں کے ساتھ خوش گپوں میں مصروف رہے۔ حتیٰ کہ سونے کے لئے وہ آگے پیچھے اپنے کمرے میں پہنچ گئے۔ بچے اپنے کمرے میں سکول کا ہوم ورک کرنے کے لئے جاگ رہے تھے۔ حسب پروگرام ناہید نے دوپٹے کو اس کے شوہر کے گلے میں ڈال کر اسے پھانسی دینی تھی۔ مرزا اشرف بیک کی مزاحمت کو رانا مظہر اقبال نے اس کے ہاتھ پکڑ کر اپنی قوت سے روکنا تھا اور گردن میں دوپٹہ ڈال کر اس کا پھندا بنانے کے کام کا ذمہ ناہید نے لیا تھا۔ دونوں میاں بیوی کے بستر پر پہنچنے کے کچھ ہی دیر بعد کمرے میں اچانک مظہر نمودار ہوا اور اس نے چھوٹے ہی اشرف بیک کے دونوں بازو پکڑ کر پیچھے کو جکڑ لئے اور ناہید نے جلدی جلدی اپنا دوپٹہ شوہر کی گردن میں ڈال کر اس کا

”اس کا بھی بندوبست کرتے ہیں۔“ شوہر نے کہا پھر تھوڑی دیر معمول کی باتیں ہوئیں اور رابطہ ختم ہونے کے بعد ناہید نے ریسیور نیچے رکھ دیا تاوقتیکہ رات کو اس کا شوہر گھر نہیں آ گیا۔

”پھر تو اس کا فون نہیں آیا تھا؟“ اس نے پوچھا۔
”میں نے ریسیور نیچے رکھ دیا تھا۔“ ناہید نے جواب دیا۔

”اس لئے میں نے دو ایک بار فون کرنے کی کوشش کی تو مصروف ملا۔“

اگلے روز اسی وقت پھر یہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ مظہر اقبال کا شاید مشغلہ یہی تھا جو ایک نرس کی صورت اختیار کر چکا تھا اور وہ اپنے اس کام میں ماہر تھا۔ اور ناہید کو کوئی بار اس صورت حال کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ ناہید اس فحاش کی خاتون نہ تھی کہ باہر دوستیاں لگاتی پھرے۔ اس نے حتیٰ الامکان کوشش کی کہ ایسا نہ ہو لیکن پھر یا تو اس شخص کی مہارت اور چرب زبانی کام آئی یا پھر ممکن ہے ناہید کی شخصیت کا کوئی گوشہ تشنہ کام رہ گیا ہو۔ ناہید ظہر مظہر اقبال کے دام فریب میں آ گئی اور وہی رات نمبر صبح نمبر کے خانے میں فٹ بیٹھنے کا۔ بات ٹیلیفون سے باہر نکل کر ملاقاتوں پر آ گئی۔

شہر کے یارکوں، ریستورانوں اور ہوٹلوں میں ملاقاتیں ہونے لگیں اور بسا اوقات دن کے وقت جب ناہید کا شوہر دکان پر جا چکا ہوتا اور بچے سکول چھوڑنے جا چکے ہوتے تو یہ ملاقاتیں ناہید کے گھر میں ہونے لگیں اور مزے کی بات کہ ناہید کو بھی ان ملاقاتوں کو اپنے شوہر سے چھپانے کا فن آتا گیا اور اس کے بعد ناہید کا شوہر مرزا اشرف بیک ان رات نمبر کالوں کے متعلق پوچھتا ہی رہ گیا لیکن ناہید کا ایک ہی جواب ہوتا کہ ”نہیں اب کوئی رات نمبر کال نہیں آتی۔“ بے چارہ مطمئن ہو جاتا۔

پہنہا بنانے کی کوشش کر ڈالی۔

ناہید صبح ہونے پر تھانے چلی گئی۔ متعلقہ تھانے کا سب انسپکٹر چوہدری وارث خان ابھی تھانے نہیں پہنچا تھا اسے گھر سے بلوایا گیا اور ناہید نے تھانے میں رپٹ لکھوائی کہ اس کے گھر رات کو ڈاکہ پڑا ہے ڈاکو اس کے ہاں سے زیور اور نقدی لوٹ کر نلے گئے ہیں مزاحمت کرنے پر اس کے شوہر کا گلا دبا کر اسے قتل کر گئے ہیں۔ گھر واپس پہنچ کر ناہید نے اپنے رشتہ داروں اور عزیز واقارب کو بھی خبر سنائی اور خود ماگنی لباس پہن کر چیخ و پکار اور واویلا کرنے لگی۔

کچھ ہی دیر میں تھانیدار چوہدری وارث خان بھی موقع واقعات پر پہنچ گیا۔ اس نے لاش کا نظری معائنہ کیا اور جائے واردات کو بغور دیکھنے کے بعد لاش پوشاڈم کے لئے قریبی ہسپتال بھجوا دی۔ شام تک لاش پوشاڈم رپورٹ کے ساتھ واپس آئی۔ رپورٹ میں لکھا تھا کہ مقتول کی موت کسی کپڑے کا پھندا بنا کر دم مارنے کے سبب ہوئی ہے۔ مقتول کے عزیز واقارب اور مارکیٹ کی تاجروں نے کثیر تعداد میں جنازہ میں شرکت کی اور میت کو رات کے وقت دفن دیا گیا۔ ناہید نے رواج کے مطابق اپنی بیوی کا خوب ماتم کیا اور بچوں کو گود میں لے لے کر خوب خوب سوئے بہائے اور دیکھنے والی ہر آنکھ کو اشکبار کیا۔

ادھر تھانیدار نے جو اس وقت سب انسپکٹر ہی ہوا کرتا تھا، بعد میں ایس ایچ او بن گیا تھا۔ قتل اور ڈکیتی کے اس دہرے کیس کی تفتیش شروع کر دی۔ بیوی قتل ہو جائے تو پولیس کی نظر میں پہلا مشتبہ اس کا خاوند ہوتا ہے اور اگر خاوند قتل ہو جائے تو شک کا خاندان بیوی کے نام سے خالی نہیں ہوتا۔ تھانیدار چوہدری وارث خان نے حسب دستور شک کے خانے کو مقتول کی بیوہ ناہید کے نام سے خالی نہیں رکھا۔ یہ الگ بات ہے کہ گھر میں ماتمی فضا اور انسانی ہمدردی کے جذبہ کی بناء پر ہاتھ ذرا ہلکا رکھا وہ خود

مرزا اشرف بیک جوان آدمی تھا اس نے ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے چلانا شروع کر دیا۔ باپ کی اونچی آواز میں چلانے کی آواز سن کر تینوں بچے جواہر نے کمرے میں جاگ رہے تھے، وہ اس کمرے پر آن پہنچے لیکن کمرہ اندر سے بند تھا بچے باہر چھٹنے لگے۔ اسی اثناء میں پھندہ کی پھانسی اور مظہر کی قوت کے آگے مرزا اشرف بیک کی طاقت جواب دینے لگی۔ باہر بچے زبردست شور مچا رہے تھے۔ اندیشہ تھا کہ ان کی آوازیں سن کر کہیں محلہ دار اسٹھے نہ ہو جائیں ناہید نے مظہر سے کہا کہ اسے یوں ہی جکڑے رکھو میں جا کر بچوں کو اپنے کمرے میں بند کر کے آتی ہوں۔ اس نے دروازہ کھولتے ہوئے بچوں کو سخت ڈرایا کہ اندر ڈاکو گھسے ہوئے ہیں تمہارے ڈیلے کو مار رہے ہیں تم تینوں بھاگ کر اپنے کمرے میں چھپ جاؤ اور اندر سے دروازے کو کھنڈی لگا دو ورنہ وہ تمہیں بھی مار ڈالیں گے۔ بچے معصوم تھے ڈر گئے اور بھاگتے ہوئے اپنے کمرے میں جا گھسے اور دروازے کو اندر سے کھنڈی لگا کر دبک گئے۔

ناہید واپس مڑی اس نے دیکھا کہ مظہر دوپٹے کے پھندے کو دونوں ہاتھوں سے کسے ہوئے ہے اور اس نے اپنے دونوں گھٹنے اس کے شوہر کے بازوؤں پر رکھے ہوئے ہیں جو اپنے چنگ پر پٹھ کے بال کر لیا گیا تھا۔ کام کو تکمیل تک پہنچانے میں ناہید نے مظہر کی مدد کی حتیٰ کہ ان کا کام مکمل ہو گیا اور مرزا اشرف بیک اپنی بیوی اور اس کے آشنا کے ہاتھوں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ دونوں کا پروگرام یہی تھا کہ اس قتل کو ڈکیتی ظاہر کیا جائے گا۔

اس کے بعد دونوں نے مل کر کچھ گھریلو سامان ادھر ادھر بکھیرا اور قاتل مظہر اقبال تو رات کو ہی اپنے گھر روانہ ہو گیا اور باقی کا کام قاتل ناہید کے سپرد کر گیا۔

شوت کر دے گا۔

”واہ تم تو بہت بہادر بنے ہو۔“ وارث خان نے کہا۔ ”لیکن قاتل اور ڈاکو تمہارے گھر میں گھس کر تمہارے ڈیڑی کو قتل کر گئے اور تم نے انہیں کچھ بھی نہیں کہا؟“

”ڈیڑی کی چھین سن کر ہم تینوں بہن بھائی دوڑتے ہوئے می ڈیڑی کے کمرے کی طرف آئے تھے۔“ اشفاق نے کہا۔ ”ہم نے دروازے کو دھکیلا تھا لیکن اندر سے کنڈی لگی ہوئی تھی۔ پھر می باہر آئیں انہوں نے ہمیں کہا کہ اندر ڈاکو تمہارے ڈیڑی کو مار رہے ہیں تم فوراً اپنے کمرے میں گھس کر اندر سے کنڈی لگا دو ورنہ تمہیں بھی ڈاکو مار ڈالیں گے۔“

تھانیدار وارث خان نے گہری سانس لی اور پاس بیٹھی ہوئی ٹاہید کے حیرانی میں ڈوبے ہوئے چہرے پر اپنی نظریں گاڑ دیں۔

”لیکن ٹاہید بیگم یہ تو آپ نے بتایا ہی نہیں کہ آپ واردات کے وقت قاتلوں کے ساتھ اپنے مقتول شوہر کے ساتھ کمرے میں بند تھیں۔“

”لیکن کمرہ اندر سے قاتلوں نے بند کیا تھا۔“ ٹاہید نے ہلکاتے ہوئے کہا۔

”کیوں؟“

”کیا آپ کو شک ہے کہ میں نے اپنے شوہر کو قتل کیا ہے؟“ ٹاہید نے جواب دینے کی بجائے الٹا سوال کر دیا۔

”کیا یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔“ تھانیدار نے کہا۔ اب ٹاہید نے جواب دینے کی بجائے رونا شروع کر دیا۔ دوسرے کمرے میں مقتول اور ٹاہید کے عزیز واقارب بیٹھے تھے۔ ٹاہید کے باآواز بلند رونے دھونے پر وہ اندر آ گئے۔

”انسپکٹر صاحب آپ کیوں اس بھاری کو خواہ مخواہ

بھی سول کپڑوں میں ٹاہید کے گھر آ جاتا اور ٹاہید کو ڈرائنگ روم میں بلوا کر اس سے ہمدردی جتانے کے انداز میں اپنے مطلب کی باتیں پوچھتا جاتا۔ جہاں تک ڈیکٹی کا تعلق تھا گھر سے بقول مقتول کی بیوہ زیور اور نقدی کے علاوہ کوئی دیگر سامان نہیں گیا تھا۔ ہاں البتہ یوں لگتا تھا کہ گھریلو سامان کو بھی کافی کھد میڑا گیا ہے۔ مثلاً میزوں کی درازیں اور کپڑوں کی الماریوں کے دروازے کھلے پڑے تھے۔ وی سی آر اور ٹی وی ٹرائی بھی اپنی جگہ سے کافی ہٹی ہوئی تھی۔ کچھ ایچی کیسوں کے تالے بھی ٹوٹے ہوئے دکھائی دیتے تھے اور ان کے اندر سے بہت سے کپڑے باہر بکھرے پڑے تھے۔ تھانیدار نے گھر میں واضح ہدایات دے رکھی تھیں کہ جب تک وہ نہ کہے کسی چیز کو ہاتھ نہ لگایا جائے اور نہ ہی کوئی چیز اپنی جگہ پرواپس ہی رکھی جائے تاہم تھانیدار کو ابھی تک واردات کا کوئی اشارہ نہیں مل رہا تھا۔

”ڈاکو اور قاتل کس مہارت سے اپنا کام کر گئے کہ کوئی گھر اکھوج ہی نہ چھوڑا؟“ تھانیدار نے سوچا۔ ”گھر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

اور ٹاہید مطمئن سی دکھائی دینے لگی اور اکثر سوال کرنے لگی۔ ”انسپکٹر صاحب آخر میرے خاوند کے قاتل اور گھر میں ڈاکہ ڈالنے والے لیئرے کب گرفتار ہوں گے؟“

تھانیدار وارث خان کا ایک ہی جواب ہوتا بہت جلد۔ تھانیدار کبھی وردی میں ہی ٹاہید کے گھر آ جاتا تھا۔ وہ ٹاہید کے بچوں کے ساتھ نہایت شفقت سے پیش آتا اور انہیں پیار کرتا۔ بڑے بیٹے اشفاق کو تو اس نے اپنے ساتھ خوب مانوس کر رکھا تھا۔ تھانیدار کو وردی میں دیکھ کر اشفاق بہت خوش ہوتا تھا۔ وہ اسے انکل کہنے لگا۔ ایک دن اشفاق نے تھانیدار سے کہا کہ وہ بھی بڑا ہو کر پولیس انسپکٹر بنے گا اور ڈیڑی کے قاتلوں کو پکڑے گا اور انہیں

”ہاں جی بتاؤ انسپکٹر صاحب کو کہ کمرہ کیوں بند کیا گیا تھا؟“ ماموں نے ناہید سے شفقت بھرے لہجہ میں پوچھا۔

”کسی نے کوئی کمرہ بند نہیں کیا تھا۔“ ناہید اپنے پہلے الفاظ بھول چکی تھی یا جان بوجھ کر پلٹا کھا گئی۔

تھانیدار اٹھا اور باہر نکل کر لان میں کھیلنے لگے اشفاق کو آواز دی۔ ”اشفاق بیٹے دیکھیں آپ کے مہمان آئے ہیں اور آپ باہر کیا کر رہے ہیں اندر آ جاؤ۔“

تھانیدار نے جا کر اشفاق سے مصافحہ کیا اور اس کا ہاتھ پکڑے اسے اندر لے آیا جہاں سب بیٹھے تھے۔

”ہاں بچے مجھے وہ بات پھر بتاؤ جب آپ لوگ اپنے ڈیڑی کی چٹنیں بن کر تینوں بھائی بہن ان کے کمرے کی طرف دوڑتے آئے اور کمرے کے دروازے کو کھول کر اندر چلے گئے۔“

”نہیں نہیں انگل! ہم نے دروازہ کھولنے کے لئے ہینڈل گھمانے کی کوشش کی تھی لیکن کمرہ اندر سے بند تھا۔ ہم ڈیڑی کی چٹنیں بن کر چپخنے لگ پڑے لیکن اندر سے دروازہ کھول کر مئی نے کہا کہ اندر ڈاکو تمہارے ڈیڑی کو مار رہے ہیں وہ تمہیں بھی مار ڈالیں گے تم فوراً اپنے کمرے میں جا کر کمرہ اندر سے بند کر لو پھر ہم نے ایسا ہی کیا تھا۔“

”کیوں شازیہ؟“ اس نے بہن کی جانب دیکھتے ہوئے کہا اور بہن نے بھی ہاں میں سر ہلا دیا ناہید نے غصیلی نظروں سے بیٹے کو دیکھا۔

دراصل ناہید کو بیٹے کو ایسی بات بتانے سے منع کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا اس نے اتنی پروا نہیں کی اس بات کی۔ اب ناہید نے اپنے پہلے بیان کی خود ہی تردید کر ڈالی تھی۔ ادھر تھانیدار کا شک یقین میں بدل گیا۔ اسے یقین ہو چلا کہ اسے خاندان کے قتل میں ناہید بھی ملوث ہے۔ ناہید سے مزید تحقیق ناگزیر ہو گئی تھی۔ جو کہ

پریشان کر رہے ہیں۔ آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔“

ان میں سے چند ایک نے سختی بھرے لہجہ میں تھانیدار سے بات کی۔

”میں تو ناہید بیگم کو پریشان نہیں کر رہا“ تھانیدار نے اطمینان سے کہا۔ ”یہ خود ہی خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہیں۔ تازہ تازہ صدمہ ہے بات بے بات پر رو دیتی ہیں۔“

ناہید تھانیدار کی زبانی یہ بات سن کر اور زور سے رونے لگ پڑی۔ اندر آنے والی چند خواتین جن میں ناہید کی دو بھائیاں اور دو بہنیں شامل تھیں ناہید سے گلے لگ کر رونے لگیں۔

”تھانیدار صاحب آپ نے تو ہمارے گھر کو تھانہ بنالیا۔ ہم یہاں بچی کی دلجوئی کے لئے آئے ہوئے ہیں، اس کا دکھ بانٹنے آئے بیٹھے ہیں، آپ اس کے صدمہ کو پھر سے تازہ نہ کریں۔ ورنہ ہماری بچی پر اس کا خطرہ کہ اثر پڑے گا۔ خدا نخواستہ اس کا جینی تو ازن بھی بگاڑ سکتا ہے۔“ یہ ادھر عمر ماموں کے الفاظ تھے جو تھانیدار کو غم کرنا پڑے۔

”ناہید سے آپ نے جو پوچھا ہے سب کے سامنے پوچھیں۔ ہم بھی تو جانیں کہ آپ اس سے کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟“ ماموں صاحب پھر گویا ہوئے۔

”چلیں یوں ہی سکی میں بڑوں کی بات کے کیسے ٹال سکتا ہوں۔“ تھانیدار نے ناہید کو خیر نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

روٹی ہوئی ناہید نے تھانیدار کی بات سن کر چونک کر تھانیدار کی جانب دیکھا اور اچانک چپ ہو گئی۔

”آپ سب لوگ مجھے ناہید سے یہ پوچھنے کی اجازت دیں کہ واردات کے وقت انہوں نے قاتلوں اور مقتول کے ساتھ مل کر کمرے کو اندر سے لاک کیوں کر رکھا تھا؟“

آپ کے اخبار کے لئے نہایت چٹ پٹی خبر ہے۔
”بیوی نے اپنے آشنا سے مل کر خاوند کو قتل کر دیا۔“

”تاہید اپنے خاوند کی قاتلہ نکلی۔ تاہید نے اقبال جرم کر لیا۔“

ادھر جو نمی یہ اخبار ٹیلر ماسٹر مظہر کے ہاتھوں میں پہنچا اس نے فوراً ایک کار میگر (نوکر) دوڑا دیا کہ وہ رکشہ لے آئے۔ وہ فوراً رکشہ لے آیا اور مظہر اقبال رکشہ میں بیٹھ گیا۔ رکشہ کے چلے جانے کے کوئی پندرہ منٹ بعد پولیس ٹیلر تک شاپ پر پہنچی لیکن طر م فرار ہو چکا تھا۔ مظہر نے جب اخبار میں یہ پڑھا کہ تاہید گرفتار ہو گئی ہے تو اسے اپنی موت نظر آنے لگی کہ وہ عورت ذات ہے پولیس کے سامنے سب کچھ اکل دے گی۔ پولیس نے چند دیگر جگہوں پر چھاپے مارے جہاں قاتل مظہر اقبال آیا جایا کرتا تھا لیکن وہ نزل سکا اور یوں دن گزرنے لگے۔ قاتل کی گرفتاری نہ ہونے پر مارکیٹ کی تاجر برادری میں بے چینی بڑھنے لگی۔ ساتھ ہی پولیس پر دباؤ بہت بڑھنے لگا کہ تاجر مرزا اشرف بیگ کے قاتلوں کو جلد از جلد گرفتار کیا جائے۔ پولیس قاتلوں سے مل گئی ہے یہ پولیس اور قاتلوں کی ملی بھگت ہے۔ پولیس نے قاتل فرار کرا دیئے۔ روزانہ اخبار ان خبروں سے بھرے ہوتے۔

ایک اخبار نے تو قاتلوں کی عدم گرفتاری پر دنوں کی گنتی شمار کرنا شروع کر دی۔ دو سو دن، پندرہ ہواں دن، بیسواں دن، تاجر مرزا اشرف بیگ کے قاتلوں کا سراغ نہ ملا۔ پولیس کی ناکامی کا منہ بولنا ثبوت ہے۔ ادھر پولیس نے ملک کے بڑے بڑے شہروں کے تھانوں میں اشتہار شہر وغوغا دے دیا۔ اس کے جواب میں قریب 90 دنوں کے بعد کراچی کے فیڈرل بی ایریا کے ایک تھانے سے اطلاع آئی کہ اس علاقہ میں ایک مشکوک شخص پایا گیا ہے مگر اس نے چھوٹی چھوٹی دادرسی چھوڑی ہوئی ہے لیکن

اس کے گھر میں اس کے تمام عزیز واقارب کی موجودگی میں نہیں ہو سکتی تھی۔ تھانیدار نے مقتول کے دونوں بھائیوں سے بات کی کہ وہ اپنے بھائی کے قاتلوں تک پہنچنے میں اس کی مدد کریں۔ اس کے لئے تاہید سے مزید تفتیش ضروری ہو گئی ہے۔ کیونکہ شک کے تانے بانے تاہید کی ذات پر بنے جانے لگے ہیں۔ لہذا اسے تاہید کو تھانے لے جانا پڑے گا۔ تاہید کے لواحقین نے بہت واویلا کیا اور تھانیدار کے ساتھ ان کا رویہ کافی جارحانہ اور دھمکی آمیز تھا۔ بہر حال مقتول کے بھائیوں نے تاہید کو تھانے لے آنے کی مخالفت ترک کر دی۔

تاہید کو تھانے لایا گیا۔ چودھری وارث خان ایک تجربہ کار اور ماہر تھانیدار تھا۔ وہ اپنے کام میں پورا تھا۔ سوال در سوال اور تھوڑی سی کوشش کے بعد تاہید نے اقبال جرم کر لیا۔ ویسے بھی پولیس کے ہتھ چڑھی ہوئی تاجر بہ کار اور پہلا جرم کرنے والی عورت کے پاس اقبال جرم کرنے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ اس نے اپنے آشنا کا

صبح طلوع ہو چکی تھی جب تاہید اپنا اقبالی بیان قلمبند کر رہی تھی تھانیدار وارث خان نے فوراً چھاپ مارٹیم تشکیل دے دی تاکہ شریک کار قاتل رانا مظہر اقبال کی گرفتاری عمل میں لائی جاسکے۔ ادھر ٹیلر ماسٹر مظہر اقبال کا معمول تھا کہ وہ ہر روز صبح سویرے شاپ پر پہنچتے ہی اخبار دیکھتا تھا۔ تاہید کیس کا ان دنوں بہت خبر چا تھا۔ اخبار والوں کی یہ کوشش ہوتی کہ سنسنی خیز واقعہ کی سب سے پہلے اپنے اخبار پر خبر لگائیں۔ لہذا صحافی راست بھر اس نوہ میں لگے رہے تھے۔ ایک صحافی نے آدمی رات کو تھانہ تھانے فون کر کے تاہید کیس کی تازہ خبر لیتا چاہی تو اسے ایس آئی کریم بخش نے جو تاہید سے پوچھ کچھ میں موجود تھا اس نے اندازہ لگا لیا کہ قاتلہ تاہید ہی ہے۔ صحافی نے جب خبر پوچھی تو کریم بخش نے کہہ دیا کہ یہ آج کے

کے ہتھے چڑھتے ہی اقبال جرم کر لیا اور پولیس کو دہائی دی کہ وہ شوگر کا مریض ہے اور انسولین لینے کا عادی ہے۔ جس کے نہ ملنے پر اس کی جان کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ علاوہ ازیں پاؤں میں بیڑیاں ڈالے جانے کی وجہ سے اس کی ٹانگوں پر زخم آ گئے ہیں۔ اس نے پولیس سے یہ بھی التجا کی کہ اس کی بیڑیاں کھول دی جائیں اور اس کے زخموں کا علاج کیا جائے لیکن پولیس والوں نے اس کی ایک نہ سنی اور اسے علاج مہیا نہ کیا۔ وہ یہی کہتے رہے کہ یہ ٹیکر کر رہا ہے اسے کسی قسم کی کوئی سہولت نہیں ملے گی۔

آخر ایک روز جب اس کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی تو اسے ہسپتال پہنچایا گیا لیکن جب تک اس کے علاج میں کافی دیر ہو چکی تھی اور ہسپتال پہنچ کر ناہید کے ساتھ مرزا اشرف بیک کے قتل میں ملوث ٹیلر ماسٹر رانا مظہر اقبال نے دم توڑ دیا۔ ادھر ناہید کو اپنے آشنا کے ساتھ مل کر خاوند کے قتل کے جرم میں عمر قید کی سزا ہو گئی۔

ٹیلر ماسٹر رانا مظہر اقبال کی حراست کے دوران تھانیدار چوہدری وارث خان نے اس سے پوچھا کہ کراچی میں تم نے جو شادی دفتر بنا رکھا تھا تو پولیس کے چیلنج سے پہلے تم کتنے لوگوں کی شادیاں کراچیکے تھے؟ تو جواب میں اس نے تھانیدار کو بتایا۔

”جب سے میں نے شادی دفتر کھولا آپ پہلے اور آخری شخص تھے جنہوں نے میرے دفتر آ کر مجھ سے شادی کروانے کے لئے کہا ورنہ میرے پاس دیگر کوئی Client نہیں آیا تھا۔“

اس کہانی کا یہ پہلو بڑا فکرائیگر اور شرمناک ہے کہ ناہید کو اللہ نے اچھا خاوند، من چاہی اولاد اور ہر خوشی دے رکھی تھی۔ اس نے یہ نعمتیں ٹھکر کر اپنی دنیا و آخرت برباد کر لی۔ محض ایک راگ نبر کے لئے جو آخر کار اس کے لئے راگ ہی ثابت ہوا۔

باقی کا حلیہ مستہر کردہ خاکے سے ملتا جلتا ہے۔ اطلاع ملنے پر لاہور کے متعلقہ تھانے سے سب انسپکٹر چوہدری وارث خان کی سرکردگی میں پولیس ٹیم کراچی روانہ ہو گئی اور کراچی جا کر فیڈرل بل ایر یا پٹیجی جہاں سے اس مشکوک شخص کے بارے میں اطلاع آئی تھی۔

پتہ کرنے پر معلوم ہوا کہ قریب ڈیڑھ ماہ سے اس علاقہ کی ایک مسجد میں ایک انتہائی پرہیزگار شکل و صورت والے قاری صاحب درس قرآن دینے لگے ہیں اور امام مسجد کی غیر موجودگی میں امامت بھی کرا لیتے ہیں۔ ساتھ ہی ان کا ایک میرج بیورو ہے۔ دیگر اوقات میں وہ اس شادی دفتر میں بیٹھتے ہیں۔ پہلے دن سب انسپکٹر چوہدری وارث خان سول کپڑوں میں اکیلا شادی دفتر پہنچا تا کہ وہ اس مشکوک شخص کا جائزہ لے سکے کہ آیا یہی شخص ٹیلر مظہر اقبال ہے یا کوئی اور ہے۔ تھانیدار وارث خان نے شادی دفتر جا کر اس شخص کو بتایا کہ وہ ایک ملازم پتہ آ دی ہے اور کسی محکمہ کا نام لے کر کہا کہ وہاں کام کرتا ہے اور شادی کرنا چاہتا ہے۔ اس کے لئے کوئی اچھا سا رشتہ تلاش کر کے دیں۔ ایک دن چھوڑ کے سب انسپکٹر دوبارہ آفس چلا گیا۔ شادی دفتر والے صوفی صاحب نے بتایا کہ اس وقت کوئی مناسب رشتہ موجود نہیں ہے ان کے پاس البتہ جوئی کوئی موزوں رشتہ جو کہ آپ کے معیار پر پورا اترے ملا وہ انہیں اطلاع کرے گا۔ اس دوران انسپکٹر وارث خان نے گزشتہ چار پانچ دنوں سے شادی دفتر والے صوفی صاحب کو اپنے تجربہ کی آنکھ سے جانچتا شروع کر دیا۔

جب اسے پکا یقین ہو گیا کہ شادی دفتر والا شخص وہی ٹیلر ماسٹر ہے جسے پولیس ڈھونڈتی پھر رہی ہے تو سب انسپکٹر نے اسے گرفتار کر لیا اور اسے گرفتار کر کے لاہور لایا گیا اور لاہور لا کر اس کے ہاتھوں میں جھکڑی اور پاؤں میں بیڑیاں پہنا دی گئیں کیونکہ اس نے پولیس کی بہت بدنامی کرائی اور اسے بہت تنگ کیا تھا۔ اس نے پولیس

آوازِ بید

لالہ جی! شکل تو تمہاری شریفیوں والی ہے مگر تم نے کورٹ میں جو جعلی دستاویز پیش کی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس دھرتی پر تم سے بڑا نو سرباز پیدا ہی نہیں ہوا

محمد رضوان قیوم



قسط: 6



قائم رکھنے کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔

میں تین چار روز لالہ جی کے گھر نہ گیا کہ نوتن سے سامنا نہ کرنا پڑے۔ مگر اتوار کے روز وہ دوپہر کے وقت خود ہی ہمارے گھر آئی۔ وہ جان بوجھ کر دوپہر کو اس لئے آئی تھی کہ اسے یہ بخوبی پتا تھا کہ اس وقت ہمارے گھر والے عصر کے وقت تک آرام کی غرض سے سوتے تھے۔ وہ اراداً میرے کمرے میں آئی۔ میں جکی پکی نیند کے عالم میں لیٹا ہوا تھا۔

”ستار! تم سو رہے ہو؟“ اس نے بڑے اعتماد اور سنجیدگی سے یہ الفاظ کہے۔ اس کی آواز میرے کانوں میں پڑی تو جھٹکے سے میری آنکھ کھل گئی۔

”تم یہاں اور اس وقت کیسے؟“ میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

”میری آمد پر تم اتنے پریشان کیوں ہو رہے ہو؟“ نوتن نے بڑے لاڈ سے پوچھا۔ ”میں کیا تمہارے پاس نہیں آ سکتی؟“

”نہیں، تم یوں اس طرح میرے پاس نہیں آ سکتی۔“ میں نے سخت لہجہ میں کہا۔ ”تمہیں کیا کام ہے اور واقعی تمہیں کوئی کام ہے تو تمہیں چلی منزل میں موجود اماں کے پاس جانا چاہئے تھا۔“

”تم تو اس طرح پریشان اور حواس باختہ ہو رہے ہو جیسے میں زندگی میں پہلی بار تمہارے پاس آئی ہوں۔ ہم بچپن سے ایک جگہ پلے، بڑھے، کھیلے ہیں۔“ نوتن شکوہ کنناں ہوئی۔

”نوتن وہ بچپن تھا لیکن اب تم اور میں جوانی کی منزلوں کو چھو رہے ہیں۔“ میں نے سمجھایا۔ ”دیکھو تمہیں یہاں کسی نے دیکھ لیا تو یقیناً کروہم دونوں کے لئے بہت بُرا ہوگا۔ بالخصوص میں بے گناہ عتاب کا شکار ہو جاؤں گا۔ تم فوراً عتاب ہو جاؤ۔“

”اچھا چلی جاؤں گی لیکن میں نے تم سے چند

ستار عباسی عرف پاسو، اس کہانی کا راوی نہیں، خود بھی اس کہانی کا ایک کردار ہوں۔

جیسا کہ کہانی کے آغاز میں بتا چکا ہوں کہ لالہ جی کے بیٹے کلدھپ کی اور میری دوستی تھی اور ہمارا آزادانہ ایک دوسرے کے گھر آتا جاتا تھا۔ میں اکثر کلدھپ سے ملنے ان کی حویلی میں چلا جاتا تھا۔ ہندوؤں میں ویسے ہی پردے کا کوئی رواج نہیں ہوتا۔ یہی وجہ تھی کہ کلدھپ کی بہن نوتن بے تکلفی سے پیش آتی تھی۔ اگر بات یہاں تک ہی رہتی تو کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن کچھ عرصے سے میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ میرے ساتھ کچھ اور طرح کی بے تکلفی ظاہر کرنے لگی تھی اور بڑی میٹھی نگاہوں سے دیکھتی تھی۔

میں کوئی بچہ تو نہیں تھا جو اس کی نگاہوں سے نظروں کا مطلب نہ سمجھ سکتا۔ مگر میں تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے اسے نظر انداز کر دیتا۔ وہ کوئی غلط قسم کی لڑکی نہیں تھی مگر میں اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا چاہتا تھا۔ وہ ہندو اور میں مسلمان۔ ہمارے راستے کی مقام پر بھی ایک نہیں ہو سکتے تھے۔

ایک دن کلدھپ کے پاس بیٹھا ادھر ادھر کی باتیں کر رہا تھا کہ اسی دوران نوتن میرے لئے لسی کا گلاس لائی۔ کلدھپ اپنے دھیان میں مجھ سے باتیں کر رہا تھا۔ نوتن نے میرے ہاتھوں میں لسی کا گلاس تھماتے ہوئے باقاعدہ پہلے میری نگاہوں میں اپنی نگاہوں کو ٹکرایا اور پھر اپنے ہونٹوں کو مسکراہٹ کی بجائے دیتے ہوئے ہلکی سی آکھ ماری۔

میں نے اس کی اس حرکت کو محسوس کیا لیکن میں نے اسے اپنے تئیں کوئی اشارہ نہیں دیا۔ نوتن مجھے غار ہو رہی تھی۔ ان نظروں سے دیکھتی ہوئی چلی گئی۔ میں نے جلدی جلدی لسی پی اور گھر آ گیا۔ میں نوتن کی عجیب حرکت کے بارے میں یہ سوچنے لگا کہ یہ نوتن کو کیا ہو گیا ہے۔ میں تو کبھی بھی بھول کر اس سے اس قسم کے تعلقات

ضروری باتیں کرتی ہیں۔“ اس نے ڈھٹائی سے کہا۔

”پہلے مجھے یہ بتا کہ جب میں کلدیپ سے ملنے آیا تھا تو تم نے کسی دیتے وقت کیا حرکت کی تھی؟ یقین کرو اس وقت میرا دل کر رہا تھا کہ تیرے چہرے پر تھپڑ ماروں نہیں۔“

”تو تمہیں اجازت ہے۔“ نوتن نے میری بات کاٹتے ہوئے اپنا گال میری جانب کرتے ہوئے کہا۔

”تم جتنے چاہو اس چہرے پر تھپڑ مار لو۔“

”گلتا ہے کہ اماں اٹھ گئی ہیں۔“ میں نے کسی کے قدموں کی آواز سن کر کہا۔ ”خدا کے لئے ٹوٹی الحال یہاں سے چلی جا، میں تیری بات بعد میں سنوں گا۔“

”نہیں تمہیں ابھی میرے دل کی بات سننا ہوگی۔“

”دیکھو میں ایک بار پھر تم سے ہاتھ جوڑ کر منت کرتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”جو کچھ بھی تمہارے دماغ میں خناس بن رہا ہے اسے اپنے دماغ سے نکال دو۔“

”تمہیں ہر حال میں میرے دل کی صدا سننی پڑے گی۔“ یہ کہتے ہوئے وہ میری جانب بڑھنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی اماں کے قدموں کی آواز قریب آنے لگی۔

”تم جلدی سے اس الماری میں چھپ جاؤ۔“ قدموں کی قریب آواز سے گھبرا کر میں نے کہا۔ وہ بڑی تیزی سے میرے کمرے میں موجود بڑی الماری میں جا کر چھپ گئی۔

”ارے ستار کس سے باتیں کر رہا تھا؟“ اماں نے اندر آتے ہوئے پوچھا۔

”کسی سے بھی نہیں اماں!“ میں نے تاروں ہوتے ہوئے کہا۔

”گلتا ہے اب میں واقعی بوڑھی ہو گئی ہوں۔“ اماں نے کہا۔ ”ارے نماز کا وقت ہو گیا ہے، چل وضو کر کے مسجد جا۔“

”اماں نے وضو کیا اور چلی گئیں۔ ان کے جانے

کے فوراً بعد کمرے میں موجود اس الماری کی جانب ”ہا جہاں وہ چھپی ہوئی تھی۔ میں نے جب الماری کے پٹ کھولے تو وہاں یہ منظر دیکھ کر میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی کہ نوتن کی دونوں آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں۔ ایک لمحے کو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کہ اس کی سانسیں بھی ساکت ہیں۔

گئی بات ہے اس وقت واقعی میرے پاؤں خوف کی وجہ سے لرزنے لگے۔ میں نے اسے بانہوں میں لے کر بستر پر لٹایا اور بڑی سرعت انگیزی سے اس کی نبض دیکھی وہ چل رہی تھی۔ اس سے مجھے یہ تسلی ہوئی کہ یہ کم از کم زندہ ہے مرنے کی بجائے صرف بے ہوش ہے۔

”کبخت پاگل تو نے مجھے کس امتحان میں ڈال دیا ہے۔“ میں نے غصے میں بوجھاتے ہوئے کہا تو اچانک میں نے اپنے کندھوں پر دباؤ محسوس کیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو نوتن بڑے عاشقانہ انداز میں منگواتے ہوئے مجھے دیکھ رہی تھی۔

”ارے میں نے تو تجھے آزماری تھی کہ تیرے دل میں میری محبت ہے بھی یا نہیں۔“

اس لمحے اس کا یوں ہنسنا مجھے ایسا لگا جیسے کہ کوئی میرے دماغ پر دست چلا رہا ہو۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ایک زوردار تھپڑ اس کے گال پر مارتے ہوئے کہا۔

”نوتن تیرا دماغ پلٹ گیا یا تمہارے گھر میں موجود پراسرار مخلوق نے تجھ پر بھی اپنے اثبات جانے شروع کر دیے ہیں۔ تو بھی دیا پورا مانا کی طرح آسیب زدہ ہو گئی ہے۔“

وہ بھی بڑی ڈھٹ تھی اس نے ایک تھپڑ کھانے کے بعد دوسرا گال بھی میرے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ ”تم مجھے جتنا مرضی مار لو لیکن میں آج تمہارے سامنے اپنے دل کی وہ بات کھول رہی ہوں جسے میں نے اپنے من میں نہ جانے کب سے چھپا رکھا ہے۔ میں آج اس کا برملا

کہتا ہے اب میں واقعی بوڑھی ہو گئی ہوں۔“ اماں نے کہا۔ ”ارے نماز کا وقت ہو گیا ہے، چل وضو کر کے مسجد جا۔“

”اماں نے وضو کیا اور چلی گئیں۔ ان کے جانے

کے فوراً بعد کمرے میں موجود اس الماری کی جانب ”ہا جہاں وہ چھپی ہوئی تھی۔ میں نے جب الماری کے پٹ کھولے تو وہاں یہ منظر دیکھ کر میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی کہ نوتن کی دونوں آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں۔ ایک لمحے کو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کہ اس کی سانسیں بھی ساکت ہیں۔

گئی بات ہے اس وقت واقعی میرے پاؤں خوف کی وجہ سے لرزنے لگے۔ میں نے اسے بانہوں میں لے کر بستر پر لٹایا اور بڑی سرعت انگیزی سے اس کی نبض دیکھی وہ چل رہی تھی۔ اس سے مجھے یہ تسلی ہوئی کہ یہ کم از کم زندہ ہے مرنے کی بجائے صرف بے ہوش ہے۔

”کبخت پاگل تو نے مجھے کس امتحان میں ڈال دیا ہے۔“ میں نے غصے میں بوجھاتے ہوئے کہا تو اچانک میں نے اپنے کندھوں پر دباؤ محسوس کیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو نوتن بڑے عاشقانہ انداز میں منگواتے ہوئے مجھے دیکھ رہی تھی۔

”ارے میں نے تو تجھے آزماری تھی کہ تیرے دل میں میری محبت ہے بھی یا نہیں۔“

اس لمحے اس کا یوں ہنسنا مجھے ایسا لگا جیسے کہ کوئی میرے دماغ پر دست چلا رہا ہو۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ایک زوردار تھپڑ اس کے گال پر مارتے ہوئے کہا۔

”نوتن تیرا دماغ پلٹ گیا یا تمہارے گھر میں موجود پراسرار مخلوق نے تجھ پر بھی اپنے اثبات جانے شروع کر دیے ہیں۔ تو بھی دیا پورا مانا کی طرح آسیب زدہ ہو گئی ہے۔“

وہ بھی بڑی ڈھٹ تھی اس نے ایک تھپڑ کھانے کے بعد دوسرا گال بھی میرے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ ”تم مجھے جتنا مرضی مار لو لیکن میں آج تمہارے سامنے اپنے دل کی وہ بات کھول رہی ہوں جسے میں نے اپنے من میں نہ جانے کب سے چھپا رکھا ہے۔ میں آج اس کا برملا

”چنانہ کرو میں خود اس کی ٹانگوں میں اپنا بنایا ہوا مخصوص مرہم لگا کر دو چار دنوں تک ٹھیک کر دوں گا۔“ دھونند نے اطمینان سے کہا۔ دھونند نے مانا کو اپنے پاس موجود مخصوص مرہم لگا کر اگلے دو چار دنوں میں بھلا چکا کر دیا۔

مانا اب بالکل نارمل انسانوں کی طرح رہنے لگا تھا۔ دھونند کے اس کامیاب توڑ کی جگہ جگہ واہ واہ ہونے لگی تو ارد گرد کے لوگ اس کے پاس اپنے رونے، مسائل لے کر آنے لگے۔ درحقیقت اس زمانے میں برصغیر کے اکثر علاقوں کے لوگ توہمات، جن، بھوت اور آسیب جیسے معالجات چیلوں جیسی توہمات پر زیادہ رجحان اور عقائد رکھتے تھے۔ یہی حال ہمارے شہر اور علاقہ کا بھی تھا۔

ہمارے علاقہ اور ارد گرد کے لوگ دھونند کو تنگ کرنے لگے کہ وہ ان کے گھر آ کر ان کے مسائل کو دیکھے، سنے اور ان کا توڑ کرے۔

وہ انہیں یہ کہہ کر ٹال دیتا کہ میں چند روز کے لئے صرف حویلی کے اندر موجود اسرار مخلوق کے اثرات کو ختم کرنے آیا ہوں۔ وہ اکثر حاجت مندوں کو ٹال دیتا تھا لیکن ایک آدھ لوگوں کے گھر جاتا تو وہ ان سے کوئی روپیہ و ہیلہ نہ لیتا تھا۔

”یہ بارہ سوار انتام کی گندی طاقت بہت قسبی والی ہے“ دھونند نے لالہ جی سے کہا۔ ”یاد رکھو اس گندی آتما کو بھگانے کے لئے مجھے بڑے سخت عمل سے گزرنا ہوگا۔ اس لڑائی میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“

دھونند نے جب یہ بات سب گھر والوں کے سامنے کی تو لالہ جی نے متفکرانہ لہجہ میں اسے کہا۔ ”تو اپنی بات واضح کر۔“

”لالہ جی! میں نے دیپا کے جسم کو بہت اچھی طرح سوچا ہے۔“ دھونند نے کہا۔ ”اس کے جسم میں انتام نامی چیزیں کا بڑا شدید غلبہ ہے۔ اس کے جسم سے مذکورہ مخلوق

اظہار کر رہی ہوں۔ میں نے جب سے جوانی کے زینے پر قدم رکھا ہے۔ تمہارا پیار میرے دل و دماغ میں چھایا ہوا ہے۔“

”یہ تمہارا دماغی خناس ہے۔“ میں نے زچ ہو کر کہا۔ ”میں تمہیں کیسے سمجھاؤں۔ اچھا تم ابھی خدا کے واسطے چلی جاؤ۔ اماں ابھی نماز پڑھ رہی ہوں گی تو گر بہ پا یہاں سے نکل جا۔“

”اچھا میرے دل کی بات کا جواب کب دو گے؟“ اس نے ڈھٹائی سے پوچھا۔

”تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔“ میں نے غصے پر قابو پا کر کہا۔ ”اور جو تیرے دماغ میں چل رہا ہے وہ ناممکن ہے۔“

میں نے اسے بڑی مشکل سے اپنے کمرے سے بھگایا۔ میں تنہائی میں اس خلاف توقع اظہار محبت کے بارے میں سوچتا رہا۔ نتیجتاً مجھے اس بات پر یقین کرنا پڑا کہ اس کے ذہن میں لالہ جی کی حویلی میں موجود اسرار مخلوق کا سایہ پڑنا شروع ہو گیا ہے۔ میرا تو ایک دل کیا کہ میں کلدیپ سے نو تن کی ان حرکات کا ذکر کروں لیکن میں نے خود ہی سوچا کہ میری اس بات سے اس کے دل کو نہ صرف شدید دکھ ہوگا بلکہ وہ نہ جانے اپنی بہن اور میرے کردار کے بارے میں کیا سوچے گا۔

ادھر دھونند نے مانا کو ایک بار پہلے سے زیادہ اور دیر تک پانی کی ہائی میں کھانکھانے کے اپنا مخصوص عمل کیا۔ وہ اس بار دھڑام سے ہائی سے ایسا غش کھا کر گرا کہ اس کے سامنے کے دو دانت بھی ٹوٹ گئے تھے۔ اس کے پاؤں کی کھال دیکھنے میں بالکل اس طرح ہو گئی تھی جیسے تازہ گندھے ہوئے میدے کی طرح سفید اور پھل ہو۔

”ارے لگتا ہے مانا کی ٹانگ کی کھال بالکل گل گئی ہے۔“ لالہ جی نے گھبرا کر کہا۔ ”اسے کسی ہسپتال لے جائیں۔“

کا قبضہ چھڑانے میں مجھے جو کسم کرنا پڑا گا اس میں ممکن ہے مجھے یاد دیا کو اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑیں۔
 ”نہیں نہیں، مجھے کچھ نہیں ہوگا۔“ دیا نے جرأت مندی سے کہا۔ ”میں اتنی اذیت برداشت کر لوں گی جتنی مانا نے اٹھائی ہے۔“
 ”ارے بیٹی! اگر تم نے آج یہ تکلیف نہ برداشت کی تو تم یقین کرؤ تم جب تک جیوت رہو گی ہمیشہ مصیبت میں رہو گی۔“ دھونند نے کہا۔
 ”جو تھی جی مجھے مانا کی نسبت کتنی گنا تکلیف برداشت کرنا پڑے گی۔“ دیا نے دھونند سے پوچھا۔
 دھونند نے ایک لمحے کو اس کی جانب دیکھا اور ایک ٹھنڈی آہ لیتے ہوئے کہا۔
 ”تجھے مانا کے مقابلہ میں دو گنی تکلیف برداشت کرنی پڑے گی۔ اب یہ تیرے پر منحصر ہے کہ اس موذی چڑیل سے ہمیشہ کے لئے چھٹکارہ حاصل کرنے کے لئے ایک بار یا دو بار تکلیف برداشت کر۔“
 ”دھونند جی آپ کہتے ہیں کہ مجھے مانا کے مقابلہ میں دو گنا کشت اٹھانا پڑے گا۔“ دیا نے کہا۔ ”جبکہ اس کے توڑ کے عمل کے دوران مانا کی دونوں ٹانگوں کی کھال گل مٹی تھی اگر مجھے اس کے مقابلہ میں دو گنا وقت، اچھے گرم پانی میں کھڑا رہنا پڑا تو اسی حساب سے تو میرے دونوں پیروں کے گوشت کے ساتھ ہڈیاں بھی گل سڑ جائیں گی۔“
 ”ہاں سچی بات ہے میں تمہارے پاؤں کے گوشت کی سلامتی کی ضمانت نہیں دے سکتا۔“ دھونند نے کہا۔
 ”تو کیا ہماری بہو اپنا چ، چلنے پھرنے سے محروم ہو جائے گی؟“ تائی سنتو نے پریشانی کا اظہار کیا۔
 ”مجھے شک ہے کہ میں اپنے عملیات اور چنے بنائے مخصوص مریہم کی مدد سے اس کے زخم مندمل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔“ دھونند نے یقین سے

لہجہ میں کہا۔
 دیا انتہائی خوفزدہ ہو کر سنتو تائی سے پٹ کر رونے لگی۔
 ”گھبراؤ نہیں بیٹی!“ تائی سنتو نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ ”ایسا کرنا دھونند جی کی مجبوری ہے اور اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔ تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی اچھا دھونند جی! آج تو دیا کو اپنے عمل میں نہ لائیں۔ اسے ایک آدھ دن وحشی طور پر اس کشت بھرے عمل کے لئے تیار ہونے دو۔“
 ”اچھا جیسے آپ کی مرضی۔“ دھونند نے کہا۔

۰۰۰

علی الصبح رسوئی کی چوکت میں بڑے عرصہ بعد بڑی خوفناک آگ لگی۔ جس کا شعلہ پیسے گئے والی آگ سے بڑا تھا۔ اس پر بڑی مشکل سے قابو پایا گیا۔
 ”گلتا ہے انتام رسوئی سے باہر نکلنے کو ہے لیکن ہو سکتی ہے۔“ دھونند نے یہ مشاہدہ کرنے کے بعد کہا۔ ”وہ اپنا دائرہ وسیع کر کے پوری حویلی میں اپنا تسلط قائم کرنا چاہتی ہے۔“
 دھونند نے لالہ جی کی حویلی میں جمع اس کے ان خاص دوستوں کے سامنے یہ بات کی تھی جن کو لالہ جی نے آئندہ لائحہ عمل کے مشورہ کے لئے بلا یا تھا۔
 ”تو یہاں آ کر کیا کر رہا ہے؟“ محلہ کے ایک بزرگ نے اس نے سوال کیا۔
 ”میں یہاں کے باسیوں اور حویلی پر چھائی نحوست دھونے کے لئے آیا ہوں۔“ دھونند نے اس کی جانب غصے سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں من سے چاہتا ہوں کہ میں اس حویلی میں بسنے والے باسیوں کے جسموں سے انتام کے اثرات کو ہٹا سکوں لیکن میں کیا کروں یہ آسب زدہ لوگ میرے عمل کے کشت کوسپنے سے کتراتے ہیں۔“

چٹا کی نذر کر دیں آپ کو اس امر کی اجازت ہے۔

”ٹو پانی بھری پانی میں کھڑے ہونے سے پہلے اپنے منہ میں کوئی مضبوط لکڑی پھنسا لے۔“ دھونند نے اپنا عمل شروع کرنے سے پہلے دیا کو کہا۔ ”اور وہ آخری وقت تک کھولتے پانی کی گرامہٹ کو برداشت کر لے۔ کسی حالت میں پاؤں کھولتے پانی سے باہر نہ نکالنا۔“

دیا کے دانتوں میں موٹی لکڑی پھنسی گئی۔ ”اپنی نگاہیں آسان کی طرف کرلو۔ زمین کی جانب نہ دیکھنا۔“ دھونند نے اسے حکمیہ انداز میں تنبیہ کرنے کے بعد اپنا جاب شروع کیا۔ اس کا یہ عمل حویلی کے سارے باسی جن میں ملیش بھی شامل تھا۔ بڑے تجسس، پریشانی سے دیکھ رہے تھے۔ دھونند نے ان لوگوں کو بھی بڑی سختی سے کہا کہ تھا کہ تم لوگوں نے بھی ہر حال میں اپنے جذبات کو قابو رکھتے ہوئے کسی قسم کی مداخلت نہیں کرنی۔

دھونند نے اپنے پاس موجود تھیلے میں سے ایک کالے رنگ کا چوٹی ڈنڈا اٹھایا اور اسے کچھ جادوئی عمل پڑھتے ہوئے دیا کے منہ کے قریب لا کر آہستہ آہستہ ٹھکرایا تو اس کے منہ سے ہلکے ہلکے پیلے رنگ کا جھاگ نمودار ہونے لگا۔

”ارے کیا ہو رہا ہے؟“ ملیش نے گھبرا کر کہا۔ دھونند نے ڈنڈے کی رفتار کو دھیمے سے ہونے بڑی قہر بھری نگاہوں سے اسے دیکھا۔ منہ پر انگلی رکھ کر اشارہ کیا کہ چپ رہو۔

”لالہ جی نے بھی اس کی پشت پر انگلی رکھتے ہوئے چپ رہنے کا اشارہ دیا۔

اب دھونند نے اپنے جادوئی ڈنڈے کی رفتار کو مزید تیز کر دیا۔ پانی سے اٹھتے پانی کے بلبلوں کی آواز۔

اس سے اٹھتے ہوئے دھواں کے ساتھ ساتھ دیا کے منہ سے نکلتی سسکیوں کی آوازیں اور چڑھی آنکھیں اس امر پر عیاں تصویر پیش کر رہی تھیں کہ وہ کتنی اذیت اور سرب جہیم

”ارے لالہ تیرے گھر والے دھونند کی محنت کے ساتھ بڑا عظم کر رہے ہیں۔ تیرے پر یوار کو چاہئے کہ جوتی جی کے ساتھ تعاون کریں۔“ ابا نے یہ بات لالہ جی کو سختی سے کہی۔

”اچھا دھونند جی آپ اب کیا چاہتے ہیں؟“ لالہ جی نے کہا۔ ”اب یہاں وہی ہوگا جو آپ چاہیں گے۔“

”آپ سب سن لیں۔“ دھونند نے بلند آواز میں کہا۔ ”میں یہاں کسی لالہ جی کے تحت نہیں آیا ہوں۔ بس نکیش جی کے پر یوار کے ایک احسان کو چکانے کی خاطر آیا ہوں۔ میں نے کسی سے کچھ بھی لینا دینا نہیں ہے۔ میں اپنے پلے سے ملل پاس کرتا ہوں۔“

”دھونند جی ہمیں آپ کی شکایت پر پورا دھواں ہے۔“ ایک بزرگ محلے دار نے کہا۔ ”اس لئے ہم نے آپ کو اس حویلی میں موجود ہر اس مخلوق کو لکھنے کا کام سونپا ہے۔ آپ کو اب کسی جانب سے بھی شکایت نہیں آئے گی۔ آپ کے ساتھ پورا تعاون کیا جائے گا۔“

حویلی میں بیٹھے بزرگوں نے دیا کو اپنے پاس بلا دیا اور اسے کھاتے ہوئے کہا۔ ”دھونند جی جیسا کہتے ہیں ویسا ہی تم کرو۔“

”لیکن یہ تو مجھے جس اذیت سے گزارنا چاہتے ہیں وہ کسی موت سے کم نہیں ہے۔“ دیا نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

”ارے یہ خواہ مخواہ ڈر رہی ہے۔“ دھونند نے کہا۔

”میں تجھے یقین دلانا ہوں کہ تو مرے کی نہیں زندہ رہے گی۔ بس تو دل بڑا کر کے پانی کے اندر کھڑی ہو جا تجھے ساری زندگی کے لئے اس منحوس چڑیل سے نکلتی مل جائے گی۔“

”دھونند جی! آپ کو میری طرف سے اجازت ہے۔“ دیا اپنی آنکھیں میسج کر بولی۔ ”بے شک مجھے اپنے عمل کی اذیت سے جیون دے دیں یا میرے وجود کو

خصوصیات ہیں۔ اگر میرے کلمات کے درمیان کسی کا غیر ضروری جملہ شامل ہو جائے تو دشمن مخلوق اس سے فائدہ اٹھا کر کسی بھی جانب اپنا بڑا کاری وار کر سکتی ہے لیکن بھگوان کی دینا سے میں نے اپنے جاپ سے انعام چنیل کو سنہلنے کا موقع تک نہیں دیا ہے۔ میں نے دیپا کے وجود میں موجود اتم (قوت مدافعت) کو اتنا مضبوط کر دیا ہے کہ اب دیپا کی بقید زندگی میں کوئی ہوائی مخلوق اس پر اپنا تسلط بھانے کی جرأت نہیں کر سکتی۔

”اس کی مٹی، ادھڑی پاؤں کی کھال پر کیا لگاتا ہے؟“ تائی سنتو نے پراساندا میں پوچھا۔

”ماتائی! آپ اس کی جفا نہ کریں۔“ دھوند نے کہا۔ ”میں اس کے پاؤں کی ادھڑی کھال پر ابھی اپنا بنایا ہوا مخصوص مرہم لگاتا ہوں جس کا پتھر دیکھ کر آپ کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ جائیں گی بلکہ آپ سب لوگ میرے عمل کے محقر ہو جاؤ گے۔“

دھوند نے زمین پر پڑی دیپا کے دونوں پاؤں میں اپنا بنایا ہوا مخصوص مرہم لگایا تو کچھ لمبے بعد سب کی نظروں کے سامنے دیپا کے دونوں پاؤں میں نظر آنے والی ادھڑی سفید کھال معمول کے مطابق نارمل ہو گئی۔ دیپا بھی فرش سے اٹھ کر بیٹھ گئی لیکن وہ بالکل سکتے کے عالم میں خاموشی سے اپنے مونے مونے ڈیلے تمھاری تھی۔

سنتو تائی مکیش اس کے قریب گئے۔ مکیش نے اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ ”بہنی کچھ بول، ٹو ٹھیک تو ہے۔“

”مجھے کیا ہوا پتا تائی!“ دیپا نے حیرانی سے پوچھا۔ ”میرے کردار سے سارے لوگ کیوں کھڑے ہیں؟“

”ارے بیٹا! سب ٹھیک ہے کچھ نہیں ہوا۔“

دھوند نے خود ہی اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے اسے تسلی دی۔ اس کے بعد اس نے سنتو تائی و کہا۔

کا شکار ہے۔ اس کے منہ سے پہلے ہلکے پہلے اور بعد میں گہرے سرخ رنگ کا لعاب خون کی آمیزش کے ساتھ نکلنا شروع ہو تو اس نے ایک دلخراش چیخ ماری دھڑام سے زمین پر گر کر بے سندھ ہو گئی۔

”ہائے بھگوان مر گئی میری بہو!“ تائی سنتو نے دھار ماری۔ ”دیپا تمہیں کچھ نہیں ہو سکتا۔“

وہاں موجود تقریباً سارے افراد رونے لگے یا شدید پریشانی کا شکار تھے۔

دیپا کی دونوں ٹانگیں بالکل چربی کی مانند سفید مٹی ہوئی، ادھڑی کھال کے ساتھ بڑی ناقابل دید اور بھیا تک لگ رہی تھیں۔

”ہائے رام میری بیٹی کیا عمر بھر کے لئے اپنا ج تو نہیں ہو گئی۔“ مکیش نے گہرا کر کہا۔

دھوند نے اس کی طرف ایک بار پھر بڑی بھائی جھانک کر دیکھتے ہوئے اسے کہا۔

”تو بڑا گدھا اور عقل سے پیدل انسان ہے۔“

”دھوند! اپنی اوقات میں رہ کر بات کر، یہ ٹو میرے سمہیا نے کے سامنے اتنی تذلیل کیوں کر رہا ہے؟“ مکیش نے پھوٹے ہوئے سانس کے ساتھ اسے کہا۔

”ٹو ہے ہی اسی قابل۔“ دھوند نے کڑک کر کہا۔

”ٹو واقعی گدھے کی عقل کے مترادف ہے۔“

”الہ آگے بڑھا اور اس نے دھوند سے پوچھا۔

”آپ میرے سمہی جی کو ان نازیبا الفاظ سے مخاطب نہ کریں اور یہ آپ اسے ایسا کیوں کہہ رہے ہیں؟“

”ارے اللہ جی! آپ کو کیا معلوم کہ اس جاہل کے درمیان میں بولنے سے میرا، دیپا یا آپ میں کسی یا اس حویلی کا کتنا نقصان ہو جاتا۔“ دھوند نے کہا۔ ”آپ کو کیا معلوم میرے عمل کے کلمات کے کیا کرشمات اور

لالہ کیدار ناتھ نے اسے یہ تجویز دی تو اس نے ایک ٹھنڈی آہ لی اور اپنے اندر سانس کو کھینچے ہوئے جوباب کہا۔

”ہاں، آپ کی یہ بات سولہ آنے ٹھیک ہے کہ اپنے عمل کی کچھ نہ کچھ سیوا قبول کر لینی چاہئے لیکن میں کیا کروں میرے گرد نے مجھے یہ گیان سکھانے سے پہلے مجھے کوئٹل کر دیا تھا۔ یعنی اس نے اس شرط پر مجھے یہ علم سکھایا تھا کہ میں کبھی بھی اپنے کام کا معاوضہ وصول نہ کروں اور اگر کبھی میرے دل میں ایسا آ گیا تو آپ دشوار کریں کہ میرے گیان کی تمام قیمتی تحلیل ہو جائے گی اور سچی بات ہے مجھے کسی سے دھان پان وصول کرنے کی رتی برابر طلب نہیں ہے۔“

”دھونند جی! اب آپ کا اگلا قدم کیا ہو گا؟“
کلدھپ نے موقع پا کر سوال کیا۔
”یوں سمجھو کہ ابھی میرے کام کا صرف پون حصہ ہی ہوا ہے۔“ دھونند نے جواب دیا۔

”پون حصہ؟“ لالہ جی نے حیران ہو کر دہرایا۔
”ہاں، لالہ جی! اس حویلی کے باسیوں کے جسموں، دیواروں، بالخصوص رسوئی کے اندر انتہائی نامی چیزیں کے علاوہ ایک بچہ مخلوق بھی موجود ہے۔ اگرچہ میں نے اپنے تجربہ کی بنیاد پر مانا اور دیا کہ جسم سے انتہائی کھدیز دیا ہے لیکن وہ بڑی ذہین اور طاقتور ہے وہ لامحالہ ان دونوں کے جسموں پر دوبارہ اپنا قبضہ جمانے کی کوشش کرے گی۔“

”تو دھونند جی وہ اب کہاں ہے؟“
”وہ فی الحال رسوئی کے کسی کونے میں پناہ لئے ہوئے ہے اور اس کے ساتھ نامعلوم نسل کے جن کا بچہ بھی موجود ہے۔“

”تو کیا ٹو نے اس بچے کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی؟“ مکیش نے پوچھا۔

”تر لوگ یہ رونا دھونا اور فضول کی باتیں بند کرو۔ دیا کو مانا کی طرح اچھی طرح اٹھان کراؤ اور اسے لمبی تان کر سونے دو۔ میرے حساب میں اس کے اعصاب اگھے دو تین روز تک ٹھکانے نہیں آئیں گے۔ یہ ابھی دیوانوں کی طرح باتیں کرے گی۔ اس کی تم نے چٹا نہیں کرنی اور ہاں میری طرف سے سب کو دوبارہ کہا قبول ہوں۔“

”کون سی؟“ لالہ جی نے سشندر ہو کر پوچھا۔
”پہلی تو یہ کہ مجھے دیا یا کسی کو میرے اس عمل میں کوئی جانی نقصان نہ ہوا۔“ دھونند نے کہا۔ ”حالانکہ مجھے اس بات کا بہت زیادہ خطرہ تھا کہ اس خطرناک کشت بھرے عمل کے دوران کوئی انہونی ہو جائے گی۔ بھگوان نے مجھے تم لوگوں کے سامنے رسوا ہونے سے بچا لیا اور دوسری مبارک باد اس بات کی کہ میرے اس عمل نے دیا کے جسم سے اس کمبخت کو مکمل طور پر کھدیز دیا ہے۔“ مکیش نے خوشی سے اپنے آنسوؤں کو ہتھیلی سے پونچھا اور جذباتی طور پر آگے بڑھ کر اس کے چہرے میں بیٹھ گیا۔

”دھونند تم نے مجھ پر یہ احسان کر کے مجھے عمر بھر کے لئے خوب دلایا ہے۔“ مکیش نے بڑے جذباتی لہجے میں کہا۔ ”مجھے دیا کے ساتھ ساتھ اس معصوم لڑکے کی بھی فکر تھی جو مفت میں اس ظالم مخلوق کے عتاب کا شکار ہوئے۔ میں اس کے لئے احسان مند ہوں آپ تو کوئٹل ہیں ورنہ میں آپ کی سونے، چاندی یا نقد روپے کی صورت میں سیوا کرتا۔“

”سونا، چاندی تم ہی لوگوں کو مبارک ہو۔“ دھونند نے لاپرواہی سے کہا۔ ”میں تو صرف دال بھات کا مجموعہ کرنے والا دیہاتی انسان ہوں۔“

”لیکن آپ کو اپنی گزر بسر کے لئے کچھ نہ کچھ لینا چاہئے۔“ لالہ جی نے اس سے کہا۔ ”آخر اتنے جو حکم اور اپنی جان پر کھیل کر توڑ کرتے ہیں اس میں ہرج ہی کیا ہے۔“

ہیں۔ دھونند نے کہا۔ ”یہ مسئلے مسائل تو جیوں کے سانسوں کے ساتھ جڑے ہیں۔ دشمن بالآخر دشمن ہے۔ آپ کے دشمن نے اپنے تئیں آپ کی پریشانیوں میں اضافہ کرنے کے لئے بڑی خطرناک قسم کی مخلوق وارد کی ہے۔ خیر اس نے تو اپنا وار کر دیا ہے لیکن آپ دشواری کریں ہمارے ہوتے ہوئے آپ کے دشمن اس حویلی اور آپ کا بال بیکا نہیں کر سکتے۔“

”اچھا تو اپنے بندے کو کب لاؤ گے؟“ لالہ جی نے پوچھا۔

”وہ تو میں اسے ایک آدھ روز میں لے آؤں گا لیکن میں آپ سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں حالانکہ یہ بات مجھے اس موقع پر کہنی نہیں چاہئے۔“

”کیسی بات؟“ لالہ نے نظر انداز میں پوچھا۔

”لالہ جی! آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ میں کوئل ہوں۔ دھونند نے محتاط انداز میں کہنا شروع کیا۔ ”میں کسی سے اپنے کام کا ایک دھیلہ بھی لینا نہیں چاہتا ہوں لیکن میں جس بندے کو لاؤں گا۔ وہ ذرا لالچی اور دنیا دار انسان ہے۔“

”دھونند جی! وہ اپنے کام کا کیا لے گا؟“ لالہ جی نے پوچھا۔

”لالہ جی! وہ اپنے تو دھیلہ پیر کے معاملے میں بڑا کمینہ منہ پھاڑنے والا ہے۔ دھونند نے کہا۔ ”وہ عملیات، جادوئی توڑ جن، چڑیل وغیرہ سے چھٹکارے کے لئے عموماً ٹھیکہ مارتا ہے لیکن آپ اس کی بھی قطعی چتا نہ کریں۔ پہلے تو میں اسے یہاں بہلا پھسلا کر لاؤں گا اور اگر وہ زیادہ ہی منہ پھاڑے گا تو آپ پریشان نہ ہوں میں اور کمیش اس سے یہ کام مناسب روپوں میں مکالمیں گے۔“

یہ سن کر لالہ جی سوچ میں پڑ گئے۔ ان کی دینی روایتی سوچ تھی کہ چمڑی جائے پر دمڑی نہ جائے۔

”نہیں کمیش! اس کو بھی کھد بڑنے کے لئے مجھے بڑا سخت عمل کرنا پڑے گا۔“ دھونند نے کہا۔ ”سچی بات ہے مجھے فی الحال اس کا کوئی حل نظر نہیں آ رہا۔ میں ابھی وہ کر رہا ہوں جو مجھے بھائی دے رہا ہے اور مجھے آپ لوگوں کے سامنے یہ کہنے میں کوئی شرم محسوس نہیں ہو رہی کہ میں ابھی تک کھل کا میاب نہیں ہوا ہوں۔“

لالہ جی نے اپنے ماتھے آئے پسینے کو پونچھتے ہوئے اس سے پوچھا۔ ”تو اس جن کے بچے کو کیسے اس حویلی کی رسوئی سے نکالا جائے؟“

”آپ چتا نہ کریں۔“ دھونند نے کہا۔ ”اس کام کے لئے میں ایک اور مہمانی ماہر عملیات اور اس کے توڑ کا بندہ لاؤں گا۔“

”ابے اب بھی کوئی اور دھیلہ سے بندہ لائے گا۔ تو کاہے کا اتنا بڑا گیانی بنتا ہے؟“ لالہ جی نے جڑک کر کہا۔

”میں صرف اپنے علم کا گیانی ہوں۔ دھونند نے اُمتائے بغیر کہا۔ ”میں نے پہلے ہی آپ کے ساتھ اپنی اس بالآخری کا اظہار کر دیا ہے کہ میں رسنی میں موجود سے جن رسوئی سے بے دخل نہیں کر سکتا۔“

”اچھا تو اس کے لئے کون سا سورا ملے گا؟“ لالہ جی نے بڑے نامور انداز میں پوچھا۔

”لالہ جی! آپ کیا سمجھتے ہیں؟“ دھونند نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”اس کام کے لئے میں کوئی لٹو، جٹو، بندہ لاؤں گا۔ اب آپ اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے میرا لایا ہوا بندہ کس طرح رسنی میں چھپے جن کے پوٹے (بچے) کو تاس کرتا ہے۔“

”یہ میں کن عذابوں کے گرداب میں پھنس چکی ہوں۔“ لالہ جی نے پریشان کن دھیمی آواز میں کہا۔

”ایک مصیبت سے جان چھوٹی ہے تو دوسرا عذاب اس کی جگہ لے لیتا ہے۔“

لالہ جی! آپ تو ابھی سے ہی دل چھوڑ بیٹھے

○○○

اپنے من میں کیسے پریت کا تصور پال لیا ہے؟“
”میں زہر کھا لوں گی۔“ وہ یہ الفاظ کہہ کر روتے ہوئے باہر نکل گئی۔ خدا کا شکر ہے وہاں تیسرا کوئی اور نہ تھا اور دوسری جانب میں یہ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ دیبا بھابی اپنے دل میں میرے بارے میں خواہ مخواہ کتنا برا تصور پیدا کرے گی اور اس کا اگلا رد عمل کیا ہوگا؟

میں دو تین روز تک اسی خوف اور پریشانی کی وجہ سے کلدھپ سے ملنے جوبلی بھی نہ گیا۔ مجھے اماں سے پتا چلا کہ نوتن کو نہ صرف شدید بخار چڑھ گیا بلکہ وہ بڑی بھکی بھکی باتیں کر رہی ہے۔

کلدھپ نے مجھے جوبلی میں بلایا اس نے مجھے اس طرح غصہ سے دیکھا کہ مجھے دل میں یہ ہول اور سوسہ اٹھا کہ جیسے کہ دیبا نے اسے شاید سب کچھ بتا دیا ہے۔

لیکن نہیں، شکر ہے اس نے مجھ سے بڑے گھ کرنے والے انداز میں کہا۔ ”پارستار! بڑے افسوس کی بات ہے ٹو دو تین روز مجھ سے ملنے نہیں آیا۔ حالانکہ تجھے بتا دیا ہے کہ آج کل ہم لوگ دیبا کی کیفیت کی وجہ سے کتنے کرب سے گزر رہے ہیں۔ اوپر سے نوتن کی طبیعت بھی خراب ہو گئی ہے۔“

میرے منے جوبلی اعصاب اس کی بات سن کر یکدم ڈھیلے پڑ گئے۔ میں لگا جیسے منوں بوجھ میرے سر سے اتر گیا ہو۔

”ہاں، میں نے اماں سے نوتن کی بیماری کی خبر سنی تھی۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن میں سمجھا کہ یہ روٹین کی بیماری ہوگی۔ اوہو کیا ہوا اسے؟“

”ارے بیٹا لگتا ہے اس نصیبت انسان جڑیل نے بہو اور ماما کے جسم کو چھوڑ کر نوتن کے بدن پر اپنا مسکن بنالیا ہے۔“ سنتو تائی نے اندر آتے ہوئے کہا۔ ”ارے کوئی ہے جو دھونند جوتی کو لائے وہ میری بیٹی کی اس منحوس جڑیل سے جان چمڑائے۔“

ادھر نوتن جان بوجھ کر میرے گھر آ کر میرے قریب اور گھٹنے ملنے کی کوشش کیا کرتی تھی اور میں ہر ممکن طریقہ سے اس سے کترانے کی کوشش کیا کرتا تھا مگر اس کی پیش قدمی جاری تھی۔ ایک دن اس نے مجھے ہماری ڈیوڑھی میں روک کر کہا۔

”ستار میں بھگوان کی سونگد کھا کر کہتی ہوں کہ اگر تمہارا میرا لگن نہ ہوا تو میں زہر کھا کر مر جاؤں گی۔“

میں حیرت سے اس کو دیکھتا رہ گیا۔ وہ کن راہوں پر چل پڑی تھی؟ اسے معلوم نہ تھا کہ یہ راستے کانٹوں سے بھرے ہوئے ہیں۔

”ایک بات کان کھول کر سن لو نوتن!“ میں نے غصہ ضبط کر کے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”تم نے اگر اپنا یہ بے وقوفانہ طرز عمل جاری رکھا تو میں لازماً اس کی شکایت اپنی اماں سے کر دوں گا۔“

”ایک بات تم بھی غور سے سن لو پاسو!“ اس نے بھی اسی کچھ میں کہا۔

”میں نہیں یہ بات بڑے وثوق سے کہہ رہی ہوں کہ اگر تم نے مجھے فکر یا تو میں اپنی زندگی کو ٹھکرا دوں گی تم دیکھ لیتا۔ مجھے تم سے موتی کی حد تک لگاؤ ہے۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنا سر میرے کندھوں پر رکھ دیا۔

اس سے پہلے کہ میں اس کا سراپے کندھے سے اٹھاتا کہ اچانک دیبا ہماری ڈیوڑھی میں سانسنے آ گئی۔ اس نے چونک کر اپنے تیز چلتے قدموں کی رفتار کو دھیرا کیا اور ہم دونوں کو ہونٹوں کی طرح دیکھتی ہوئی گھر کے من میں آگے بڑھ گئی۔

”یہ ٹو نے میرے لئے کیا عذاب کھڑا کر دیا ہے۔“ میں نے طیش میں آ کر کہا۔ ”دفع ہو جا۔“ اور پھر آؤ دیکھا نہ تاؤ ایک زوردار تھپڑ اس کے گال پر مارتے ہوئے کہا۔ ”بچپن سے تجھے بہن کی طرح دیکھتا آ رہا ہوں، یہ تم نے

”اماں! وہ رسوئی میں چپے بھونسنے کی کھوج لگانے والے بندے کو لینے گیا ہوا ہے۔“ کلدھپ نے کہا۔
”اسے آنے میں ایک آدھ دن تو لگے گا۔“

کلدھپ مجھے خودنوٹن کی چار پائی کے پاس لے کر گیا جہاں وہ آنکھیں بند کر پڑی ہوئی تھی۔ میں دل سے نہیں چاہ رہا تھا کہ کلدھپ اسے میری موجودگی کا احساس دلائے۔

”ارے نوٹن آنکھیں کھول کر دیکھو ستار آیا ہے۔“
کلدھپ نے نوٹن کو پکارا۔

میرا نام سن کر نوٹن نے جھٹ سے اپنی تکلیف سے بھری آنکھیں کھولیں اور نظریں مجھ پر گاڑ دیں۔

”مجھے پتا تھا تم ضرور آؤ گے۔“ نوٹن نے بڑی میٹھی آواز میں کہا۔ ”دیکھو میرا یہ حال تمہاری ہی وجہ سے ہوا ہے، میں تمہاری ہوں۔“

کلدھپ نے میری جانب سوالیہ انداز اور پریشان کن نظروں سے دیکھا۔ سچی بات ہے میں اس سے کتنی نظریں ملا سکا۔ اسی وقت دپا وہاں ہمارے قریب آئی۔ اس نے کلدھپ کا ذہن چلتے ہوئے کہا۔

”ارے لگتا ہے اس کا دماغ آج کل کچھ زیادہ ہی پلٹ گیا ہے۔ یہ کبھی کبھار جی ہے کبھی کبھار۔“

”ہاں، ہاں مجھے تیری اس بات سے اتفاق ہے۔“
کلدھپ نے کہا۔ ”اس کے جسم پر واقعی اقسام چڑیل کا غلبہ شروع ہو چکا ہے۔ ورنہ اس سے پہلے تو اس طرح کی بے ربطا بکی بکی باتیں نہ کرتی تھی۔“

نوٹن نے دوبارہ اپنی آنکھیں کھولیں اور مجھے ٹوٹے ہوئے افلاطون میں کہا۔ ”تم میرے ہوسٹار! دیکھنا میں جلد زہر کھا کر اپنی زندگی کو ختم کر لوں گی۔“

میں نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا تو واقعی اسے بہت ہائی ٹپر پڑ تھا۔

”ستار یہ بخار کی حدت نہیں ہے بلکہ تیرے پیار کی

گرمی ہے۔“ نوٹن نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔
”تم پریشان نہ ہو تم جلد ٹھیک ہو جاؤ گی۔“ میں نے کہا۔

میں اس کے بعد کچھ لمحے کلدھپ کے پاس رکھا اور واپس اپنے گھر آ گیا۔

میں تو حوصلی نہ گیا لیکن مجھے مختلف ذرائع سے یہ خبریں مل رہی تھیں کہ نوٹن کی دماغی کیفیت بڑی تیز رفتاری سے ابتر ہوتی جا رہی ہے اور وہ بار بار مجھے پکار رہی ہے لیکن وہاں نہ جانے کیوں لوگوں کا ذہن، سوچ کا رخ تبدیل کرنے کے لئے کہہ رہی ہے کہ یہ اس کا دیوانہ پن ہے اور اس کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

ایک دن دپا سچ بڑے فجر کی نماز سے پہلے اماں کے پاس آ گئی۔

”ارے دپا خیریت تو ہے تو اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہے؟“ اماں نے گھبرا کر پوچھا۔

”ماتا جی! میں نے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔“ اس نے کہا اور اماں کو ایک کونے میں بیٹھنے دے کر کھڑے ہو کر ان کے کانوں میں کافی دیر تک کھسر

پھسرا کر رکھی۔ میں اسی وقت سمجھ گیا تھا کہ وہ لازماً میرے اور نوٹن کے بارے میں کوئی نہ کوئی بات کر رہی ہے۔ اس کی کاٹا بھوئی کے دوران اماں بڑی غصیلی

لگا ہوں سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔

”اماں! نماز پڑھنے جا رہا ہوں۔“ میں نے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

”پہلے میرے پاس آ کر میری بات سن۔“ انہوں نے قہر بھری آواز سے مجھے کہا۔

”یہ میں کیا سن رہی ہوں باسو!“ اماں نے میرے من پر تھنر مارتے ہوئے کہا۔ ”میرے پاؤں تلے سے زمین ٹھکنے لگی ہے۔ یہ تو نے چپے سے کیسا ناپاک کھیل اور

ہمارا دل دکھانے والا بھیڑا مچا رکھا ہے۔“

بڑبڑاتی رہتی ہے کہ جسے میں نے چاہا ہے اگر اس سے میرے
لگن نہ ہوا تو میں بھگوان قسم سنگھیا لکل لوں گی۔ میں یہ
بات آپ کے سامنے اس لئے کر رہی ہوں کہ آپ کو یہ پتا
ہونا چاہیے کہ بھگوان نہ کرے کل کو اس نے اپنے ساتھ برا
کر لیا تو تم از کم آپ کو یہ تو علم ہو گا کہ اس کا قصور وار
سراسر آپ کا بیٹا ہی ہے۔“

”دیبا بھابی یہ آپ کا گمان اور غلط فہمی ہے میں خدا
کو حاضر ناظر جان کر یہ بات حلفیہ کہتا ہوں کہ میں مرکز
بھی کسی صورت میں یہ تصور نہیں کر سکتا۔“

”ستارا! تمہیں شرم آتی چاہئے۔“ دیبا نے کڑے
لہجہ میں کہا۔ ”تم نے اپنے بھائیوں سے حویلی کے پرکھوں
اور اپنی اور کلدھپ کی پرانی بھائیوں جیسی دوستی کا حل برابر
بھی خیال نہ کیا اور حویلی کی عزت پر بڑی نظر رکھی۔“

”بیٹی! میں تجھ سے استدعا کرتی ہوں کہ تو یہ بات
کسی کو نہ بتاؤ۔“ اماں نے دیبا کی منت کرتے ہوئے
کہا۔ ”میرا تو دل دہل رہا ہے کہ اگر یہ بات اس کے پاس
کو جا چل گئی تو ان کا صدمہ سے دل ہی بند ہو جائے گا۔“

”نہیں ماما جی! آپ مجھ پر دوشواں کریں۔“ دیبا
نے یقین دہانی کرتے ہوئے کہا۔ ”میں مرتے مر جاؤں
گی لیکن کبھی بھی اپنے بھائیوں سے یہ آنکھوں دیکھا راز کسی
سے افشا نہ کروں گی۔ ماما جی! آپ لوگ میری اساس اور
سرسر جی کی کڑی رعوت بھری طبیعت سے ہٹ کر انسان کو
انسان سمجھنے والے کھلے دل کے اچھے انسان ہیں اس لئے
میں آپ کے پاس اپنے دل کا غبار اگلنے یہاں آ جاتی
ہوں اور آپ میرے دکھوں کو سنتے، محسوس بھی کرتے
ہیں..... بھلا میرا ضمیر اور دل یہ کیسے گوارا کر سکتا کہ میں
نے اپنی آنکھوں سے نوتن اور ستارا کا پریم کا منظر دیکھا ہے
وہ اپنے سرال والوں کو تھلا کر ان کی پریشانیوں کی جلتی
آگ کو اور بھڑکاؤں۔“

اس کے بعد دیبا تو مجھے لعن طعن اور اس راز کو افشا

”کیسا بھینٹا کیسا کھیل اماں میں کچھ سمجھا نہیں۔“

میں نے تھامال کا مظاہرہ کیا۔

”میں سمجھاتی ہوں۔“ اماں نے میرا کان پکڑ کر
بڑی طرح مروڑتے ہوئے کہا۔ ”یہ بتا تیرے اور نوتن
کے درمیان یہ پریم کی ٹوٹنکی کب سے چل رہی ہے؟“

”اماں! میرا کان تو چھوڑو۔“ میں نے تڑپ کر
کہا۔ ”میں آپ کو اس کی اصل حقیقت بتلاتا ہوں۔“

اماں نے میرے کان پر اپنے ہاتھ کی گرفت کو ذرا
ڈس دی اور چلا کر بولیں۔ ”اگر ٹوٹنے جھوٹ بولا تو میرا
مرا ہوا منہ دیکھئے۔“

”میں تیری اور بابا کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔“ میں نے
کہا۔ ”نوتن خواہ مخواہ مجھ سے اپنی محبت کا اظہار کر رہی
ہے۔ اگر میں جھوٹ بولوں تو خدا مجھے موت دے دے۔
آپ میری اس بات پر یقین کریں میں اسے اپنی بہن کی
جسٹ دیکھتا ہوں، وہ پاگل ہے۔“

”تم بکواس کرتے ہو اور جھوٹ بولتے ہو کہ تم نوتن
کو اپنی بہنوں کی مانند دیکھتے ہو۔“ دیبا نے غصے سے مجھے
جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ ”اور جو میری آنکھوں نے یہ منظر
دیکھا ہے کہ وہ تیرے سینے پر سر لگائے تجھ سے بڑے
عاشقانہ انداز میں پریم کھاتی کر رہی ہے اور ٹو اس کے
وجود کو شیطانی انداز میں اپنی جانب منہج رہا تھا، یہ کیا
بہنوں سے محبت کا انداز ہوتا ہے۔ مجھے معلوم ہے آج کل
اس کی دماغی حالت نیم دیوانوں جیسی ہے لیکن تم نے اس
معصوم کی معصومیت اس کے دیوانے پن اور توبہ کی
پریشانیوں سے ناجائز فائدہ اٹھا کر صرف اور صرف اپنی
ہوس کو پروان چڑھانے کے لئے اسے درغلا کر اپنی جانب
راغب کیا ہے۔“

وہ پھر اماں کی جانب دیکھ کر بولی۔ ”اس نے نہ
جانے اس معصوم نوتن کو کیسا محبت کا چمکہ دیا ہے اور کیسی
آس دلائی ہے کہ وہ ہر وقت اپنے دیوانے پن میں مبتلا

نہ کرنے کا وعدہ کر کے واپس اپنے گھر چلی گئی لیکن پیچھے
اماں نے میری بات کا یقین نہ کرتے ہوئے خواہ مخواہ مجھے
لعنت ملامت اور کوسنوں سے داغنا شروع کر دیا۔

ooo

اسی روز دھونند اپنے ساتھ حویلی میں ایک مجذوب
قسم کے شخص کو لے کر آیا جس کے بارے میں اس کا یہ
دعویٰ تھا کہ یہ ماہر جنات اور ان سے جرے رموز کو سمجھنے
میں بڑا مستند تجربہ کار آدمی ہے۔

وہ قد کاٹھا، کالی رنگت پر مشتمل بڑے بڑے بالوں
کی لٹوں، بہت گھنی مونچھوں والا، چالیس بیالیس سال کا
ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ پرانے بوسیدہ کپڑوں اور معمولی قمیچی
چپل پہنے بالکل نیم پاگل کچھ مجذوب سا نظر آ رہا تھا۔

لالہ جی اور وہاں موجود سب نے اسے بڑی حیرانگی
سے دیکھا۔

”ارے اس بھیک منگے کو کہاں سے لایا؟“ سنتو
تائی سے نہ رہا گیا اور انہوں نے نہ ملا کہا۔ ”اس حویلی میں
پہلے ہی لاتعداد نیستیاں پٹی رہی ہیں۔“

”ماں تائی! آپ اندر جائیں۔“ دھونند نے شرمندگی
سے کھائی ہنسی جیتے ہوئے کہا۔ ”یہ مشہور ماہر جنات
مریال ہے۔“

سنتو تائی نے دوبارہ ہراسا نہ بنایا اور طنز یہ طور پر
کہا۔ ”یہ مریال نہیں بلکہ مرلی ہے۔“

مریال نے اس کی جانب بڑے اطمینان سے
دیکھتے ہوئے کہا۔

”لالہ تیری پتی اتنی مستح، جاہل ہے کہ مجھے اس
حویلی میں رہی ہی نیستیوں کا اصل سبب یہ ہی بڑھاپا لگتی
ہے۔“

اس پہلی بات سے مریال بھی بڑا منہ پھٹ اور
پھنڈ والا سمجھی نظر آ رہا تھا اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ اس
نے لالہ جی کو بھی بڑے مستحانہ انداز میں لالہ کہا تھا۔

نکیش جولاہ جی کے قریب تھا، اس نے اسے ٹھونکا
ماتے ہوئے ہلکا سا کہا کہ وہ فی الحال مصطفیٰ چپ رہے۔
دھونند نے لالہ کیدار ناتھ کو کہا کہ میں بڑا امہان ماہر
جنات لے کر آیا ہوں اور مجھے پوری امید ہے یہ آپ کی
رسوئی میں جیسے بھوتے کو کھوج نکالے گا۔

”اچھا یہ لے گا کیا اور کب تک ہماری جان
چھوڑے گا؟“ لالہ جی نے پوچھا۔

”لالہ جی! جہاں تک رہا سوال یہ کہ یہ اپنے کام کا
کیا لے گا۔“ دھونند نے کہا۔ ”جیسا کہ میں نے آپ کو
پہلے ہی بتلایا تھا کہ یہ اپنے ہر کام کا ٹھیکہ مارتا ہے اور اس
کے لئے یہ بہت منہ بھارتا ہے لیکن میں اسے اپنی دوستی
یاری میں دس روپے روز دہاڑی پر راضی کر کے لایا
ہوں۔“

”دس روپے روزانہ؟“ لالہ جی اپنے حلق میں
ایک لمبی سانس کھینچ کر بڑبڑائے۔

”لالہ جی! یہ آپ کو جس دیوی نیکل معیبت سے
چھڑکا راولائے گا۔ یقین مانئے یہ رقم نہ ہونے کے برابر
ہے۔“ دھونند نے کہا۔

”اچھا چلو، میں اسے روزانہ کی بنیاد پر دس روپے
دے دوں گا۔“ لالہ جی نے کہا۔ ”لیکن میری شرط یہ ہے
کہ یہ تمہارے پاس یعنی تمہارے کمرے میں ہی رہے
گا۔“

”ہاں، ہاں آپ اس کی چٹا نہ کریں میں اسے
بڑے پریم سے سنبھال کر آپ کا کام کرواؤں گا۔“ دھونند
نے لالہ جی کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

مریال نے رسوئی میں جا کر کافی دیر تک ایک
جھاڑو پر ہرل کی بھاری مقدار ڈال کر اس میں آگ لگائی
اور ملتی جھاڑو جس میں ہرل کے جلنے کی بڑی تاگوارد ہو آ
رہی تھی وہ اسے بڑی سرعت انگیزی سے گھماتے ہوئے
اچانک ایک جھٹکے سے زمین پر گر کر بری طرح مضحکہ خیز

من کر ارد گرد کے توہم پرست اور جادو، بھوت پریت پر یقین و رجحان رکھنے والے لوگ اُس سے رابطہ کرنے لگے۔ ان میں سے بہت سے توہم پرست اسے اپنے گھروں میں لے جا کر اس سے بھاری رقم کے عوض اپنے اپنے کام کروانے لگے۔

یہ بات لالہ کیدار ناتھ کو بُری لگی لیکن وہ مصلحت چپ رہا۔ اسی دوران حویلی کے ماحول میں وقتی سون سا محسوس ہونے لگا تھا۔ نہ تو رسوئی سے کوئی دھماکا، آگ کا شعلہ اُٹھ رہا تھا۔ نیز مانا، دیبا بھی بالکل نارمل تھے لیکن نوتن بدستور ہاتھوں کی طرح تھی۔ وہ نیم غنودگی میں بھی بڑبڑائے جا رہی تھی۔ ”میں نہاری ہوں، تم میرے بن جاؤ۔ تم نے اگر مجھ سے کیا تو بھگوان کی قسم میں سنگھیا کھا کر اپنا جیون ختم کر لوں گی۔“ وہ کبھی کبھار میرا نام بھی لیا کرتی تھی۔



دو روز بعد ہائی کورٹ میں حویلی کی بے غشی اور لالہ جی کی جانب سے اس کے قبضے کے لئے، تدوین کی جوت، ماہوں کی پیشی ہوئی۔ لالہ جی کی جانب سے وکیل P.T.D مستقل ملکیتی آرڈر، ہائی کورٹ، جازت نامہ (P.C.N.O.C) دستاویز، ثبوت، علاوہ ۱۰۰ روپے ہائی کورٹ کی پیش کئے گئے جسکی ساتھ ڈیپازٹ کی گئی۔ بے غشی چند دستاویزی ثبوت اور گواہوں کی پیشی لالہ جی سے مخالف گواہوں میں شکرہ، کی شامل تھا۔

لالہ جی اور ہیاتند دیپارٹمنٹ کے وکلاء سے درمیان خاصی دیر تک بحث اور جھگڑا ہوا۔ نتیجہ: بے غشی کی جانب سے پیش کئے گئے وکلاء نے مقدمہ جیتنے کا پانڈے سے استدعا کی۔ لالہ جی کی جانب سے جیتنے کے جانے والے حویلی کے P.C.N.O.C کی طرف سے متعلقہ محکمے سے تصدیق روائی جاب لے آئی یہ جمل ہے یا اصلی۔

انداز میں قلابازیاں کھانے لگا۔

”اے تُو نے کیا پایا؟“ تھوڑی دیر میں مکیش نے اس سے پوچھا۔

”انعام چیل کے ساتھ ایک ایسا چھوٹا مگر خطرناک بھوتنا عملیات سے بھیجا گیا ہے۔“ مریال نے کہا۔ ”جو اگر جلد سے جلد یہاں سے نہ نکلا تو اس نے آئندہ انعام سے زیادہ نقصان کرنا ہے۔“

”اچھا تو تجھے یہاں ہم نے نکالانے کے لئے بلایا ہے۔“ مکیش نے مریال سے کہا۔ ”تُو اسے نکال لے گی تمہید نہ باندھ۔“

”مکیش تُو اپنی اوقات میں رہ کر وہی بات کر جو تجھے زیب دیتی ہے۔“ مریال نے غضب ناک ہو کر کہا۔ ”اور یہ بھوتنا اتنی جلدی اور آسانی سے اس حویلی سے نہیں نکلے گا۔ اسے میں اپنے طریقہ سے اور سخت سے نکالوں گا۔ میں اب بھی تم لوگوں کو یہ کہتا ہوں کہ مجھ سے اگر اپنا کام لینا ہے تو مجھے تھوڑا سا وقت دو۔“

”ہاں، ہاں مریال جی! آپ کو میری طرف سے اجازت ہے۔“ لالہ جی نے کہا۔

مریال نے مزید بتایا کہ تمہاری حویلی میں جو بھوتنا موجود ہے اس کی فطرت پھر تیلے چوہے کی طرح ہے، وہ میرے عمل سے ڈر کر نکلے گا۔ تم لوگ میرے کام کے بارے میں کوئی سوال نہ کرو۔ صرف میرا کام دیکھو۔“

مریال اور ہونند روزانہ حویلی کے کمروں بالخصوص رسوئی، ہر منزل میں اپنا کوئی نہ کوئی پراسرار عمل کرتے اور پوچھنے والوں کو یہی کہتے تھے کہ حویلی کی رسوئی بے انعام اور بھوتے کو باہر کھدیز دیا ہے۔

مریال نے ایک آدھ دفعہ بتلایا کہ میں نے رسوئی سے بھوتے کو باہر نکال دیا تھا لیکن وہ کسی چوہے کی مانند پھدک کر دوبارہ حویلی میں گھس گیا ہے۔

مریال ایک پیشہ ور لالچی انسان تھا۔ اس کی آمد کا

”لالہ جی! آپ نے ایسی بھیا تک اور ناقابل
 علفانی غلطی کر دی ہے کہ اس کا نتیجہ آپ کے لئے انتہائی
 نقصان دہ ہوگا۔ ہو سکتا ہے اب آپ کو جو جلی سے بے دخل
 ہونے کے ساتھ اس جرم میں فوجداری سزا بھی ہو
 جائے۔ یہ تو سراسر عدالت سے فراڈ کے مترادف ہے۔“
 وکیل نے یہ بات بڑے تشہی انداز میں زور دے
 کر اسے کہی تو لالہ جی بچوں کی طرح روتے ہوئے وکیل
 کے قدموں میں بیٹھ کر گڑ گڑانے لگا۔

”وکیل صاحب! بھگوان کے واسطے مجھے رسوائی
 اور حوٹلی کی بے دخلی سے بچانے کے لئے کچھ ادا پائے
 کرو۔“

”ارے کیا ادا پائے کروں، لالہ جی!“ وکیل نے
 جمل کر کہا۔ ”تو نے میری محنت اور اپنے کیس کو اپنی بے
 وقوفی کی وجہ سے ٹٹی میں ڈال دیا ہے۔ اب میں نے کیا
 کرتا ہے۔ اب تو بھگوان ہی کو بیچارہ کرے تو ٹھیک
 لیکن میرا نہیں خیال کہ لالہ جی تم اس سنگین فراڈ کے بعد
 قانونی قصاب سے حق پاؤ۔“ اس نے فصد سے اپنی ٹپوں
 پر ہنسنے ہوئے کہا۔ ”اگر مجھے یہ عقل کا اندھا جلی
 P.C.NOC دکھا دیتا تو میں کم از کم اسے عدالت میں
 سرے سے ہی پیش نہ کرتا۔“

”چلو اب جو ہو گیا سو ہو گیا۔“ کمیش نے کہا۔
 ”وکیل صاحب اب ہمیں آپ یہ مشورہ دیں کہ لالہ اپنے
 آپ کو ڈوبنے سے کیسے بچائے؟“

”بھئی صاف بات ہے میں اسے صاف قانونی
 لڑائی میں کسی حد تک بچا سکتا ہوں۔“ وکیل نے کہا۔
 ”لیکن اس نے جو فراڈ سے کاغذ تیار کیا ہے اس میں تو یہ
 رنگے ہاتھوں پکڑا جائے گا اور لالہ جی کی سلاخیں اس کا
 مقدر ہوں گی اور حوٹلی سے قانونی دھکا الگ لگے گا۔
 ہاں، ایک ادا پائے ہو سکتا ہے لیکن یہ بھی ڈوبتے ہوئے
 تنکے کے سہارے کے مترادف ہوگا۔“

لالہ جی کے وکیل نے عدالت میں اپنے جوابی
 دلائل میں کہا کہ ان دستاویزات کی تصدیق کروانے میں
 خواہ مخواہ عدالت کے وقت کا ضیاع ہو گا لیکن جسٹس
 پاٹل نے اس کی اس بات سے اتفاق نہ کرتے ہوئے
 اپنے ریڈر کو حکم دیا کہ وہ لالہ جی کی جانب سے پیش کئے
 گئے دستاویزی ثبوت کی تصدیق کے لئے متعلقہ محکموں
 میں بھیجے۔ تاہم اس نے گواہوں کی شہادتوں کے لئے
 اگلے دن کی تاریخ دے دی۔

اگلے روز بھی دونوں جانب سے بقیہ شہادتیں،
 بحث مباحثہ ہوا۔ لالہ کورٹ سے واپس آیا تو اس کا رنگ
 فق اور طبیعت انتہائی پریشان تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس
 نے عدالت میں جو صوبائی کمرشل اجازت نامہ پیش کیا تھا
 وہ سراسر جعلی اور کسی فراڈ سے بنایا تھا جبکہ دوسرے
 ملکیتی کاغذات درست تھے۔ اس بات سے اس کی جان
 سوکھ رہی تھی۔

دوسری دلچسپ بات یہ تھی کہ لالہ کیدار بھٹ نے
 اپنے وکیل سے بھی اس کی حقیقت چھپائی تھی۔
 دوسری جانب ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ کی جانب سے پیش
 کئے گئے دلائل نے اپنے کیس کی بہت اچھی ماہرانہ طور پر
 پیروی کی تھی۔ ان کی جانب سے دلائل دستاویزی ثبوت
 انتہائی جاندار تھے۔

لالہ اگلی پیشی آنے سے قبل ہی جسمانی و مالی طور پر
 کمزور حواس باختہ سا نظر آ رہا تھا۔ وہ چھوٹی چھوٹی بات پر
 اپنے رشتہ داروں، دوستوں سے لڑتا، الجھتا تھا۔

ایک دن اس نے ہمارے گھر کمیش اور وکیل کو
 خصوصی طور پر بلایا اور اس نے روندہی آواز میں اپنے دلی
 میں چھپے چور کو نمایاں کرتے ہوئے اس امر کا اقرار کیا کہ
 اس نے حوٹلی کے کیس کی سپورٹ میں جو صوبائی کمرشل
 اجازت نامہ پیش کیا ہے وہ جعلی ہے۔ اس کے منہ سے یہ
 بھیا تک اقرار سن کر اس کے وکیل نے اپنا سر پکڑ لیا۔

ہوں اس کے لئے چنی بات یہ ہے کہ میں ان متعلقہ حکاموں کے کسی نہ کسی کلرک یا افسر کی کمزوری کو پکڑ کر اس کو خریدتا ہوں اور اس کے لئے میں نہ صرف ان پر بے دریغ پیسہ خرچ کرتا ہوں بلکہ ان کی کچھ فرمائشیں بھی نہ چاہتے ہوئے پوری کرتا ہوں۔

مجھے بھگوان سے پوری امید ہے کہ میں صوبائی سیکرٹریٹ کی متعلقہ برانچ کا کوئی نہ کوئی اہلکار یا افسر گھیر لوں گا لیکن اس کے لئے وکیل صاحب آپ لالہ جی سے پوچھ لیں کہ آیا میں ان سے جہاں کہوں گا خرچہ کریں گے اور ویسا ہی کریں گے جیسا کہ میں کہوں گا۔

لالہ جو سہا بہت بنا ہوا بیٹھا تھا۔ اس کے کانہوں کو جھنجھوڑتے ہوئے وکیل نے کہا۔

”تو تو ویسے بھی حویلی کو گھسنے کے ساتھ جیل کی سلاخوں کے قریب ہوتا جا رہا ہے۔“ وکیل نے صاف لفظوں میں کہا۔ ”میری مان کمیشن جو بہتا ہے اس پر کڑوا گھونٹ پیا کر رضامندی بھر لے اور اگر نہیں تو میری مرضی ہے۔“

”وکیل صاحب! میں آپ سب لوگوں کے سامنے اس بات کا وعدہ کرتا ہوں کہ جیسا کمیشن جی مجھے کہیں گے میں ویسا ہی کروں گا۔“ لالہ جی نے بوکھلاتے ہوئے کہا۔ ”اب اپنی بندی کو پ لگا کر مت رکھیو۔“ ابانے لالہ جی کو متوجہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ایسا نہ ہو کہ تو ضرورت کے وقت روپیہ، وسیلہ خرچ کرتے ہوئے کنجوسی کا مظاہرہ کرے۔“

”نہیں، نہیں، عظیم تو اس کی چٹانہ کر کمیشن جیسا کہے گا میں ویسا ہی کروں گا۔ یہ مجھے کسی اندھے کنویں میں بھی گرنے کو کہے گا تو میں گود جاؤں گا۔“

”ارے میں کوئی پائل ٹھوڑی ہوں لالہ جی! جو آپ کو اندھے کنویں میں دھکیلوں گا۔“ کمیشن نے کہا۔ ”اگر آپ میرے ذمہ یہ کھن کام سوچتے ہیں تو آپ مجھ

لالہ کیدار ناتھ اور کمیشن نے چونک کر اس سے پوچھا۔

”کیا سہارا؟“

وکیل نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”کمیشن میرے خیال میں یہ کام تم کر سکتے ہو یہ لالہ جی اور عظیم اس معاملہ میں اناڑی ہیں۔“

کمیشن نے تجسس ہو کر پوچھا۔ ”میں لالہ کی کس طرح مدد کر سکتا ہوں۔“

”تم ایک چرب زبان اور پولیس، کچھری اور دفتری معاملات اور اس کی مشینری کو سمجھنے والے زیرک انسان ہو۔“ وکیل نے کہا۔ ”تم اگر کر سکتے ہو تو یہ کرو کہ پی ایس صوبائی سیکرٹریٹ آفس میں P.C.N.O.C برانچ میں جا کر متعلقہ سپرنٹنڈنٹ یا کسی آفیسر کو اس کام کے لئے خریدو جو ہائی کورٹ کو اپنی رپورٹ دینے سے بھیجے یا بہت ہی اچھا ہو کہ وہ اس دستاویز کی اسلی ہو۔“ نے کی تصدیق کر دے۔ اب یہ تیرے پر منحصر ہے کہ وہ اپنے سہمی کو بجائے یا جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دے۔“ لالہ جی نے بے بسی اور التجا بھری نظروں سے کمیشن کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”بھگوان کے واسطے مجھے ڈوبنے اور رسوائی سے بچاؤ۔“

کمیشن نے کچھ دیر توقف کر کے کچھ سوچا اور پھر وکیل کو مخاطب ہو کر کہا۔

”وکیل صاحب! میں ایک بات آپ کے سامنے صاف کلیئر کر دانا چاہتا ہوں۔“

”کیسی بات؟“ ابانے تلکرا نہ طور پر پوچھا تو کمیشن نے جوابا کہا۔

”میرا لالہ جی سے سمجھانے والا بڑا نازک رشتہ ہے اور میں اپنی عقل اور تجربہ کی بنیاد پر جو اپنی زمینوں کے معاملات نیز عدالتی، پولیس، تھانوں کے معاملات سنبھالتا

کوئی مرض لا علاج نہیں (القرآن)

سوائے موت کے

ماہنامہ "حکایت" کے شعبہ "دست شفاء" کے مہتمم و مایر ڈاکٹر رانا محمد قہال (اولڈ میڈسٹ) کی ہدیہ تحقیقات اور مہرانہ خدمات سے مستفید ہوں اور اپنی بیماریوں، جذباتی اور جسمانی امراض، خصوصاً درج ذیل امراض کے تیز ترین اور بے ضرر علاج کے لئے رجوع کر رہا ہوں:

- پولیو
- الرجی
- بوتیکس
- پاداشتی خرابیاں
- بچوں کی ہڈی خرابیاں
- بالی ہمد پیتھ
- بک وگل کے خرد و کا بڑھ چاہا
- اعضاء کی بے حس یا کثروں نے خون
- تھوڑیوں کے امراض
- احساس کستری، تجھبت
- مردانہ، زنانہ امراض
- اعضاء کا پیدائشی (یا بعد میں) میز خاپن

ماہ کے لیے

0321-7612717

0312-6625066

0323-4329344

ڈاکٹر رانا محمد قہال
(اولڈ میڈسٹ)

عارف محمود

بامشافہ ملاقات کے لئے پتہ وقت لیں۔

دست شفاء حکایت 26 پٹیاں گراؤنگ لک سٹریٹ لاہور

سے اس ذلت بھرے لہجے میں بات نہیں کرنی چاہئے۔
 ”ابھی تمہیں میرے لبوں سے نکلا یہ لفظ چھ رہا ہے۔“ جیپال نے طنز یہ لہجہ میں کہا۔ ”لیکن جب ہم نے آپ کی دستاویزات کو سرکاری طور پر جموہ قرار دے دیا تو میں دعویٰ سے یہ بات کہہ رہا ہوں کہ لالہ جی تمہارا اتنا برا حال ہوگا کہ تمہیں منہ چھپانے کو جگہ نہیں ملے گی۔“
 لالہ، جیپال کی ان سخت باتوں سے خوفزدہ ہو کر نیم بستہ کے عالم میں کھو گیا۔

”جیپال بھائی! چلو لالہ جی نے ایک غلطی کر لی ہے۔ آپ کو اسی لئے زحمت دی ہے کہ اس کا کچھ حل کریں کہ یہ اس کو داب سے کیسے نکلیں گے؟“
 ”میں رکب لے کر اوپائے تو کروں گا۔“ جیپال نے کہا۔ ”لیکن جو بھاری پتھر تیرے سدمی نے اپنی بے وقوفی سے اپنی عزت کی راہ میں رکھ دیا ہے اسے ہٹانے کے لئے اتنی ہی بھاری ٹھوس دینی پڑے گی۔“
 ”کتنی؟“ لالہ جی نے مرے دل سے پوچھا۔

”کمیش جی! میں نے اشارے کنائے میں پہلے ہی بتا دیا ہے کہ جتنی تم نے بڑی غلطی کی ہے اتنا ہی بھاری جرمانہ دینا ہوگا۔ میں جو کچھ تم سے ڈیل کے ذریعے لوں گا میں بنگال کی سوگند کھا کر کہتا ہوں کہ مجھے اس کا بمشکل دس فیصد مل جائے گا۔“

”اچھا کچھ لو، اشارہ دو سدمی جی کو کیا دینا پڑے گا۔“ کمیش نے پوچھا۔

”میں یہ بات اپنے من سے کہہ رہا ہوں لالہ جی!“ جیپال نے لالہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہارے اس غیر قانونی کام کو قانونی بنانے میں اندر سے ڈر بھی رہا ہوں لیکن اپنی کچھ نجی ضروریات کی وجہ سے گند میں ہاتھ ڈالنے پر مجبور ہو گیا ہوں لیکن میری دوسری بات یہ ہے کہ میں نے یہ کام خود نہیں کرنا ہے بلکہ کئی راشی میزٹیوں کو چڑھ کر یہ کام لینا ہے اور ہر میزٹی کا پیٹ دوسری میزٹی

پر بھروسہ کریں کہ میں آپ کی بھنور میں پھنسی ناؤ کو ڈوبنے سے بچا لوں گا۔۔۔۔۔ یہ اچھا ہوا کہ آپ سب بڑے بڑے لکھے قابل احترام بزرگوں کی موجودگی میں یہ بات گواہی کے ساتھ صاف ہو گئی۔ میں کل ہی سیکرٹریٹ کی متعلقہ برانچ میں جا کر کچھ اوپائے کرتا ہوں۔“
 تین روز بعد کمیش اپنے ساتھ ایک ایسے آدمی کو لے کر آیا جو شکل و صورت، بول چال سے گھما گھما کر سرکاری ملازم لگ رہا تھا۔

”سدمی جی! میں سیکرٹریٹ کی متعلقہ برانچ کے بڑے باپو جیپال کو ساتھ لایا ہوں اور خوش قسمتی کی بات یہ ہے کہ آپ کا کیس بھی یہی ذیل کر رہا ہے۔“
 یہ بات سن کر لالہ جی کے چہرے پر چھائی مردنی کم ہو گئی اور اس کی جگہ رونق آ گئی۔
 ”جیپال جی! آپ ٹھنڈا لیں گے یا گرم؟“ لالہ جی نے پوچھا۔

”ارے لالہ جی! ہم ٹھنڈا بھی لیں گے اور گرم بھی لیکن آپ کا کام کرنے کے بعد۔“ جیپال نے کہا اور کمیش کا کمرہ کے عالم میں لالہ جی کی جانب گھورتا شروع کر دیا۔

”جیپال جی! آپ مجھے اس طرح الجھنے سے کیوں دیکھ رہے ہو؟“ لالہ کھینچا تو تھوڑے کھینچا تو پوچھا۔

”میں یہ دیکھ کر حیران ہوں کہ آپ کا چہرہ تو بظاہر بڑا سلجھے ہوئے شریف انسانوں جیسا لگ رہا ہے۔“

جیپال نے اپنی گھورتی نگاہوں کو لالہ کے چہرے سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ ”لیکن تم نے جو ہائی کورٹ میں جعلی دستاویز دلیری سے پیش کی ہے اسے دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس دھرتی میں تم سے بڑا نوسر باز پیدا ہی نہیں ہوا ہے۔“

”جیپال جی! آپ میرے مہمان ہیں۔“ لالہ جی نے خفا ہو کر کہا۔ ”آپ کو کم از کم میرے گھر میں آ کر مجھ

”لالہ جی! اگر ان دکانوں کو علیحدہ علیحدہ کر کے فروخت کر دیا جائے تو میرے حساب میں تیری ہر دکان 10 سے 15 ہزار سے کم نہ ہوگی۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ۔“ جہاں نے کہا اور پھر کمیشن سے تائید چاہی۔ ”کیوں کمیشن! کیا میں غلط بات کر رہا ہوں؟“

کمیشن نے بھی اس کی بات ٹالتے ہوئے کہا۔

”میں اس کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں؟“

جہاں نے شراب کے گلاس کو اپنے لبوں سے لگانے کے بعد کہا۔

”دیکھو! میرے حساب میں اس حویلی اور دکانوں کی قیمت دو سو دو لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ اب جو متعلقہ آفیسر تمہاری جانب سے پیش کئے گئے P.C.N.O.C کے صحیح ہونے کی ضمانت لے کر تصدیق کرے گا وہ کیا اس حویلی کی دکانوں کی قیمت کو اپنے سامنے نہیں رکھے گا؟“

”تمہارا کیا مطلب ہے ہم تمہیں دو سو دو لاکھ روپے دے دیں؟“ لالہ جی نے اُسے طنزیہ طور پر کہا۔

”معافی چاہتا ہوں۔“ جہاں نے پینترہ بدل کر کہا۔ ”میں نے آپ سے اپنی حیثیت سے ہٹ کر کچھ کڑی باتیں کر دیں لیکن میں نے جو بھی یہاں شہد کہے وہ حقیقت پر مبنی اور آئے والے دنوں کی وہ بھیا تک تصویر ہے جس کو آپ کو آئندہ دیکھنا ہے اور اگر لالہ جی آپ نے اپنی عزت کو بچانا ہے تو آپ کو مستقبل میں بڑے کڑے فیصلوں کے سامنے اپنا سر جھکانا پڑے گا۔ میں آپ کی فائل کی حالیہ پوزیشن دیکھ کر اور متعلقہ آفیسر اور چند اہلکاروں سے مشورہ کر کے بتاؤں گا کہ ہم نے کیسے اور کون سا راستہ اختیار کرنا ہے۔“

وہ جب جانے لگا تو لالہ جی نے بڑی مایوسی اور التجا سے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ”بھگوان کے واسطے مجھے میرے بھائی شکر دیال، دیگر شرکیوں اور ہیلنہ ڈی پارٹنٹ

سے بہت بڑا ہے۔ لالہ جی! دیکھیں اگر ہمارے افسر نے آپ کی جانب سے کورٹ میں پیش کئے گئے P.C.N.O.C کو جھٹلایا تو لامحالہ نہ صرف تمہارا سات سال تک بڑھاپا جیل کی سلاخوں میں کئے گا بلکہ تیری حویلی سے ملحقہ گیارہ دکانیں بند ہوں گی اور ان پر بھاری جرمانہ بھی ہوگا اور یہی نہیں، ہو سکتا ہے کورٹ کی جانب سے بے دخلی کی لات پڑے۔۔۔۔۔ یہ شاید تمہیں بھی معلوم ہو گا لیکن میں نے بھی تمہیں وہ سب کچھ پہلے سے وہ حالات بتلا دیئے ہیں جو تمہارے ساتھ جیتے گا اور ہاں پولیس کی مارا لگ۔ معاف کرنا میں یہ بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔“

”یہ گیارہ دکانیں کتنی قیمت میں ہوں گی اور ان کا کرایہ کتنا آتا ہے؟“ جہاں نے شراب کی چسکی لیتے ہوئے سوال کیا۔

”جہاں جی! آپ ہم سے اتنا پرائیویٹ سوال کرنا بوجھ رہے ہیں؟“ کمیشن نے کہا۔

”ارے میں جو کچھ پوچھ رہا ہوں اس میں میرا مقصد ہے۔“ جہاں نے کہا۔ ”میں اس کا کارن تب بتاؤں گا جب تم میری جانب سے پوچھے گئے اس سوال کا جواب دو گے۔“

لالہ جی نے اسے بتلایا کہ حویلی سے ملحقہ بے شک دکانیں ضرور ہیں لیکن ان پر میرے بھائی کے زمانے کے انتہائی پرانے کرایہ دار قابض ہیں اور ان کا کرایہ نہ ہونے کے برابر 50 اور 100 روپے کے درمیان ہی ہے اور وہ سب حجام، کریانے والوں، چھوٹے موٹے کام کرنے والوں پر مشتمل ہیں اور وہ مجھے رورور کر رہے ہیں۔

”اور اگر انہیں فروخت کیا جائے تو کتنے کی بئیں گی؟“ جہاں نے پوچھا۔

”میں کیا کہہ سکتا ہوں؟“ لالہ جی نے کہا۔ یہ بات لالہ اس کو جان بوجھ کر بتلانا نہیں چاہتا تھا۔

فارغ کروائے گا۔“ آفیسر نوتال نے انتہاء کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں نہیں جیساں جی! یہ میرے بچپن کا دوست ہے، بے ضرر اور بڑا گہرا راز ہے۔“ لالہ نے کہا۔

”دیکھ لالہ! اگر تیری اس بیٹھک سے ہمارے خلاف ذرا سی بھی گندی ہوا باہر نکلی تو یاد رکھ ایک بہت بڑا برپادی کا طوفان تیری عزت یہ جو طلی سب اڑا کر لئے جائے گا۔“ آفیسر نوتال نے انتہاء کرتے ہوئے کہا۔

”تجھے تیری اور ہمیں اپنی غرضیں ہیں۔ دیکھ اگر ٹوٹنے عقل سے کام لیا تو ہم تجھ سے جو ذیل کریں وہ تیرے سکون اور مستقبل کے لئے انتہائی سودمند ہوگی۔“

”نوتال جی! میں اس وقت بڑے کڑے اور ذہنی کوفت والے حالات سے گزر رہا ہوں۔“ لالہ جی نے کہا۔ ”میں مانتا ہوں کہ میں نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی۔“

”لالہ جی میں معذرت چاہتا ہوں۔“ آفیسر نوتال نے لالہ جی کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”آپ کو درمیان میں اس لئے نوکا ہے کہ کچھ غلطیاں ایسی ہوتی ہیں جن کا ادا ہو جاتا ہے اور کچھ غلطیاں ایسی ہوتی ہیں جو اپنے پیچھے بچپن، جموڑنے کے علاوہ گلے میں نوکلی پھانسی کی طرح انک جاتی ہیں۔ میری نظر میں آپ نے حویلی کے کیس کو اپنی بیوقوفانہ حرکتوں کی وجہ سے سنڈاس میں تبدیل کر لیا ہے اور P.C.N.O.C بھی لیا ہے۔ انھوں نے نو مہراز دفتر کا سب سے بڑا ذی فائز ملازم ہے۔ اس کے خلاف تو تادمی کارروائی ہو رہی ہے اور ویسے بھی میری اطلاع کے مطابق وہ آج کل پنجاب کے شہر دیر آباد بھاگ ہوا ہے اور اس نے آپ سے ہماری رقم لے کر آپ کی قسلی کے لئے ہمارے ڈیپارٹمنٹ کے جعلی موٹو گرام والے پیڈ پر جعلی P.C.N.O.C سرٹیفکیٹ ٹائپ کروا کے دے دیا ہے۔ میں قانونی طور پر مجبور ہوں کہ متعلقہ جعلی

کے سامنے ذلیل ہونے سے بچا لو۔ میں تا عمر تمہارا شکر گزار رہوں گا۔“

”اچھا لالہ جی! اپنے دماغ پر چھتا کا بوجھ نہ ڈالو۔“ جیساں نے کہا۔ ”میں تمہیں کل بتاؤں گا کہ تمہارا کام کس طرح اور کس قیمت پر ہوگا اور ہاں آخری بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں صرف اور صرف کمیشن کی کوششوں اور اس کی خاطر آیا ہوں اور جیسا یہ کہے گا میں ویسا کرنے کی کوشش کروں گا۔“

دوسرے روز لالہ کیدار ناتھ کی حویلی کے بڑے دروازے پر ایک کالے رنگ کی بڑی اور مہنگی کارر کی۔ اس کی پچھلی سیٹ پر سے جیساں اور اس کے ساتھ ایک چڑا سی قسم کا آدمی جبکہ ڈرائیوگر سیٹ سے ایک سوئڈ بوئڈ قسم کا آدمی نکلا۔

جیساں نے آتے ساتھ ہی سستے کے بعد لالہ جی کے کان میں کہا کہ میں تیرے سے فائل ذیل کرنے کے لئے متعلقہ آفیسر لے آیا ہوں جس نے تیری دوستی نیا پار لگائی ہے۔ تم نے ان کی اچھی طرح سیدھا کرنی ہے۔ آفیسر حویلی سے ملحقہ تمام دکانوں کو باری باری آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔

”لالہ جی! یہ فرسٹ آفیسر نوتال ہیں۔“ جیساں نے کہا۔ ”ان ہی کے پاس تمہاری فائل پڑی ہوئی ہے اور یہ ریکارڈ کیپر ہالں ہے۔ اس نے بھی آپ کے جعلی کاغذات کو درست قرار دینے میں اہم کردار ادا کرنا ہے۔“

لالہ جی نے جلدی سے ابا کو گھر بلوایا۔ ابا کو جب بیٹھک میں بلوایا گیا تو جیساں نے سخت برہمگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہم لوگ غیر قانونی طور پر تیرے فائدے کے لئے یہاں آئے ہیں اور یہ کام ڈسکے کی چوٹ پر نہیں بلکہ چھپ چھپا کے ہوتا ہے۔

”چلو یہ لالہ تو ہم سب کی لگی لگائی سرکاری نوکری کو

RTM 234574

بولو فتین

سیلنگ فین
پیڈل فین
ایگزاسٹ فین



الے، جے، چکھے
سیلنگ فین پیڈل فین
ایگزاسٹ فین

اے۔ جے الیکٹرک انڈسٹری

محلہ نور پور شرقی گجرات

053-3521165, 3601318

سرٹیفکیٹ پر Fake کی تصدیق کر کے اسے ہائی کورٹ میں بھیج دوں اور میں وثوق سے کہتا ہوں کہ جس دن ہائی کورٹ میں ہمارے ڈیپارٹمنٹ کا لیٹر جائے گا وہی دن آپ کی تباہی و بربادی کا دن ہوگا۔

”ساری بات صاف ہو گئی۔“ ابا نے نوتال سے کہا۔ ”اب آپ یہ بتائیں اس معاملے کو سلجھانے کے لئے لالہ جی کو کیا کرنا ہوگا؟“

”یہ تم نے کام کی بات کی ہے۔“ نوتال نے خوش ہو کر کہا۔ پھر لالہ جی کو مخاطب کر کے پوچھا۔ ”اچھا یہ بتاؤ کہ ہمیں اس کام کے لئے کچھ لینا چاہئے؟“

”نوتال صاحب! معاملہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔“ لالہ جی نے بمشکل ملی بن کر بڑے دھیسے لہجے میں کہا۔ ”میری تو مقدمات اور گھر میں ہونے والے پراسرار واقعات نے کمر توڑ کے رکھ دی ہے۔ میں اپنی طور پر بالکل مفلوج ہو گیا ہوں۔ بھگوان کے واسطے مجھ پر اتنا بوجھ ڈالنا جتنا کہ میری نحیف کمر سہہ سکے۔“

نوتال اپنی سیٹ سے اٹھا اور لالہ کے قریب آ کر اسے پانی کا گلاس تھماتے ہوئے کہا۔ ”گھبراؤ نہیں لالہ جی! میں آپ پر اتنا بوجھ نہیں ڈالوں گا جس سے آپ کا بھٹ ہی بیٹھ جائے۔ میرے ذہن میں اس مسئلہ کو حل کرنے کا ایسا فارمولہ آیا ہے جس کے تحت ہمارا مالی مسئلہ بھی حل ہو جائے گا اور آپ کی بھی اس چوہے کی ٹوکڑی سے جان چھوٹ جائے گی۔“ نوتال نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”میرا فارمولہ یہ ہے کہ آپ نے جو گیارہ دکانیں ناجائز قائم کی ہوئی ہیں میرے حساب سے ہر دکان کی قیمت کم از کم بیس پچیس ہزار روپے تو ہوگی۔ آپ ایسا کریں کہ ہمیں صرف تین دکانوں کی قیمت کے برابر تقریباً ستر ہزار روپے خرچہ دے دیں۔“

لالہ جی نے نوتال کے منہ سے یہ جملہ سنا تو یکدم جھٹکا کھا کر کرسی سے کسی مگزی کی طرح اچھلا اور بمشکل

لپسٹکالیٹر

0300-9667909

☆ دنگیر شہزاد

تیرے باپ کو راضی کر کے میں تیری شادی اپنے ملازم سے کرا دیتا ہوں۔ دنیا کے لئے تو چمیدو کی بیوی ہوگی مگر تجھ پر حق میرا ہوگا..... قسم سے رانی جا کر رکھوں گا۔



پور کے باشندے سبیل احمد سے ہوا تھا۔ شکلیہ کی موت کے بعد سعادت بیگم نے بہن کے کنبے سے رشتہ منقطع نہیں کیا تھا۔ تھوڑے تھوڑے عرصہ بعد وہ کبھی پور آ کر بہن کے بچوں کی خیر خبر لے لیا کرتی تھی۔ 21 فروری 2011ء کو کبھی سعادت بیگم اپنے شوہر سبیل احمد کے ساتھ کبھی پور آئی تھی چونکہ پلوٹہ اپنی خالہ سعادت بیگم سے خوب ملتی تھی، اس لئے 22 فروری کو وہ علی پور لوٹنے لگی تو وقار خاں سے کہہ کر پلوٹہ کو کبھی کبھ دن کے لئے اپنے ساتھ لے گئی۔

پلوٹہ کا علی پور پہنچنا ہی اس کی زندگی میں خطرناک موڑ لے آیا تھا۔ مقدر نے وہیں سے اپنا کھیل کھیلنا شروع کر دیا تھا۔ بہر حال علی پور میں واقع خالہ خالو کے گھر پہنچی تو دو دن میں ہی اس نے پڑوس میں رہنے والی بنو سے بہنا پا جوڑ لیا۔ کہتے ہیں بنو چلتا پڑھتا لڑکی تھی۔ اس کے گھر میں پولیس کانسٹیبل ناصر کا آنا جاتا تھا۔ لیکن مزاج ناصر تھا نہ علی پور کی چوکی میں تعینات تھا۔ بنو کے وقار خاں کے ساتھ خوشگوار تعلقات تھے۔ پلوٹہ اور بنو کے تعلقات میں اتنی شیرینی کھلی کہ پوچھو مت۔ پلوٹہ بنو کے گھر میں اس طرح کھتی رہتی تھی جیسے اس کے گھر میں مہمان بن کر آئی ہو۔ کھانا پینا بیٹھنا سب بنو کے گھر۔

آگے چل کر جو چھاپی سانسے آئی اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ دونوں کے تعلقات میں آئی یہ سناس ریلی باتوں اور سنہرے سپنوں کے سبب تھی۔ بنو اسے رنگین اور روبان انگیز خوابوں کی دنیا دکھاتی۔ پلوٹہ عمر کے اس دور میں تھی جس میں ایسی باتیں سننی پیدا کرتی ہیں۔ اندازہ لگایا جاتا ہے کہ بنو صرف تصوری تک محدود نہیں تھی بلکہ اسے پکٹیکل کرنے کے لئے بھی اکسار ہی تھی۔ یا پوں کہا جاسکتا ہے کہ بنو پلوٹہ کو ناصر کے لئے راضی کر رہی تھی۔

27 فروری کو ناصر بنو کے گھر آیا۔ اتفاق سے اس وقت پلوٹہ بھی وہیں موجود تھی۔ اسے دیکھ کر ناصر کی

خاں کبھی پور کا رہنے والا تھا۔ پاکستان نیشنل وقار پارٹی کا پرانا اور سرگرم ورکر، جنرل کبھی خاں کے مارشل لاء کے زمانے سے ہی پارٹی کے سربراہ عاطف باجوہ کا مرید تھا۔ وقار خاں کی شادی عاصم اور میرا کی بیٹی شکلیہ سے ہوئی تھی۔ بعد میں وقار خاں چار بچوں کا باپ بن گیا۔ تین بیٹے تھے، شعیب، احمد، عدیل اور ایک اکلوتی بیٹی پلوٹہ۔

وقار خاں کے پاس مجموعی طور سے چار بیگھ زمین تھی۔ چھوٹے سے زمین کے اس ٹکڑے سے اتنی پیداوار نہیں ہوتی تھی کہ چھ افراد کے کنبے کا خرچ چل سکے۔ اس لئے وقار خاں کاشت کاری کے علاوہ محنت مزدوری بھی کر لیتا تھا۔ جیسے تیسے گرسلی چل رہی تھی۔ ایک دن شکلیہ اچانک بیمار ہو گئی، گھر میں نجاست نے پاؤں پھیلانے تھے۔ اس لئے وقار خاں ڈھنگ سے بیوی کا علاج نہیں کرا سکا۔ جس کے نتیجے میں مناسب علاج نہ ہونے کے سبب شکلیہ کی موت ہو گئی۔ ان دنوں پلوٹہ محض نو سال کی تھی اور گاؤں کے سرکاری اسکول میں درجہ چہارم میں پڑھ رہی تھی۔ ماں کی موت کے بعد پلوٹہ کی پڑھائی بند اور چوٹے بنو کے کی ساری ذمہ داری سر پر آ گئی۔ چونکہ پلوٹہ کے سامنے کوئی متبادل نہیں تھا اس لئے وہ ان نئی ذمہ داریوں کو نبھانے لگی۔

دو دھیرے دھیرے پلوٹہ سولہ سال کی ہو گئی۔ ایک پرانی کہادت ہے انکوری تیل منگنی کی دیوار پر ہی چڑھتی ہے۔ پلوٹہ بھی اس سے ہر انہیں تھی۔ غربت اور عمر میوں میں جیتے رہنے کے باوجود اس نے رنگ و روپ خوب پایا تھا۔

غربت و افلاس میں جوان بیٹیوں کے جینز کی فکر نہ کیڑا ہے جس کی غذا ماں باپ کے دل اور دماغ ہوتے ہیں۔

پلوٹہ کی ایک خالہ تھی سعادت بیگم۔ اس کا بیاہ علی

آنکھوں میں شیطانی چمک ابھر آئی۔
 ”بنورانی! تمہارے گھر میں جبکہ رہا یہ نایاب گوہر
 کون ہے؟“ وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔
 بنو ناصر کو دوسرے کمرے میں لے گئی۔ وہاں ان
 دونوں میں نہ جانے کیا باتیں ہوئیں، کچھ دیر بعد وہ
 کمرے سے باہر آئے تو جوش سے دونوں کے چہرے
 دمک رہے تھے۔

”ان سے ملو پلو!“ بنو نے پلوٹ کا تعارف ناصر
 سے کراتے ہوئے کہا۔ ”یہ پولیس کے افسر ہیں۔ علاقے
 میں ان کا زبردست رعب داب ہے۔ لوگ ان سے
 قربت بڑھانے کو ترستے ہیں اور یہ تمہارے قریب آنے
 کے لئے چتاب ہیں۔ ان کے ساتھ محوم پھراؤ۔ یہ بہت
 پیار سے تمہاری ہر خواہش پوری کریں گے۔“

پلوٹ پہلے ہی بنو کے دکھائے ہوئے خوابوں میں
 کھوئی رہتی تھی۔ اسے ہر چمکتی چیز سونا نظر آتی تھی۔ جب
 بنو نے اسکا یا تو پلوٹ ناصر کے ساتھ جانے کو تیار ہو گئی۔
 ناصر کا گاؤں میں رعب داب تھا ہی وہ سب کی آنکھوں
 کے سامنے پلوٹ کو اپنے ساتھ لے گیا۔ شام ڈھل گئی۔
 رات کی تاریکی اپنا سایہ پھیلانے لگی۔ اس کے باوجود
 پلوٹ گھرنے لونی تو سعادت بیگم فکر مند ہونے لگی۔

”اس بنو کی پچی نے پلوٹ پر نہ جانے کیا جادو کر دیا
 ہے۔“ سعادت بیگم نے بوڑھتے ہوئے کہا۔ ”ہر وقت
 اُس کے گھر میں تھکی رہتی ہے۔“ چہرہ شوہر سے مخاطب
 ہوئی۔ ”تم فکر کر میرا منہ کیا تک رہے ہو بنو کے گھر جا کر
 پلوٹ کو بلا لاؤ۔“

سمیل احمد نے فوراً پاؤں چپل میں ڈالے اور گھر
 سے نکل گیا۔ وہ بنو کے گھر کی طرف جا رہا تھا کہ راستے
 میں صدام مل گیا۔ اس نے سہیل احمد کو روک کر ادھر ادھر
 دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اس کا مطلب یہ ہے کہ سب کو پتہ
 ہے اور تمہیں خبر نہیں۔“

”کیا پتہ اور کیسی خبر؟“ سہیل نے حیران ہو کر
 پوچھا۔
 ”پلوٹ کو ناصر لے گیا ہے۔“ صدام نے اسے بتایا۔
 ”اب تک وہ اسے خراب بھی کر چکا ہوگا۔“
 ”کیا بکواس کر رہے ہو؟“ سہیل احمد کی بھوین تن
 گھٹیں۔

”جوج تھا میں نے بتا دیا۔ اب تم جانو تمہارا
 کام۔“ کہہ کر صدام اپنی راہ چلا گیا۔
 اندر سے گھبرایا ہوا سہیل احمد بنو کے گھر پہنچا۔
 پلوٹ کے بارے میں پوچھ گچھ کی۔
 ”میں کیا جانوں کہ پلوٹ کہاں ہے؟“ بنو صاف مکر
 مانی اور کہا۔ ”وہ میرے گھر آئی ہی نہیں ہے۔“
 یہ نکالسا جواب سن کر سہیل احمد بنو کی دلہیز سے لوٹ
 آیا۔ پلوٹ کے بارے میں اس نے گاؤں کے دیگر لوگوں
 سے پوچھ گچھ کی تو انہوں نے بھی وہی بتایا جو اُسے صدام
 بتا چکا تھا۔ اس لئے سہیل احمد کو یقین کرنا پڑا کہ مصری
 بیت سے پلوٹ کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

گھر لوٹ کر سہیل احمد نے ساری باتیں سعادت
 بیگم کو بتائیں تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ سہیل احمد
 نے اسے شکل سے خاموش کیا اس کے بعد مسئلہ کا حل
 تلاش کرنے میں بنو کی سر جوڑ کر بیٹھے تو طے ہوا کہ پلوٹ
 کو آزاد کرانے کے لئے کل صبح کچھری جا کر پولیس ایس
 پی سے فریاد کی جائے۔

28 فروری کو صبح ہوتے ہی سعادت بیگم اور سہیل
 احمد ایس پی آفس روانہ ہو گئے۔ پولیس ایس پی سے بھی
 آسانی سے ان کی ملاقات ہو گئی۔ کچھ پور کے ان میاں
 بنو کی فریاد ایس پی نے نہایت شجیدگی سے سنی اور اعلیٰ
 سطحی جانچ کر دائی تو شکایت درست ثابت ہوئی۔ پلوٹ
 ناصر کے کمرے میں ہی تھی۔ پولیس ایس پی نے جاتا خیر
 ویش ڈال کر پلوٹ کو آزاد کرالیا اور ناصر کو فوری اثر سے

میں ڈبکی لگا لینے میں کسی طرح کا حرج نہیں ہے۔ س
سوچ کی وجہ سے سارم نے ماما بھانجی کا مقدس رشتہ پامال
کر دیا۔

اس دوران پلوٹہ بیمار پڑ گئی۔ وقار خاں کو پلوٹہ کی
بیماری کی خبر گئی تو وہ سعادت، وقار اور حارث کے ساتھ
پلوٹہ کو واپس اپنے گھر لے جانے کے لئے پھول مگر جا
پہنچا لیکن سارم نے اُس کی مرضی پر پانی پھیر دیا۔

”بھائی صاحب! پلوٹہ میری بھی تو بیٹی جیسی ہے۔“
اس نے کہا۔ ”موسم بدل رہا ہے۔ اس لئے اسے بخار آ
گیا ہے۔ پریشان ہونے یا پلوٹہ کو کہیں لے جانے کی کوئی
ضرورت نہیں ہے۔ علاج چل رہا ہے، دو چار دن میں خود
ٹھیک ہو جائے گی۔ اس کی دیکھ بھال کے لئے ہم سب
ہیں نا۔ آپ بے فکر ہو کر اپنا کام دھندہ جا کر دیکھئے۔“

وقار خاں حقیقت میں بے فکر ہو کر ساتھیوں سمیت
اپنے گاؤں لوٹ آیا۔ اس کے کچھ ہی دنوں بعد پلوٹہ
پھول مگر سے غائب ہو گئی۔ سب کا قیاس تھا کہ ناصر کی
پلوٹہ کو بہلا پھسلا کر اپنے ساتھ لے گیا ہو گا۔ ان لوگوں
نے علی پور جا کر پتہ کیا تو معلوم ہوا کہ پلوٹہ ناصر کے
ساتھ نہیں تھی۔ وقار خاں نے پلوٹہ کی تلاش جاری رکھی۔
اس سمت میں اسے کامیابی بھی ملی۔ معلوم ہوا کہ پلوٹہ کو
کھڑیاں کا 24 سالہ عزیز اپنے گھر میں بے نکاحی بیوی کی
طرح رکھے ہوئے ہے۔ کھڑیاں کثیر آبادی والا شہر تھا اس
لئے وقار خاں کو ہمت نہیں ہوئی کہ وہ وہاں جا کر عزیز کے
گھر سے پلوٹہ کو آزاد کرالیتا۔ اس کام کے لئے سسر پر سوا
سیر کی ضرورت تھی۔ کون ہے ایسا طاقتور اور بااثر شخص جو
پلوٹہ کو عزیز کے چنگل سے نکال کر لاسکے۔ وقار خاں نے
غور کیا۔ صرف اور صرف ایک نام اس کے ذہن میں
اُٹھا، چوہدری بلال سکندر۔

2008ء میں ہوئے الیکشن میں وارث سیال نے
چوہدری بلال سکندر کو صوبائی سیٹ سے انتخابی میدان میں

مغل کر دیا۔

پہلی نگاہ سے یہ معاملہ انخواہ عصمت درسی کا بننا تھا۔
مگر وردی کو کلنگ سے بچانے کے لئے چھیڑ چھاڑ کا ہی
معاملہ درج کیا گیا۔ پلوٹہ سہیل احمد کی سپردگی میں دے
دی گئی۔ سہیل احمد پلوٹہ کو اپنے گھر رکھنے کے حق میں نہیں
تھا۔ اس لئے وہ پلوٹہ کو لے کر کچھی پور میں واقع اُس کے
گھر آیا۔

”وقار خاں! سنبھالو اپنی بیٹی کو۔“ اس نے طنز یہ
لہجہ میں کہا۔ ”چھوٹی سی اس لڑکی میں بڑے بڑے گن
ہیں۔ خوب سنبھال کر رکھنا اسے۔“ اس کے بعد اس نے
وقار خاں کو تمام واقعات سے آگاہ کر دیا۔

وقار خاں کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ دوسرے دن اس
نے پھول مگر جا کر ساس و سسر سے سارا قصہ بیان کر دیا۔
تجربے کا عالم نے پورے معاملے پر سنجیدگی سے غور کیا تو
اس نتیجے پر پہنچا کہ ناصر کے ساتھ جانے میں پلوٹہ کی بھی
مرضی شامل تھی۔ پلوٹہ نہیں چاہتی تو ناصر کی بھی صورت
میں اسے اپنے ساتھ نہیں لے جاسکتا تھا۔

”تمہارے گھر میں کوئی عورت نہیں ہے۔“ عالم
نے وقار خاں سے کہا۔ ”اس لئے اچھا بُرا سوچے بغیر
پلوٹہ کا دل بہک گیا۔ ایک بار جو لڑکی بہک جائے وہ بار
بار بہکتی ہے۔ بہتر یہی ہے کہ تم پلوٹہ کو پھول مگر چھوڑ آؤ۔
وہ اپنی نانی کی گمرانی میں رہے گی۔ تو کوئی ایسی دسکی بات
نہیں ہوگی۔“

وقار خاں دو تین دن بعد ہی پلوٹہ کو اس کے نہال
میں چھوڑ گیا۔ سیرا اور عالم کی دو ہی بیٹیاں تھیں۔ شکیلہ
اور سعادت یتیم اس لئے وہ گاؤں کے ہی رہنے والے
اپنے رشتے دار سارم کو بیٹے کی طرح سمجھتے تھے۔ سیرا اور
عالم کے گھر کنبے کی کوئی اچھی بُری بات اس سے چھپی
ہوئی نہیں تھی۔ سارم کو جب پلوٹہ، ناصر کیس کے بارے
میں معلوم ہوا تو اُسے لگا کہ پلوٹہ بہتی ہوئی گنگا ہے جس

دست دگر بال کے بعد عرف مزاج نثار

خادم حسین مجاہد

کی طرز و مزاج پر مشتمل دوسری کتاب

قلم آرائیں



لکھنؤ: جی پبلشرز 2- سید پلازہ، جعفری روڈ، اردو بازار، لاہور

Ph: 042-7220631, Mob: 0300-9422434

اتارا تھا۔ پارٹی کا پرانا وقار دار ہونے کے ناطے وقار خاں ان کی تشہیر میں جٹ گیا تھا۔

انتخابات کے دوران ہی چوہدری بلال سکندر سے پاکستان نیشنل پارٹی کے ورکر کے طور پر وقار خاں کا تعارف ہوا اور دونوں کے اچھے تعلقات استوار ہو گئے۔ ایکشن لڑ کر چوہدری بلال سکندر ایکشن جیت گیا تو بھی وقار خاں قصبہ بھی پور میں واقع ان کے مکان پر سلام کرنے جا رہا۔

وقار خاں نے چوہدری بلال سکندر کے کئی کام کئے تھے اور ان سے خود کوئی کام نہیں لیا تھا۔ بیٹی کے مسئلے پر اسے چوہدری بلال سکندر یاد آیا تو وہ اپنی فریاد لے کر ان کی ڈیوڑھی جا پہنچا۔ چوہدری بلال سکندر نے یقین دہانی کرائی کہ وہ گل خان سے مطلوبہ اطلاعات ملنے کے بعد پلوٹہ کو عزیر کے چنگل سے آزاد کرالیں گے۔

7 مارچ کو دوپہر سے کچھ قبل ہی گل خان، چوہدری بلال سکندر کے گھر آ پہنچا۔ وقار خاں کی خبر غلط نہیں تھی۔ پلوٹہ حقیقت میں عزیر کے گھر میں اُس کی بیوی کی طرح رہ رہی تھی۔ ان دونوں کے اس ناجائز رشتے کو عزیر کی ماں ایشال اور باپ سلیم کی بھی سرپرستی حاصل تھی۔ ابتدا میں خاوند سے دانستہ یا نادانستہ کوئی گناہ ہو جائے تو بیوی مجبوری کو وفا کا نام دے کر خاموش رہتی ہے۔ جب اُس کے بچے جوان ہو جاتے ہیں تو پھر وہ اُسے ایسی سزا دیتی ہے کہ جس کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔

کچھ بھی تھا، پلوٹہ کو عزیر کے چنگل سے نکال کر وقار خاں کو دیا ہوا وعدہ پورا کرنا تھا۔ لہذا چوہدری بلال سکندر نے شوکت چیمرا، ابو ذر، گل خان، چمیدو وغیرہ سب جاں نثاروں کو اپنے ساتھ لیا اور کھڑیاں گاؤں میں واقع عزیر کے گھر پہنچ گئے۔ چوہدری بلال سکندر کے دینگ جاں نثار عزیر کے گھر میں کھس گئے اور پلوٹہ کو کھینچے ہوئے باہر لے آئے۔ سلیم، عزیر وغیرہ نے مدافعت کی تو

جیل بھجوا دیا گیا ہے۔

بقول پلوٹ کھڈیاں سے لانے کے بعد چوہدری بلال سکندر نے اپنی کوشی کے وسیع احاطے میں واقع متعدد کمروں میں سے ایک کمرہ اسے رہنے کے لئے دے دیا تھا۔ 12 مارچ کی رات کو چوہدری صاحب اس کے کمرے میں آئے۔ وہیں بیٹھ کر شراب پی اور پھر زور زبردستی کر کے اپنی ہوس کا شکار بنا لیا۔ پلوٹ کے رونے سننے اور مخالفت و مزاحمت کی پروا نہ کر کے چوہدری بلال سکندر نے دوبار اس کے ساتھ منہ کالا کیا۔

”پلوٹ! قسم سے تو بڑی ظالم چیز ہے۔“ چوہدری سکندر نے اس سے کہا۔ ”طبیعت خوش ہو گئی وقار خاں کو راضی کر کے میں اپنے ملازم چمیدو سے تیری شادی کرا دیتا ہوں۔ دنیا کو دکھاؤں گے لئے تو چمیدو کی بیوی رہے گی۔ مگر تجھ پر حق میرا رہے گا۔ میں زندگی بھر تجھے رانی بنا کر رکھوں گا۔“

پلوٹ کو نہ چمیدو میں دلچسپی تھی نہ ہی وہ چوہدری بلال سکندر کی رکھیل بن کر رہنا چاہتی تھی۔ چوہدری بلال سکندر کی پیشکش نہ قبول کر کے پلوٹ نے نکل بھاگنے کی کوشش کی تو چوہدری بلال سکندر نے اس کی پٹائی کر دی۔ ضدی پلوٹ بھی صورت میں چوہدری بلال سکندر سے دہنے کو تیار نہیں تھی۔

”میں دنیا کو بنا دوں گی کہ تم کتنے گھٹاؤنے اور گرے ہوئے انسان ہو۔“ وہ چوہدری بلال سکندر کو دھمکی دینے لگی۔ ”میں لاہور جا کر گورنمنٹ سے تمہاری شکایت کروں گی۔“

پلوٹ کی دھمکی سے چوہدری بلال سکندر ڈر گیا اس نے پلوٹ کا منہ بند رکھنے کے لئے ایک نیا منصوبہ بنا لیا۔

اس کے بعد اسے اپنے انہی جانثاروں کے حوالے کر دیا جو پلوٹ کو کھڈیاں سے آزاد کرا کر لائے تھے۔ ان سب نے پلوٹ کو اپنی ہوس کا شکار تو نہیں بنایا مگر ساری رات

لات گھونسوں اور رانٹلوں کی بٹ سے ان کی پٹائی کی گئی۔ پلوٹ نے بھی کہا کہ عزیز مجھے زبردستی گھر میں نہیں رکھے ہوئے ہے۔ میں اپنی مرضی سے اس کے ساتھ رہ رہی ہوں۔ ہم ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں اور جلد ہی شادی کر لیں گے لیکن کسی نے اس کی باتوں پر کان نہیں دھرا۔ چوہدری بلال سکندر کے اشارے پر اس کے ساتھیوں نے پلوٹ کو زبردستی جیب میں بٹھالیا۔ آگے ایم پی اے سبز نمبر پلیٹ لگی کار۔ اس کے پیچھے جاں نثاروں کی ٹیم، سب کے دیکھتے ہی دیکھتے لمبی پور لوٹ آئے۔

گھر پہنچتے ہی چوہدری بلال سکندر نے فون کے ذریعے وقار خاں سے رابطہ قائم کر کے پلوٹ کو آزاد کرا لانے کی خوشخبری سنادی۔ سکون کی سانس لے کر وقار خاں نے اپنے لیڈر کا شکریہ ادا کیا۔

”چوہدری صاحب! آپ کا یہ احسان میں کبھی نہیں بھولوں گا۔“ اس نے احسان مند لہجے میں کہا۔ ”آپ پلوٹ کو نوکرائی بنا کر اپنی کوشی میں ہی رکھئے۔ کچھ روز بعد آپ کے پاس آ کر میں اس سے مل لوں گا۔“

مگر کرپ وقار خاں اپنے کام و دھندوں میں ایسا پھنسا کہ بیٹی سے ملنے نہیں آ سکا۔ 14 مارچ کو وقار خاں کو جو خبر سننے کو ملی وہ اسے بلا دینے والی تھی۔ پلوٹ نے چوہدری بلال سکندر کے گھر سے رانٹل، باغیچہ ہزار روپے اور ایک موبائل فون چوری کر لیا۔ چوہدری بلال سکندر کے بڑے بیٹے چوہدری زاہد بلال نے اسے تھانہ لے جا کر سب انسپلر سیف اللہ کے سپرد کر دیا۔ پلوٹ اب جیل میں ہے۔

16 مارچ کو وقار خاں نے اپنے بیٹے شکیل کو پلوٹ سے ملنے کے لئے کوٹ لکھت جیل بھیجا تو ایک دوسری کہانی وہاں اسے انتظار کرتی ملی۔

روتے سکتے ہوئے پلوٹ نے بتایا کہ چوہدری بلال سکندر کے گھر میں اس نے کسی طرح کی چوری نہیں کی تھی بلکہ اس کا منہ بند رکھنے کی سازش کے تحت اسے

زندگی ایک ابھی ہوئی ڈور کی مانند ہے جسے ہر کوئی سلجھانے میں ہی لگا نظر آتا ہے۔ مگر وہ دنیاوی گرہیں اتنی کھلتی نہیں ہیں جتنی کہ مزید پڑ جاتی ہیں حتیٰ کہ شاہ ہو جاتی ہے اور آدی غروب ہو جاتا ہے۔

اور غداری، وہ سوچ میں ڈوب گیا کہ چوہدری بلال سکندر جیسے طاقتور شخص کو دھول چٹانے کے لئے کون سی راہ اختیار کی جائے۔ بہت غور کرنے کے بعد اس نے تحریک حقوق انسانی کا تعاون لینے کا فیصلہ کیا۔

17 مارچ کو وقار خان لکھی پور میں واقع حقوق انسانی کے ہیڈ آفس پہنچ گیا۔ اس نے حقوق انسانی کی چیئر پرسن ماریہ سے ملاقات کی اور سارا واقعہ کہہ سنایا۔ ماریہ فوراً حرکت میں آ گئیں۔ تھوڑی ہی دیر میں انہوں نے ایک سو سے زائد خواتین کو جمع کر کے لکھی پور کوچ کر دیا۔

وقار خاں کو ساتھ لے کر تحریک حقوق انسانی نے پولیس ایس پی کے آفس پر مظاہرہ کیا۔ چیئر پرسن ماریہ نے ایس پی شہر و علی کو وہ تحریر دے دی جسے شعلیل جیل سے لے کر آیا تھا۔ تحریک حقوق انسانی کا مطالبہ تھا کہ زائد چوہدری بلال سکندر کو گرفتار کر کے جیل بھیجا جائے اور بے قصور پلوٹہ کو رہائی ہو۔ ایس پی آفس پر تحریک حقوق انسانی کے مظاہرے کی خبر پھیلتے ہی پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے لوگ وہاں پہنچ گئے۔ بس، سیمیں سے صوبائی سطح پر سنسنی پھیلنا شروع ہو گئی۔

نیز چینلوں نے اسی روز سے ہی شعلیل پارٹی لیڈر کے خلاف محاذ کھول دیا۔ رہی سہی کسر اگلے دن کے اخبارات نے پوری کر دی۔

پاکستان شعلیل پارٹی کے چوہدری بلال سکندر پر زنا بالجبر کا الزام عائد ہوتے ہی حزب اختلاف پارٹیاں بھی سامنے آ گئیں۔ لیڈروں کی بیان بازی شروع ہو گئی۔ پلوٹہ سے ہمدردی اور چوہدری بلال سکندر کو گرفتار کر کے

اس سے چھیڑ چھاڑ کرتے رہے۔

13 مارچ کو شوکت چمر اور غیرہ نے پلوٹہ کو تھانہ لے جا کر سب انسپکٹر سیف اللہ کے حوالے کر دیا۔ تھانے میں بھی پلوٹہ پر ظلم کر کے اسے منہ بند رکھنے کے لئے راضی کرنے کی کوشش کی گئی لیکن پلوٹہ چوہدری بلال سکندر کا اصلی چہرہ بے نقاب کرنے کی اپنی ضد پر قائم رہی۔ ان دونوں تھانہ کے انچارج عبدالجبار تھے اور علاقہ افسر نوید گجر۔ تھانہ کی حوالات میں ایس آئی سیف اللہ کیا کر رہے ہیں، دونوں کے علم میں تھا۔ چونکہ معاملہ نیشنل پارٹی کے بااثر چوہدری بلال سکندر سے متعلق تھا۔ اس لئے انہوں نے بھی پلوٹہ کا دماغ درست کرنے کی خاموش اجازت دے دی تھی۔ ایس ایس پی وقاص سندھو تک یہ بات پہنچی تو انہوں نے بھی خاموشی اختیار کر لی۔

تھانے میں تمام ظلم و تعدد برداشت کرنے کے باوجود پلوٹہ منہ بند رکھنے کو تیار نہیں تھی۔ جب 14 مارچ کو چوہدری بلال سکندر کے بیٹے چوہدری زائد بلال نے تھانہ جا کر رائل، موبائل فون اور پانچ ہزار روپے کی چوری میں پلوٹہ کو تاجڑ کر اڈیا۔ رپورٹ چوری کے تحت درج کی گئی تھی۔ رپورٹ درج ہونے کے بعد پولیس اٹھیل چالو ہو گیا۔

پلوٹہ تھانہ کی حوالات میں تھی لیکن سیف اللہ نے لکھی پور سے اس کی گرفتاری دکھا کر اس کی ہی میڈیا نشاندہی پر رائل اور موبائل فون کی برآمدگی کا عدالت میں ظاہر کر دی۔ اس کے بعد 14 مارچ کو ہی پلوٹہ کو عدالت میں پیش کر کے کوٹ لکھپت جیل بھیج دیا گیا۔

واقعہ کی حقیقت اپنے بھائی شومیل کو بتانے کے بعد پلوٹہ نے پولیس ایس پی کے نام ایک خط لکھ دیا۔ ”شومیل! جو ج ہے وہ اس میں تحریر ہے۔ تم اس معاملے کو آگے بڑھاؤ۔ میں انصاف پانا چاہتی ہوں۔“

لکھی پور لوٹ کر شومیل نے ساری باتیں اپنے باپ وقار خاں کو بتائیں تو اس کی کھوپڑی گھوم گئی۔ ایسا فریب

تھا تو پلوٹھ نے یہ کہہ کر نیا طوفان کھڑا کر دیا کہ ایس پی صاحب اُسے چوہدری بلال سکندر کے حق میں جھکانے کی ناکام کوشش کر گئے ہیں۔

پچھی پور میں جو آگ لگی اس کی آج لاہور تک پہنچ رہی تھی۔ سیاسی پارٹیاں حکومت کے عہدیداروں کو بھی لینے لگی تھیں۔ اس لئے انسپکٹر جنرل پولیس نے معاملے کی جانچ کرائم برانچ کے سپرد کر دی اور 2 اپریل کو چوہدری بلال سکندر کو نیشنل پارٹی کی رکنیت سے معطل کر دیا گیا۔ وارنٹ سیال کے فیصلے کی مذکورہ معلومات ان کے جنرل سیکرٹری فیصل رندھاوانے لاہور میں میڈیا کو دی۔

4 اپریل 2011ء کو دوبارہ کورٹ میں پیش کر کے ان کا بیان کرایا گیا۔ پلوٹھ نے اپنے بیان میں چوہدری بلال سکندر کے خلاف جس بے جا اور جنسی زیادتی کا الزام عائد کیا۔

13 اپریل کو چوہدری بلال سکندر لاہور سے براستہ نور پور پچھی پور آ رہے تھے۔ کار میں ان کے ساتھ ڈرائیور کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ پچھی پور کے قریب ڈونگا ٹن کے پاس پولیس نے کار روک کر چوہدری بلال سکندر کو گرفتار کر لیا۔ چوہدری بلال کو اسی دن کورٹ میں پیش کیا گیا جہاں سے انہیں جیل بھیج دیا گیا۔

چوہدری بلال سکندر کی گرفتاری کے بعد اکثریتی طور پر یہ سچ بیان کیا گیا کہ کرائم برانچ نے اپنی تفتیش میں چوہدری بلال سکندر اور ان کے گروہوں کو قصور وار پایا تھا۔ اس لئے ان کے خلاف مقدمہ درج کیا گیا تھا۔ چوہدری بلال سکندر کی گرفتاری کے بعد ابوذر اور گل خان کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ جبکہ شوکت جہرا 15 اپریل کو کورٹ میں حاضر ہو کر جیل چلا گیا۔ تادم تحریر گرفتار عظیم جیل میں تھے اور کرائم برانچ نے 48 صفحات کی چارج شیٹ عدالت میں پیش کر دی تھی۔

جیل بھیجنے کا مطالبہ شروع ہو گیا۔ دو دن تک تو چوہدری بلال سکندر چپ رہا لیکن پھر میڈیا کے سامنے آ کر اسے بھی اپنے بچاؤ میں بیان دینا پڑا۔

”میرے مخالف سیاسی لوگ میری شہرت خراب کرنے کے لئے یہ سارا ڈرامہ کر رہے ہیں۔“ اس نے بیان دیا۔ ”برسوں سے میں ذیابیطس بلڈ پریشر، ہارٹ کا مریض ہوں۔ میرا ایک گردہ بھی خراب ہے۔ زنا بالجبر کرنا تو دور میں کسی عورت سے کامیاب جسمانی تعلق قائم کرنے میں بھی ناکام ہوں۔ میرے گھر میں چوری کرنے والی پلوٹھ جھوٹی ہے۔“

ایک طرف چوہدری بلال سکندر کا یہ بیان آیا دوسری طرف وقار خاں نے یہ بیان دے کر سنسنی پھیلا دی کہ چوہدری بلال سکندر کے گروہوں سے اسے اور اس کے کنبے کو جان کا خطرہ ہے۔ معاملے کو طول دینے کے لئے وہ لوگ اُسے جان سے مارنے کی دھمکی دے رہے ہیں۔

19 مارچ کو ایصال اور عزیر پلوٹھ سے ملنے کورٹ تکبیت جیل پہنچے۔ وہ لوگ بھی چوہدری بلال سکندر کے اشارے پر پلوٹھ کو سمجھانے گئے تھے کہ جو ہو گیا اُسے بھول کر چپ رہنے میں ہی سب کی بھلائی ہے۔ معاملے کو طول دیتے رہنے سے برے نتائج بھگتنے پڑ سکتے ہیں۔ جیل سے نکل کر یہ بات ہی اخبار کی سرخیاں بن گئیں۔ معاملے کو جتنا دبانے کی کوشش کی گئی وہ اتنا ہی بھڑکتا گیا۔ پچھی پور نیشنل پارٹی کے ضلع صدر احمد آزاد آ رہا پار کی لڑائی کے موڈ میں تھے۔ تو انجمن اتحاد اسلام کے صدر علی عمران پلوٹھ کی لڑائی لڑنے کے لئے میدان میں کود پئے تھے۔

29 مارچ کو پولیس ایس پی شہرہ ز تقریباً ڈیڑھ بجے کورٹ تکبیت جیل جا کر پلوٹھ سے ملے تو شام ہونے سات بجے جیل سے باہر نکلے۔ ایس پی کا سوا پانچ گھنٹے ایک قیدی کے ساتھ جیل میں رہنا جیل مینول کے خلاف

نو جوان لڑکوں کی اس کمزوری کا فائدہ بعض شاطر لوگ بھی اٹھاتے ہیں جو لڑکیاں بن کر ان سے لوڈا بیٹھتے ہیں اس کے لئے وہ زیادہ تر فحش میسج یا آواز بدل کر کال کا استعمال کرتے ہیں۔



پیشہ خادوم حسین مجاہد

ہیکسج کے آپ کوئی بھی بٹن غلطی سے دبا بیٹھیں تو ہیکسج لگ جاتا ہے اور ہیکسج ختم۔

عورتیں تو حال حال ہانڈی روٹی اور کپڑے زیور کے متعلق ذرا سی بات ہی کہیں تو ہیکسج کا نام و نشان نہیں ملتا وہ تو اب کمپنیوں نے بڑے سستے ہیکسج متعارف کرا دیئے ہیں جن پر گھنٹوں بات اب تقریباً مفت ہی ہو جاتی ہے لیکن ہیکسج لگانے کے بعد بھی کسی اور نیٹ ورک پر بات کرنی ہو تو ہیکسج لا موجود ہوتا ہے یعنی یہ بڑی بے وفا اور بے برکتی سی چیز ہے لیکن چونکہ اب یہ بنیاد ضروریات میں شامل ہو گیا ہے اس لئے اخراجات میں ایک مستقل اضافہ ہو چکا ہے اور اس میں امیر غریب کی کوئی تخصیص نہیں اور اس صف میں محمود و ایاز اکٹھے ہی کھڑے ہیں اس سے زندگی آسان تو ہوئی ہے لیکن سستی اور کالی کو بھی

کرشن نے نکسا تھا کہ غم نہ داری بڑ بڑ (اگر تمہیں کوئی غم نہیں تو بکری پال لو) موجودہ دور میں بکری کی جگہ فی اور بچہ ہی بھی رکھی جاسکتی ہیں مثلاً کمپیوٹر، موبائل، بیوی وغیرہ لیکن ان سے بڑھ کر بھی موجودہ دور میں ایک اور پریشان کن چیز کا نام ہے ایزی لوڈ۔ اس کا نام تو ایزی لوڈ ہے لیکن حقیقتاً یہ نام کے بالکل برعکس ہے۔ یعنی Difficult Load۔ ویسے تو یہ ہر ایک کے لئے مشکل لوڈ ہی ہے کیونکہ کھائے پئے بغیر تو گزارا ممکن ہے مگر لوڈ کرائے بغیر نہیں۔ کن جتنا بھی لوڈ کرا لو یہ ہی نہیں چلتا کہ کدھر گیا۔ خصوصاً آپ کا فون بچوں یا عورتوں کے ہاتھ لگ جائے تو بچے تو میسج بھیجنے کے دوران غلط بٹن دبا کر میسج اور فون کر بیٹھتے ہیں اور ہیکسج ٹھکانے لگ جاتا ہے اوپر سے کمپنیوں کے عجیب و غریب

سوت کا زائقہ سب کو چکھتا ہے لیکن زندگی کا زائقہ کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔

فروغ ملا ہے۔

پاس بھی آپ کو لوڈ مل جائے گا۔ اس سے اس کی کچھت کا اندازہ لگا لیں۔ ایسی جگہ جہاں آپ کو ضرورت کی کوئی چیز بھی نہ ملے ایزی لوڈ آپ کو وہاں بھی مل جائے گا۔

میں ایک حمام میں گیا تو وہاں بھی ایزی لوڈ کی سہولت موجود تھی اور حمام والے کا موقف تھا کہ اس سے اپنی کال کا خرچہ نکل آتا ہے کیونکہ اس میں منافع بے حد کم ہے یعنی صرف ڈھائی فیصد۔ بعض دکاندار اس کا علاج یہ کرتے ہیں کہ لوڈ کرتے ہوئے ایک روپے کی کوئی مزید کٹے ہیں گا ہب بے چارے کیا کریں کہ اس کے بیلنس سے جا میں فیصد تو پہلے ہی حکومت کاٹ لیتی ہے۔ کچھ ہند سے ایسے ہیں جن کی آواز ملتی جلتی ہے اس لئے ایک دوسرے کی جگہ کھسک جاتے ہیں اور لوڈ غلط ہو جاتا ہے جسے 9 اور 2 یا بعض اوقات نمبر لکھتے وقت عدد آگے پیچھے ہو جاتے ہیں جیسے 5829 کی جگہ 2958 اس طرح بھی ہوتا ہے بعض ان پڑھ لوڈ کرائے آتے ہیں تو ان کو اپنی سم کا نمبر تک معلوم نہیں ہوتا لہذا اب کمپنیوں نے ایک کمانڈر دے دی ہے جسے ملا کر آپ اس سم کا نمبر معلوم کر سکتے ہیں ایسے شہنشاہ بھی ہوتے ہیں جو سم لے کر آ جاتے ہیں کہ اسے اپنے کسی فون میں ڈال کر نمبر معلوم کر لیں اور تلاش کر دیں۔ بعض لوگ احتیاط سے نمبر نکھواتے یا چیک نہیں کرتے تو لوڈ کسی غلط نمبر پر چلا جاتا ہے اور گا ہب دکاندار کے گلے پڑ جاتا ہے۔ پہلے تو اس کا کوئی حل نہ تھا مگر اب غلط لوڈ کی واہسی کا سسٹم بن گیا ہے مگر اس میں سے بھی گورنمنٹ کا کاٹا ہوا ٹیکس اور جو بیلنس خرچ ہو چکا ہو وہ واپس نہیں ملتا۔ بعض لائبرے مو بائل کمپنیوں کے نمائندوں کی مخصوص آواز میں فون یا ایس ایم ایس کر کے لاکھوں کے انعام کی خوشخبری سناتے ہیں اور فریب دے کر اس سے ہزاروں کا بیلنس منگوا لیتے ہیں۔



البتہ ایک طبقے کے لئے یہ لوڈ ایزی ہی نہیں بلکہ نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئی ہے وہ ہے نوجوان لڑکیوں کا طبقہ۔ جن کو ذرا سا اشارے پر ان کے کرم فرما لوڈ کی بھرمار کئے رکھتے ہیں اور وہ اس سے ان کو صرف مس کال دیتی ہیں جب موقع ہو اور کال وہ بے چارے خود ہی کرتے ہیں دراصل یہ معاوضہ ہوتا ہے کال سننے اور میٹھی میٹھی باتیں کرنے کا۔ ابی اس بیلنس کو وہ ذاتی استعمال میں لاتی ہیں۔ نوجوان لڑکیوں کی اس کمزوری کا فائدہ بعض شاطر لوگ بھی اٹھاتے ہیں جو لڑکیاں بن کر ان سے لوڈ اٹھاتے ہیں اس کے لئے وہ زیادہ تر قشنگ یا آواز بدل کر کال کا استعمال کرتے ہیں۔ ماضی میں کچھ ایسے بہت بھی آئے تھے جن میں ایسے لوگوں کی سہولت کے لئے دھڑلے پیکر (آواز بدلنے والا) بھی لگا ہوتا تھا جس سے اپنی آواز کو اپنی مرضی سے بچے بوڑھے جوان اور عورت کی آواز میں بھی بدلا جاسکتا تھا۔ ایسے لوگ اپنے شکاروں کو اچھی طرح لوٹ کر سم بند کر دیتے ہیں خصوصاً جب عشاق کی طرف سے ملاقات کا تقاضا بڑھ جاتا ہے یا ان کو کوئی شک شبہ ہو جاتا اور یوں بے چارے عاشقان نامراد ہاتھ ملتے رہ جاتے ہیں اور یہ ہزاروں کا لوڈ ان کے لئے بچھت و ابن کر رہ جاتا ہے۔

آپ سمجھ رہے ہوں گے کہ لوڈ صرف کرائے والوں کے لئے ہی پریشانی کا باعث ہے تو ایسا نہیں ہے یہ کرنے والوں کے لئے بھی عجیب پریشانیوں کا باعث ہے، میری مراد لوڈ کرنے والے دکانداروں سے ہے۔ یوں تو یہ اتنا چالو کار و بار ہے کہ صرف کرپا نہ اور جنرل منو۔ پر ہی نہیں بلکہ سبزی فروشوں اور ریڑھی والوں کے

نیر زینداں

رزاق شاہد کوہل

اس کی وہ قسم تو پوری نہیں ہو سکی کہ اس کی عمر اب ساٹھ سے تجاوز کر گئی ہے۔ البتہ اپنے بیٹے کے لیے جو ابھی تک جوان نہیں ہوا، اس نے سارہ کواغوا کر لیا ہے اور جیسے ہی وہ جوان ہوگا مہدیارخان اپنی قسم پوری کرے گا۔

نیر قسط

موسم سے پتھر بن جانے والے ایک شریف انفس قبائلی نو جوان کی سسنی خیر سرگزشت۔



رش ڈرائیو کرتے ہوئے عدنان نے آدھ گھنٹے میں ہاسپٹل کی پارکنگ میں کار روک دی تھی۔ پرائیویٹ ہاسپٹل کے مستعد عملے نے پروفیسر کو سٹریچر پر منتقل کر کے ایمرجنسی وارڈ کا رخ کیا۔ وہ دونوں بھی ان کے ساتھ بھاگتے ہوئے چلتے رہے۔ ایمرجنسی وارڈ میں موجود ڈاکٹر نے پروفیسر کی حالت دیکھتے ہی اسے آئی سی یو میں پہنچانے کا حکم دیا۔ انہیں آئی سی یو میں داخل نہیں ہونے دیا گیا تھا۔ وہ دونوں پریشانی کے عالم میں دروازے کے سامنے ٹھہرنے لگے۔

عائشہ! بیٹھ جاؤ..... اس طرز پریشان ہونے سے مسائل حل نہیں ہوا کرتے؟“ عدنان نے گفتگو میں پہل کی۔

”عدی! اگر پاپا کو کچھ ہو گیا تو میں زندہ نہیں رہ پاؤں گی؟“

”پاگل مت بنو.....“ عدی نے اسے ڈانٹا۔ ”کچھ نہیں ہوگا سر کو.....“

”عدی مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“

”اللہ پاک آسانی فرمائے گا.....“ عدنان نے اسے تسلی دی۔

جب تک آئی سی یو کا دروازہ کھول کر ڈاکٹر باہر نہ نکلا وہ اسی طرح کارڈر میں ٹھہرتے رہے۔ جیسے ہی ڈاکٹر باہر آیا وہ دونوں اس کی طرف لپکے۔

”الحمد للہ..... وہ بہتر ہیں، فی الحال سکون آور دوا کے زیر اثر سو رہے ہیں، آپ انہیں دیکھ سکتے ہیں اور ہاں، اگر وہ ہوش میں آجائیں تو زیادہ بات چیت نہ کرنا۔“ ڈاکٹر نے ایک لحوہ رک کر مختصر الفاظ میں مریض کی حالت سے آگاہ کرتے ہوئے ہدایت جاری کی اور آگے بڑھ گیا۔

وہ دونوں اندر داخل ہو گئے۔ پروفیسر سینے تک کبل اوڑھے وہ چٹ لینا تھا۔ اس کے چہرے پر پھیلا سکون

عائشہ کو اس گھر کے دروازے پر ڈراپ کرتے ہوئے عدنان آگے بڑھ گیا جبکہ وہ دروازہ کھول کر گھر میں داخل ہوئی۔

”کہاں سر مرنی ہو فاطمہ؟“ گھر میں سمیتے ہی اس کے کانوں میں باپ کی اذیت سے پر آواز گونجی۔ اور وہ بھاگتے ہوئے باپ کی خواب گاہ کی طرف بڑھی۔ خواب گاہ میں داخل ہوتے ہی اس نے دیکھا کہ والد بستر پر چڑا ترپ رہا تھا۔

”پاپا!“ وہ چیختی ہوئی آگے بڑھی۔ اسی اثناء میں پروفیسر نے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیئے تھے۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ یقیناً فاطمہ گھر میں موجود نہیں تھا ورنہ پروفیسر کے پکارنے کی آواز ضرور سن لیتی۔

والد کو بے ہوش دیکھ کر اس کے ہاتھ پاؤں پھول چکے تھے۔ اس کے دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا، اچانک اس کے دماغ میں عدنان کا نام گونجا اور وہ جلدی سے سیل فون نکال کر اسے کال کرنے لگی۔

”جی محترمہ!“ اس نے کال اینڈ کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ ”ابھی تو آپ کو.....“

”عدی! جلدی آؤ، پاپا بے ہوش ہو گئے ہیں؟“ وہ قطع کلائی کرتے ہوئے چیختی۔

”کیوں..... کیسے؟“ وہ حیران رہ گیا تھا۔

”پتا نہیں..... شاید، ہارٹ ایٹک ہوا ہے۔“

”پریشان نہ ہونا، میں کس دمانٹ میں پہنچ گیا۔“

یوٹرن سے کار موڑتے ہوئے اس نے سپید بڑھادی۔

عائشہ نے باپ کو صحیح طریقے سے لٹایا اور بھاگتے ہوئے باہر نکل۔ گھر کا دروازہ کھول کر وہ وہیں بے چینی عدنان کا انتظار کرنے لگی۔

عدنان نے وہاں پہنچنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ پروفیسر کو کار کی کچلی نشست پر منتقل کر کے ہاسپٹل کا رخ کر رہے تھے۔

مکھریا بھی نہیں تھا، جو اپنے چچا کے گھر رہائش پذیر تھا۔ لیکن کہتے ہیں کہ محبت ذات پات نہیں دیکھتی، وہ دونوں بھی ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو گئے۔ ان کے چھپ چھپ کر ملنے کی خبر زیادہ عرصہ راز نہ رہ سکی اور ایک دن اس کے بھائیوں کو معلوم ہو گیا۔ چودھری خاندان کے سپوت کہاں یہ برداشت کر سکتے تھے کہ ان کی بہن ایک عام سے جوان کی محبت میں گرفتار ہو۔ انہوں نے ایک دن اس جوان کو پکڑ کر سرعام سزا دی اور اپنی بہن کو چھوٹنے کی باتوں میں اس کے دونوں بازو کہنیوں سے توڑ دیے اور بے ہوش کر کے چوراہے میں پھینکوا دیا۔ چودھریوں کے وہاں سے ہٹنے ہی اس جوان کا چچا اسے زخمی حالت میں اپنے علاقے سے راولپنڈی لے آیا۔ یہاں علاج معالجے کے بعد وہ جوان چوری دل جی سے تعلیم کے حصول کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اچھی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ پروفیسر بن گیا پھر اس نے شادی کر لی اور بھول کر بھی اپنے علاقے کا رخ نہ کیا۔ اس بات کو اتنا غصہ مزمزم کیا ہے کہ اس کی بیٹی بھی جوان ہو گئی ہے مگر آج تک اس کے دل سے چودھری ذات کی نفرت اور پیار محبت کی کراہت ختم نہیں ہو سکی۔

”اور وہ جس میرے پاپا ہیں..... ہے نا؟“

عدنان نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ مستفسر ہوئی۔ ”آپ کو یہ سب کیسے پتا چلا؟“

”کیونکہ..... حیدر علی میرے دادا تھے اور آپ کے

پاپا کے بازو توڑنے والے میرے چچا قربان حیدر اور والد

فرمان حیدر صاحب تھے۔“

”گویا آپ پہلے سے ساری کہانی جانتے ہیں؟“

”بالکل.....“

مطلب آپ نے پاپا سے جان بوجھ کر اس طرح

بحث کی، انہیں چھیڑا..... بلکہ میں یہ کہوں کہ جی ٹار چر کیا

تو غلط نہیں ہوگا؟“

اس کی بہتر حالت کا پتا دے رہا تھا۔ وہ وہیں سونے پر بیٹھ گئے۔

عائکہ بولی۔ ”عدی! اب اگر آپ جانا چاہیں تو جا

سکتے ہیں، مجھے تو شاید ساری رات جاگنا پڑے، کیونکہ

جب تک پاپا اٹھ نہیں جاتے میں نہیں سو سکتی گی۔“

”نہیں میں بھی نہیں اکیلا چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔“

وہ مسکرائی۔ ”میں ہنگی تھوڑی ہوں کہ اکیلے میں ڈر

جاؤں گی۔“

”عورت ذات تو ہوتا؟“

”عدی! قسم سے ابھی تک میرا دل لرز رہا ہے کہ اگر

پاپا کو کچھ ہو جاتا تو میں تو بالکل اکیلی رہ جاتی۔“

”کیوں! میں مر گیا تھا کیا؟“ عدنان ایک دم

جذبائی ہو گیا تھا۔

”عدی! کسی دوست کے سہارے زندگی نہیں

گزاری جاسکتی۔“ عائکہ کے لہجے میں دوپہر کی آفتاب کا اثر

موجود تھا۔

”عائکہ! جانتی ہو تمہارے پاپا محبت کے نام سے

کیوں الرجک ہیں اور چودھریوں سے کیوں نفرت کرتے

ہیں؟“ عدنان نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”اس بارے ہم

دن کو تفصیلی بات چیت کر چکے ہیں۔“

”مجھے پتا ہے؟“ اس نے تامل لہجے میں انکشاف

کیا۔

وہ حیرانی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”عدی! بھارتی نہ ڈالو؟“

وہ سوچ میں ڈوبے لہجے میں بولا۔ ”اس کا نام

صالح تھا۔ چودھری حیدر علی کی لاڈلی بیٹی، دو بھائیوں کی

اکلوتی بہن، ناز و نعم میں پلی ہوئی، اس کی کسی بات کو بھی

رو نہیں کیا گیا تھا، مگر پھر اس کی بد قسمتی کہ وہ ایک عام سے

جوان کی محبت میں گرفتار ہو گئی، ایک ایسا جوان جس کا اپنا

بھولی بھالی چودھرائن نہیں جانتی تھی کہ اس کا چاہنے والا کہاں چلا گیا۔ اگر پروفیسر نے کسی کے ہاتھ پیغام ہی بھجوا دیا ہوتا تو شاید وہ ساری زندگی اس کی راہ گئی رہتی مگر ایک غریب محبت کے دعوے دار مرد سے اتنا بھی نہ ہوسکا، بس اس نے صرف اتنا کیا کہ محبت اور اپنی محبوبہ کی قوم سے نفرت شروع کر دی۔ تمہارا پاپا نے کبھی محبت کی ہی نہیں تھی۔ بس وہ تم تھا کہ اسے محبت ہے۔

”نہیں بیٹا! میں بزدل تھا۔“ وہ دونوں پروفیسر کی آواز سن کر اچھل پڑے تھے۔ وہ جانے کب سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔

”پاپا! عاتکہ دوڑ کر اس سے لپٹ گئی تھی۔“
”پاپا کی جان! پروفیسر اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

”پاپا! اب کیسا محسوس ہو رہا ہے؟“
”الحمد للہ اچھا ہوں۔“ عاتکہ کو کہہ کر وہ عدنان سے مخاطب ہوا۔

”عدنان بیٹا! تم میرے گلے نہیں لگو گے؟“
”ڈرتا ہوں سر!“

”بیٹا! مجھے اپنی غلطی تسلیم ہے۔ میں تو آج تک یہی سمجھتا رہا کہ میرے ساتھ ظلم ہوا، میں نے تو تجہائی میں بھی صالحو کو بے گناہ چھوڑ دیا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا۔“ یہ کہتے ہی پروفیسر کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔

عدنان بھی آگے بڑھ کر پروفیسر سے لپٹ گیا۔

”مجھے معاف کرو بیٹا! انجانے میں، میں بہت بڑی غلطی کر بیٹھا ہوں۔ بھائیوں کی زیادتی کا بدلہ ان کی بہن سے لیتا رہا، جو، ان سے زیادہ میری اپنی تھی۔“
حقائق کی چکا چوند نے پروفیسر کا دل غم سے لبریز کر دیا تھا۔

”نہیں سر! آپ اکیلے قصور وار نہیں ہیں۔ ابو جان اور چچا جان بھی اس جرم میں برابر کے شریک ہیں۔“

”یہ بھی صحیح ہے۔“ عدنان سنجیدہ ہو گیا تھا۔
عاتکہ ہونٹ چباتے ہوئے بولی۔ ”پاپا! کی چودھریوں سے نفرت بلا وجہ نہیں ہے؟“
”بھلا وہ کیسے؟“

”جب پاپا کے بازو توڑے گئے، انہیں زرد کو ب کیا گیا، اس وقت محبت کے وعدے کرنے والی چودھرائی کہاں تھی؟ اب آپ کہیں گے کہ وہ عورت ذات تھی اور کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ کیا بعد میں بھی پاپا سے رابطہ کر کے انہیں تسلی نہیں دے سکتی تھی۔ ان کی ہمت نہیں بندھا سکتی تھی، مگر کیسے؟ ایک چودھرائن کو کیا فرق پڑتا تھا؟ برباد تو کسی غریب کی زندگی ہو رہی تھی نا؟ امیروں کا کیا؟ تو نہ سکی اور سکی اور نہیں اور کی؟“

”ہونہ! لگتا یہی ہے کہ پروفیسر صاحب ہیرو ہیں۔“ عدنان کے لہجے میں شامل طنز عاتکہ کو چونکا گیا۔

”اس میں شبہ ہی کیا ہے؟“
”صرف مجھے نہیں۔ شاید پروفیسر صاحب کو بھی شبہ ہو؟“

”ہاں آپ! کہہ سکتے ہیں؟“
”عاتکہ! آپ نے ابھی تک صرف پروفیسر صاحب کی کہاں سنی ہے۔ صالحو بوا کے بارے میں تو میں نے بتایا ہی نہیں۔“

”تو اب بتا دیں؟“ اب طنز کرنے کی باری عاتکہ کی تھی۔

”وہ بمشکل ایک سال جی پائی اور اپنے محبوب کے دکھ میں محل مکمل کر گئی۔ وہ چودھرائن اس غریب محبوب سے چھڑنے کے بعد نہ تو کبھی ہنس پائی اور نہ خوش ہو مانی تو ہیر و کون ہوا؟“

”عدی! عاتکہ سک کر رہ گئی تھی۔

”ہاں عاتکہ! پروفیسر نے ایک چودھرائن کو دھوکا دیا۔ اسے سکھتا، بلکتا، روتا، روگوں کے حوالے کر گیا، وہ

ای جان نے مجھے تاکید کی تھی کہ پروفیسر کی بیٹی کو اپنی دلہن بناؤں مگر..... میں نے تمہاری جانب قدم بدل لینے کے لیے بڑھائے تھے۔ یہ علیحدہ بات کہ خود بھی تمہاری محبت میں گرفتار ہو گیا۔

”بہت برے ہو تم؟“ عاتکہ دکھ بھری آواز میں بولی۔

”عاتکہ سیانے کہتے ہیں..... جیسا کرو گے ویسا بھرے گے اور یہ کہ تمہارے گناہوں کی فصل شاید تمہاری اولاد کو کاٹی پڑے۔“

”پاپا کا کہنا اتنا بڑا نہیں تھا۔ تمہارے چچا اور والد صاحب نے بھی تو زیادتی کی۔ وہ آپ کو نظر نہیں آئی؟“

”نظر تو آئی تھی مگر اس میں میری پھوپھو کا قصور تو نہیں تھا۔ میرے چچا اور والد کی سراسر میری معصوم پھوپھو کو ملی آ کر کیوں؟“

”تم بھی تو یہی کر رہے تھے۔ پاپا کا بدلا مجھ سے لے رہے تھے۔“

”کیا تو نہیں تا؟ اور ای جان نے بھی یہی کہا تھا کہ تمہیں ان کی بہو بناؤں۔ مجھے تو بس غصہ آیا ہوا تھا اور ویسے بھی جب سے تمہیں دیکھا ہے میرا دل بدل لینے اور تمہیں اپنانے کے فیصلے کے درمیان انکا ہوا تھا۔ یوں بھی اگر بدل لیتا ہوتا تو پیسے دن سے تم پر اپنی محبت ظاہر کر دیتا، یقین مانو عاتکہ گزشتہ رات تک میں کسی فیصلے پر نہیں پہنچا تھا۔ یہ تو بس تمہارے والد کے اعتراف جرم نے میری مدد کی اور میں نے موت کے بجائے زندگی کو ترجیح دی۔ حالانکہ ای جان کب سے زور دے رہی ہیں کہ تمہیں بیاہ کر گھر لے آؤں کیونکہ انہوں نے میرے ذمہ ایک ضروری کام لگاتا ہے۔“

”موت؟ زندگی؟“

”ہاں عاتکہ! اگر میں تم سے دور چلا جاتا تو یقیناً جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا اور پھر ای جان کا دوسرا کام

”بیٹا! میں صالحہ کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا ازالہ تو نہیں کر سکتا۔ ہاں یہ وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے اور عاتکہ کے بچ دیوار نہیں بنوں گا۔“

صالحہ نے باپ کی چھاتی سے سر اٹھا کر عدنان کی طرف دیکھا اس کے دماغ میں ایک بار پھر دوپہر کے ٹائم ہونے والی گفتگو تازہ ہونے لگی۔ اس وقت عدنان نے بڑی سختی سے اس کی پیش قدمی ٹھکرا دی تھی۔ مگر اس وقت وہ مستحضر رہ گئی جب اس نے عدنان کا پر احساں لہجہ سنا۔

”جی سر! عاتکہ ہے بھی ہماری امانت، اور اسی امانت کے حصول کے لیے میں نے اس یونیورسٹی میں داخلہ لیا کہ جس میں آپ پڑھاتے ہیں۔“ اس کا دل خوشگوار انداز میں دھڑکنے لگا تھا۔

☆☆☆

تنہائی ملنے پر اس نے سب سے پہلے عدنان سے یہی سوال کیا تھا۔

”کیوں جناب! کل دوپہر کو تو محبت کے نام پر بہت بے جا ہورہے تھے؟“

”کیونکہ میں چاہتا تھا کہ یہ ساری کہانی تمہیں“ سر کی زبانی سننے کو ملے۔ اسی لیے بار بار زور دے رہا تھا کہ اپنے پاپا سے پوچھو کہ وہ محبت اور چودھریوں سے کیوں نفرت کرتے ہیں؟“

”اگر آپ مجھے پہلے یہ ساری کہانی بتا دیتے تو کیا فرق پڑتا؟“

”بہت فرق پڑتا۔“

”بھلا کیسے؟“

”کیونکہ، میرا ارادہ تھا کہ پروفیسر کو بھی وہی دکھ دوں گا جس کا شکار میری پھوپھو جان ہوئی تھیں۔“

”عدنان! عاتکہ کے منہ سے حیرت آمیز آواز نکلی۔

”کیا کہہ رہے ہو؟“

وہ اطمینان سے بولا۔ ”صحیح کہہ رہا ہوں۔ میری

دوران ہم نے دو تین دفعہ چائے بھی پی تھی اور گاہے گاہے فریش ہونے کے لیے واش روم تک بھی گئے تھے، مگر کہانی کا تسلسل برقرار رکھنے کے لیے مجھے یہ ذکر حذف کرنا پڑا۔

ڈنر میں داؤد خان نے بہت زیادہ تکلف سے کام لیا تھا۔ مجھے اپنی گزشتہ رات یاد آگئی جب مجھے پیٹ بھر کر کھانا بھی میسر نہیں ہوا تھا۔ اور پھر رات جس طرح سردی میں ٹھہرتے گزری تھی وہ ایک علیحدہ اذیت تھی۔ پر تکلف ڈنر کے بعد ایک شریف صورت ملازم نے ایک آرام دہ خواب گاہ کی طرف رہنمائی کی۔ مجھے اغواء کر کے قید کرنے والے دونوں آدمیوں کو شاید داؤد خان نے کہیں بھیج دیا تھا کہ وہ مجھے دوبارہ نظر نہیں آئے تھے۔ میرا سارا سامان مجھے واپس مل گیا تھا اور سونے سے پہلے میں ارشد کو کال کرنا نہیں بھولا تھا۔ وہ بہت تخلص اور پیارا دوست تھا۔ ناراض ہونے کے باوجود اس نے مجھے شکوک میں قائم شائع کرنے کی کوشش نہیں کی اور براہ راست اصل بات پر آگیا تھا۔ وہ گزشتہ رات بھی مجھے کال کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا مگر میرا موبائل آف ہوئے کی وجہ سے ناکام رہا تھا۔ اور اب وہ بے چینی سے ساری تفصیل سننے کے لیے بے تاب تھا۔

میں نے مختصر الفاظ میں اسے ساری سنائی اور آرام کرنے کے لیے لیٹ گیا۔ حسب سابق وہ رات کو پھر میرے خواب میں آئی۔ اسی طرح اداس، دکھی اور خفا خفا۔ جب سے صد خان کے ہاتھوں میری عزت کا جنازہ اٹھا تھا وہ میرے خواب میں خفا خفا دیکھائی دیتی تھی۔ پہلے چند دن تو اس کی آنکھوں میں حقارت بھی ہوا کرتی مگر اب اس حقارت کی جگہ غمگینی نے لے لی تھی۔ بہت زیادہ سوچنے اور سرکھپانے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ کسی نہ کسی طرح اس کا تعلق صد خان سے ضرور تھا اور یہ تعلق بھی دشمنی کا تھا ورنہ دوستی کا ہوتا تو وہ کبھی میرے چوڑیاں پہننے کے عمل سے خفا نہ ہوتی، بہر حال کچھ بھی تھا اب اس کی

درمیان میں تیار رہ جاتا۔

”عدی!“ عاتکہ نے بے ساختہ اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ ”آئی لو یو سوچ“۔

”می ٹو..... جان“۔ عدنان کے لہجے میں محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

”دوسرا کون سا کام آنٹی نے آپ کے ذمہ لگاتا ہے؟“

”یہ تو اللہ پاک کو یا پھر خود ای جان کو معلوم ہے۔“

عدنان آسمان کی طرف نظر اٹھا کر بولا۔ اور عاتکہ ہنسنے لگی۔

☆☆☆☆

اس ساری کہانی میں میرا تو کوئی ذکر ہی نہیں آیا؟“

عدنان کے خاموش ہوتے ہی میں نے بے ساختہ پوچھا۔

عدنان مسکرایا۔ ”کہانی ختم کہاں ہوتی ہے جتنا ب“۔

”تمہاری اور عاتکہ کی شادی ہوگئی۔ تمہارے والد اور چچا نے پروفیسر سے معافی مانگ لی ہوگی اور کیا باقی بچا؟“

”ابھی تک میرا قصہ باقی ہے نامحترم؟“ داؤد خان نے لقمہ دیا۔

”دیکھو بھائی! آپ دونوں کی کہانیاں دل چسپ ہونے کے باوجود مجھے اکٹھا رہی ہیں۔ براہ مہربانی پہلے مجھے کھانے کو کچھ دیں۔ مجھے سخت بھوک محسوس ہو رہی ہے اس کے بعد میں کچھ سننے بھنے کے قابل ہوں گا۔“

داؤد خان مسکرایا۔ ”ہاں بھی واقعی ہم نے آپ کا کافی ٹائم لے لیا ہے۔ باقی کی گپ شپ کل ہوگی۔ فی الحال کھانا کھائیں گے، اس کے بعد آپ آرام کرنا۔ انشاء اللہ زندگی رسی تو صبح بات کریں گے۔“

میں نے وال کھاک کی طرف نگاہ دوڑائی شام کے چھ بجنے والے تھے۔ بہت لمبی نشست ہو چکی تھی، گو اس

رات کو تو نہیں بتائی تھی؟“
 ”رات کو تو بس مختصری بات چیت ہوئی تھی تفصیلی بات چیت تو انشاء اللہ ملاقات ہونے پہ ہوگی۔“
 ”مجھے یقین نہیں آ رہا کہ میں اسی شیردل خان سے بات کر رہا ہوں کہ جس کی چھاتی میں بکری کا دل دھڑکتا تھا۔“

”ہاں دوست! کیونکہ مجھے معلوم ہو گیا ہے، کہ امن کے لیے جنگ لازم ہے۔“ میں پر اعتماد لہجے میں بولا۔ ”جب تک آپ دشمن کو یہ باور نہیں کرا دیتے کہ آپ اینٹ کا جواب پتھر سے نہیں تو اینٹ سے تو دے ہی دیں گے، وہ آپ پر حاوی رہے گا اور تنگ کرنے کا کوئی موقع جانے نہیں دے گا، اس کی زد و مثال میں خود ہوں، صمد یار خان کی بے عزتی بابا جان اور مہر دل نے کی مگر صمد یار خان ان کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔ جبکہ میں اس کے قدموں میں جھک گیا مگر اس نے مجھے معاف کرنے کے بجائے مجھے اپنی نظروں میں مگر نے پر مجبور کر دیا۔ اور یقین کرنا جب اسے یقین ہو گیا تھا کہ ان کموں میں تیل نہیں ہے مگر وہ مجھے اس حد تک آگیا تھا۔“

”شیردل! مجھے غر ہے تم پر۔“
 ”اور مجھے تمہاری دوستی پر۔“ یہ الفاظ میرے منہ میں تھے کہ دروازے پر دھچک دے کر داؤد خان کا ملازم اندر داخل ہو کر سوڈ بانہ بٹے میں بولا۔
 ”خان جی! صاحب کہہ رہے ہیں کہ فارغ ہو کر تشریف لے آئیں۔ عدنان صاحب بھی پہنچ گئے ہیں۔“
 ”ٹھیک ہے۔“ اسے کہہ کر میں نے ارشد کو کہا۔
 ”اچھا یار! انشاء اللہ بعد میں بات ہوگی۔ فی الوقت تو میرا بلاوا آگیا ہے۔“

”اوکے۔۔۔۔۔“ کہہ کر اس نے رابطہ منقطع کر دیا اور میں بستر چھوڑ کر ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔ وہ دونوں میرے منتظر تھے۔

حقیقت سے پردہ اٹھنے والا تھا۔ نہ جانے یہ جان کاری مجھے افسردہ کرنے والی تھی یا خوش؟ اس حقیقت سے صرف اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکات ہی واقف تھی۔
 صبح فریش ہونے کے بعد میں نے پر کلف ناشتا کیا اور پھر ارشد کو کال کرنے لگا۔
 ”جی جناب!“ موبائل فون کے پیکر سے اس کی چپکتی آواز میرے کانوں میں گونجی۔

”ناشتا کر لیا ہے اور قصہ گو صاحبان کا منتظر ہوں۔“
 ”خیال رکھنا۔ یہ نہ ہو قربانی کے بکرے کی طرح کھکا پلا کر تجھے قربان کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔“
 ”نہیں یار! دونوں بہت تخلص دکھائی دیتے ہیں۔“
 ”کبھی کبھی بھیڑ کے روپ میں بھیڑیے بھی چھپے ہوتے ہیں؟“

”ابھی مجھ میں بھیڑیوں کا سامنا کرنے کا حوصلہ آ گیا ہے دوست!“
 ”کیا؟“ ارشد کی آواز میں تحیر تھا۔

”ہاں ارشد! میرا مسئلہ نفسیاتی سا تھا۔ خود کو امن پسند سمجھ کر اپنی زندگی پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتا رہتا۔ صمد یار خان نے میری عزت نفس جس طرح بحال کی وہ میری انا، خوداری اور روس پرستانہ کی طرح گلی، پھر ابو جان اور مہر دل خان کا حقارت امیر سلوک، تمہارے طعنے اور سب سے بڑھ کر خوابوں والی کی نقی مجھے معلوم ہی نہ ہوا کہ کیسے میرے اندر نامحسوس سی تبدیلی آنے لگی اور پھر پرسوں جب داؤد خان کے آدمی نے مجھے باپ کی کالی بکی تو یہ لاوا ایک دم پھٹ پڑا اور میں نے سچ کچ اس کا گلا دبا دیا اور سینک سے میری کاپی پلٹ گئی۔“

”کیا کیا کیا۔۔۔۔۔ تو نے ایک آدمی کا گلا دبا کر اسے جان سے مار دیا۔“ ارشد کے لہجے سے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ بے ہوش ہونے کے قریب ہے۔ ”یہ بات تو نے مجھے

کل یہ جان کر ہسپتال پہنچ گئی تھی۔

”ہاں یاد ہے لالا!“ میں نے کہا اور داؤد خان کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ یہ خوشی میرے لالا کہنے سے اس کے چہرے پر ظاہر ہوئی تھی۔

”بس اس کے بعد مختصر آبیہ سمجھ لو کہ صمد یار خان جسے چچا کہتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے۔ زیادہ دن گل رخ اور میرے بابا جان احمد یار خان کا تعلق برداشت نہ کر سکا اور گل رخ کی ماں کو تنگ کرنا شروع کر دیا، کہ گل رخ کی شادی اس کے ساتھ کر دی جائے ورنہ وہ اسے اغواء کر کے لے جائے گا۔ دوسری جانب گل رخ نے ساری بات میرے بابا جان کو بتا دی تھی لیکن اس سے پہلے کہ بابا جان، صمد یار خان کے خلاف کوئی کارروائی کرتا وہ پہل کر گیا اور ایک رات خالہ کے گھر کھس گیا۔ اس کا ارادہ گل رخ کو زبردستی وہاں سے لے جانے کا تھا، زرینہ خالہ اسے ایسا کرنے کی اجازت بھلا کب دے سکتی تھی۔

وہ بے ساختہ صمد یار خان سے لپٹی اور میں کو بھاگ جانے کا کہا۔ گل رخ بھی صمد یار خان کے چہرے پر بھائے وحشت بھرے تاثرات دیکھ کر ڈر گئی تھی وہ گھر سے نکل کر بھائی جیکہ صمد یار خان اپنی خالہ سے الجھ گیا۔ زرینہ خالہ کسی آنکھوں کی طرح اس سے چٹ گئی تھی۔ صمد یار خان کا اس سے جان چھڑانا مشکل ہو گیا تھا۔ تنگ آ کر اس نے اپنی خالہ کے سر پر پستول کی ٹال رکھ کر بغیر کسی ہچکچاہٹ کے ٹریگر دبا دیا۔ اپنی جنونی محبت کی خاطر اس نے بھرے پرے خاندان کا صفایا کر دیا تھا۔

خالہ کے گرتے ہی وہ بھاگتے ہوئے باہر نکلا مگر گل رخ اسے نظر نہیں آئی تھی۔ اندھیرے کی وجہ سے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ سردیوں کی رات میں ہر کوئی منہ سرپیٹے سویا تھا۔ شاید وہ کسی کے گھر میں کھس گئی تھی۔ صمد یار خان وہاں سے غائب ہو گیا۔

گل رخ جیسے ہی گھر سے نکلی اس کے کانوں میں

”آئیں جی شیر دل خان!“ داؤد اپنی نشست سے اٹھتے ہوئے بولا۔ عدنان بھی میرے استقبال کے لیے کھڑا ہو گیا تھا۔

دونوں سے مصافحہ کر کے میں نے عدنان کے ساتھ نشست سنبھال لی۔ داؤد خان عمر میں ہم دونوں سے بڑا تھا۔ بلکہ مجھ سے تو عدنان بھی دو تین سال بڑا ہی ہو گا۔ بیٹھتے ساتھ داؤد خان نے پوچھا۔ ”چائے، قہو یا کافی؟“

میں ہنسا۔ ”ابھی تو ناشتا کیا ہے؟“

”بات چیت کے دوران کوئی نہ کوئی مشروب تو ہونا چاہیے نا؟“

”میرا خیال ہے چائے بہتر رہے گی۔ کیوں عدنان بھائی؟“

”صحیح کہا۔“ عدنان نے میری تائید کی اور داؤد خان ملازم کو چائے کا بتانے لگا۔

”داؤد بھائی! ایک درخواست ہے؟“ وہ جیسے ہی ملازم کو چائے کا بتا کر میری طرف متوجہ ہوا میں نے بے لنگھ سے کہا۔

”حکم کرو شیر دل!“

”بھئی آپ دونوں کی کہانی بہت دل چسپ اور پر تجسس ہے لیکن مجھ میں اپنے خوابوں میں آنے والی محترمہ کے بارے جاننے کے لیے بہت بے چمن ہوں۔ تو اس لیے پلیز اپنی کہانی کو مختصر کریں یا پہلے اس کے بارے میرا تجسس ختم کریں بعد میں اپنی کہانی سنا لیتا۔“ وہ مسکرایا۔ ”چلو جیسی تمہاری مرضی۔ میں آپ کو ابو جان اور اپنے چچا صمد یار خان کی ہونے والی کشمکش کے بارے بتا رہا تھا۔ صمد یار خان نے بڑی بے دردی سے گل رخ کے والد کو موت کے گھاٹ اتارا تھا اور اس بارے گل رخ کو سب معلوم ہو گیا تھا۔ کیونکہ اس کے باپ کی رائفل سے کوئی گولی فائر نہیں ہوئی تھی۔ گل رخ کی ماں زرینہ

”بیٹی! خدا کے لیے یہاں سے کہیں دور چلی جاؤ۔ اگر تم یہاں موجود رہیں تو دونوں بھائیوں میں سے کسی ایک کی جان چلی جائے گی۔ خدا ارکھیں دور چلی جاؤ۔ کسی دوسرے شہر میں چلی جاؤ۔ یہاں اب تیرا کون باقی ہے؟ یوں بھی صمد یار خان نہایت ضدی اور اکڑ ہے، یہ تیرا چچا نہیں چھوڑے گا چاہے اس کی جان چلی جائے۔ اس لیے خدا را یہاں سے چلی جاؤ۔ میرے جڑے ہاتھوں کا واسطہ، مجھ پر رحم کھاؤ۔“

گل رخ اپنی سگی خالہ کا یہ رویہ دیکھ کر سن رہی تھی۔ مگر بعد میں جب اس نے خود کو خالہ کی جگہ پر رکھ کر سوچا تو اسے ان کا رویہ اتنا عجیب نہ لگا۔ صمد یار خان سے از حد نفرت کرنے کے باوجود وہ اکیلی تھی اور اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔ خالہ ماں کی طرح ہی ہوتی ہے مگر اس کی خالہ نے بیٹے کی محبت میں بھائی کے حق سے آنکھیں پھیر لی تھیں۔ وہ دوبارہ اپنے گھر پہنچ گئی ماں کی آخری رسومات سے پہلے وہ گاؤں چھوڑ کر کہیں نہیں جاسکتی تھی۔

ادھر بابا جان جب خالہ کے گھر پہنچے تو وہاں صمد یار خان موجود نہیں تھا البتہ اس کی خالہ کی لاش پڑی تھی۔ گل رخ کی بات کی گواہی دے رہی تھی۔ خالہ کی لاش کو چار پائی پر لٹا کر اس نے لاش پر کپڑا ڈالا اور سیدھا تھانے پہنچ گیا۔ وہاں اس نے صمد یار خان کے خلاف خالہ کے قتل کی ایف آئی آر کرائی اور گھر پہنچ گیا۔ ماں نے بے ہوش صمد یار خان کو اپنی چار پائی کے نیچے لٹا کر چھپا دیا تھا۔ پاری خان نے ماں کو ساری صورت حال سے آگاہ کیا اور گل رخ کے بارے پوچھا تو دادی نے بیٹے سے جھوٹ کہہ دیا کہ وہ اپنی مرضی سے کہیں چلی گئی ہے۔ گو بابا جان کو حیرانی تو ہوئی مگر اس نے زیادہ استفسار نہ کیا اور ماں کو ساتھ لے کر واپس خالہ کے گھر پہنچ گیا۔ وہاں گل رخ موجود تھی اور اپنے ماں کے لاش کے ساتھ بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔ پولیس کے آنے تک سارا گاؤں وہاں اکٹھا

فار کی آواز گونجی اور اس کے ساتھ ہی اپنی ماں کی دل خراش چیلنے اس پر لرزہ طاری کر دیا تھا۔ وہ ننگے پاؤں گلی میں بھاگتی چلی گئی۔ رک کر کسی کا دروازہ کھٹکھٹانے میں یہ خطرہ تھا کہ شور کی آواز سن کر صمد یار خان وہاں پہنچ جاتا اور جو بندہ اپنی خالہ اور خالو کو بے دردی سے ٹھکانے لگا سکتا تھا وہ کسی دوسرے، تیسرے کا کیا لحاظ کرتا؟ بھاگتے بھاگتے بے اختیاری میں اس کا رخ بابا جان کے گھر کی طرف ہو گیا۔ بابا جان اس ٹائم اسے یوں ننگے پاؤں بغیر دوپٹے کے دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔

اور پھر گل رخ کی زبانی ساری بات سننے ہی بابا جان نے راتقل لے کر اپنی خالہ یعنی گل رخ کے گھر کا رخ کیا۔ مگر صمد یار خان وہاں تھوڑی موجود تھا۔ گل رخ کی بد قسمتی کہ وہ سیدھا اپنے گھر آیا اور گل رخ کو یہاں دیکھ کر اس کی مراد برآئی۔ وہ اپنی ماں کی موجودی کی پر ادہ کیے بغیر واشگاف الفاظ میں گل رخ کو کہنے لگا۔

”تم بھتا چاہو مگر بڑ کرلو۔ تمہیں دنیا کی کوئی طاقت جیتن مجھ سے نہیں سکتی؟ تم میری بیوی یا پھر میری بیٹی نہیں بنو گی۔“

گل رخ اس کے منہ پر تھوکتے ہوئے بولی۔
”مجھے کسی کتے کی بیوی بننا قبول ہے۔ تیری نہیں۔“

یہ بات صمد یار خان کو مشتعل کر گئی اور اس بد بخت نے اپنی ماں کا لحاظ رکھے بغیر گل رخ پر بھرمانہ حملہ کر دیا۔ اگر وہاں دادی جان موجود نہ ہوتیں تو وہ اپنے مذموم مقصد میں ضرور کامیاب ہو جاتا۔ مگر دادی جان پھان زادی تھیں، اپنی موجودی میں کیسے ایک محصوم لڑکی کی عزت لٹے دیکھ سکتی تھیں۔ اس نے کپڑے دھونے والا ڈنڈا اٹھا کر اتنی زور سے صمد یار خان کے سر میں مارا کہ وہ وہیں تیرا کر گر پڑا۔ اس کے گرتے ہی دادی نے گل رخ کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

میں رکھنا ایک سوالیہ نشان پیدا کر رہا تھا۔ جلد ہی صمد یار خان ضمانت پر رہا ہو گیا۔ گل رخ نے صاف طور پر میرے بابا جان سے کہہ دیا تھا کہ وہ صمد یار خان کی موت سے پہلے ان سے شادی نہیں کر سکتی۔

بابا جان اپنے چھوٹے بھائی سے بہت محبت کرتے تھے، گو صمد یار خان کی غلط حرکات کی وجہ سے وہ اس سے شدت سے بدظن ہو گئے تھے مگر اس کے باوجود وہ اسے قتل کرنے کی ہمت اپنے اندر مفقود پاتے تھے۔ گل رخ کی محبت اپنی جگہ، مگر بھائی کو کوئی مارنا اس کے لیے ناممکن تھا۔ البتہ قانون کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے بابا جان نے گل رخ کا ساتھ دیا۔ اسے امید تھی کہ وہ گل رخ کو انصاف دلانے میں کامیاب ہو جائیں گے مگر یہ ان کی بھول تھی۔ پاکستان میں نظام عدل سے انصاف کی توقع کرنا انگارے سے ٹھنڈک اٹانے کے مترادف ہے۔ یہاں پولیس سے لے کر وکیل، منصف، جج سب بکا و مال ہیں۔

ضمانت پر رہا ہونے کے اگلے دن صمد یار خان نے اپنے دو اوباش ساتھیوں کی مدد سے گل رخ کو اغوا کر لیا۔ وہ اسے ایک وین میں ڈال کر پشاور لے گیا۔ وہاں اسے اپنے دوست کے مکان میں بند کر کے واپس گاؤں پہنچا تا کہ اس کی پوزیشن صاف رہے، گو ہر کسی نے اسی پر شک کرنا تھا مگر اس بات کی اسے کوئی پروا نہیں تھی۔ شام تک وہ گھر میں رہا، رات ہوتے ہی واپس شہر لوٹ آیا اور جا کر گل رخ کو دھکانے لگا کہ اگر وہ اس کے ساتھ شادی نہیں کرے گی تو وہ اسے کوٹھے پر بٹھا دے گا اور اس سے پہلے وہاں جتنے بھی مرد ہیں تمام اسے جنسی تشدد کا نشانہ بنائیں گے، وغیرہ وغیرہ۔ گل رخ ڈر مگی، مگر اس کے باوجود وہ ہار ماننے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس نے ایک فیصلہ پر پہنچتے ہوئے اس نے چالپوسی سے کہا۔

”صمد یار خان! تم میرے والدین کے قاتل ہو،

ہو گیا تھا۔ بابا جان سب کو صمد یار خان کی کارستانی کے بارے بتاتے لگا۔ مگر اس وقت اس کی حیرانی کی انتہا نہ رہی جب اس کی ماں نے سختی سے اس کی مخالفت کی۔

”یاری خان! کیا بک رہا ہے، کیوں اپنے چھوٹے بھائی پر چھوٹے الزام دھر رہا ہے۔“

بابا جان نے حیرانی سے کہا۔ ”اماں! آپ کو تو سب پتا ہے کہ یہی بات ہے۔“

”مجھے کیسے پتا چلا؟“ دادی جان اپنے پیارے بیٹے کی جان بچانے کے لیے حجت بازی پر اتر آئی تھی۔ پولیس کے سامنے بھی اس نے بابا جان کے بیان کو سختی سے جھٹلادیا تھا۔ پولیس نے گل رخ سے بیان لیا اس نے زخمی نظروں سے خالہ کے بوڑھے جھریوں بھرے چہرے کی طرف دیکھا۔ صمد یار خان اس کے والدین کا قاتل تھا وہ اسے کیسے معاف کر سکتی تھی چاہئے کے باوجود وہ خالہ پر ترس نہ کھا سکی اور اس نے پولیس کے سامنے ساری کہانی بلا کم و کاست دہرا دی۔

جولہا اس کی خالہ نے پولیس کو یہ بیان دیا کہ جس وقت یہ واقعہ پیش آیا اس وقت صمد یار خان گھر میں موجود تھا۔ ان کا گھر اٹھو دھڑوں میں بٹ گیا تھا۔ ماں اور صمد یار خان ایک طرف اور بابا جان دوسری طرف۔ صمد یار خان کو جب ساری کہانی کا پتا چلا تو اس نے بھانجے کے بجائے گرفتاری دینے میں بہتری بھی۔ وہ اپنی خالہ خالو کے قتل سے بالکل کمر گیا تھا۔ کیس چلا مگر گل رخ کے پاس کوئی واضح شہادت موجود نہیں تھی۔

”اس کے باپ کی رائفل سے گولی نہیں چلی تھی۔“ یہ اتنی بڑی شہادت نہیں تھی کیونکہ رائفل کو لحد میں بھی صاف کیا جاسکتا تھا۔ اور پھر اس سے پہلے بھی اس رائفل سے کئی بار فائر ہو چکا تھا اگر وہ بالکل نئی رائفل ہوتی تب اس کی بات میں کچھ وزن ہوتا۔ سب سے بڑھ کر گل رخ اور اس کی ماں کا چاہر خان کی موت کو مصیبت راز

ہومیو پیتھی واحد طریقہ علاج ہے

جو

مرض کا علاج نہیں کرتا بلکہ مرض کی وجوہات کو ختم کرتا ہے۔ علامات کو وقتی طور پر دپاتا نہیں، مرض کو ہمیشہ کے لئے ختم کرتا ہے۔ ہومیو پیتھی واحد طریقہ شفا ہے۔ جو بتاتا ہے کہ جسمانی مرض کا باعث جسمانی ہے یا نفسیاتی، باعث جسمانی ہو یا نفسیاتی، ہومیو پیتھی کے سوا کوئی دوا کی مدد نہیں کر سکتا۔

کوئی مرض لا علاج نہیں

خواہ وہ کتنا ہی پرانا کیوں نہ ہو۔ عورتوں، مردوں اور بچوں کے تمام امراض جسمانی یا نفسی (نیروائک) اور جسمانی ہوئے امراض، معذور بچوں کے علاج کے لئے درست شفاء "حکایت" سے شروع کریں۔

رابطہ کے لئے

0321-7612717

0312-6625066

0323-4329344

ڈاکٹر ایم محمد اقبال
(نیروائک)

عارف محمود

بالمشافہ ملاقات کے لئے پہلے وقت لیں۔

دست شفاء حکایت 26 پیالہ گراؤنڈ لنک میٹروپولیٹن لاہور

قائد اعظم نے فرمایا

اے خادمان اسلام! اپنی ملت کو اقتصادی، سیاسی، تعلیمی اور معاشرتی تمام پہلوؤں سے منظم کرو، پھر تم دیکھو گے کہ تم یقیناً ایک ایسی قوت بن گئے ہو جس کا لوہا ہر شخص تسلیم کرے گا۔

(اجلاس مسلم لیگ لاہور-23 مارچ 1940ء)

بھاگ نکری ہوئی۔

اس دن بھی محمد یار خان اپنے گاؤں گیا ہوا تھا جہاں بابا جان پانچوں کی طرح گل رخ کو تلاش کرتا پھر رہا تھا، انہیں یقین تھا کہ گل رخ کی کم شدگی میں محمد یار خان کا ہاتھ ہے مگر اس کے پاس کوئی ثبوت موجود نہیں تھا۔ والہی پر جب محمد یار خان کے دوستوں نے اسے گل رخ کے بھاگ جانے کی خبر سنائی تو ایک مرتبہ وہ چلا گیا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ مگر ایسا ہو چکا تھا۔ اپنے دوستوں کو کھاتا وہ اسی ٹائم واپس گاؤں پہنچا کہ شاید وہ گاؤں پہنچ گئی ہو، مگر وہ اتنی بیوقوف نہیں تھی۔ گاؤں میں اس کا کوئی ایسا رشتہ دار موجود نہیں تھا جس پر وہ بھروسہ کر سکتی، سگی خالہ پہلے دن سے اپنے بیٹے کی سائیڈ لے رہی تھی، اور یاری خان بھی اپنے بھائی کے خلاف انتہائی قدم اٹھانے کے لیے تیار نہیں تھا، جبکہ پولیس یوں بھی بکا ڈال گئی۔

ماں باپ سے ہاتھ دھو بیٹھنے کے بعد محمد یار خان اس سے شادی کرنے کی تیاریوں میں تھا۔ یقیناً وہ جنونی اس کے پیچھے پڑا رہتا۔ ایسا دوسری تیسری بار ہو رہا تھا کہ وہ اس کے چنگل سے چھٹکارا پا رہی تھی، ایک مرتبہ اس کی ماں اسے بچاتے ہوئے قربان ہو گئی تھی دوسری مرتبہ اس کی خالہ نے اسے بچایا تھا اور تیسری مرتبہ وہ محمد یار خان کو پیار محبت کا لالچ دے کر بھاگ رہی تھی۔ چوتھی مرتبہ وہ اپنے مذموم مقصد میں کامیاب بھی ہو سکتا تھا۔ اور اسی ڈر

اگر تم اتنا بڑا قدم نہ اٹھاتے تو میں خود بھی تمہیں پسند کرتی تھی۔ تم نوجوان ہو؟ خوبصورت ہو؟ کسی چیز کی کمی نہیں ہے تم میں، پھر تم نے کیوں اتنا بڑا قدم اٹھایا؟“

”تم یاری خان کی طرف مائل تھیں؟“ گل رخ کا بارل لہجہ محمد یار خان کو فتح کی نوید دلانے لگا۔

”میں نے کب کہا کہ، یاری خان سے شادی کروں گی؟“

”کہنا ضروری تو نہیں ہوتا۔ بس رویے سے احساس دلایا جاتا ہے۔“ محمد یار خان کے لہجے میں شکوے کا عنصر نمایاں تھا، گویا کہ وہ اس کا محبوب ہی تو ہو۔

گل رخ نے اس کے لہجے سے حوصلہ پا کر کہا۔

”ٹھیک ہے محمد یار خان! عمر اس کے لیے میری دو تین شرائط ہیں۔“

”بتاؤ؟“ محمد یار خان کے لہجے میں دبا ہوا جوش تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ کوہر مقصود حاصل کرنے والا ہے۔

”پہلی شرط یہ ہے کہ جب تک امی جان کا چالیسواں نہیں گزر جاتا نکاح نہیں ہوگا۔ دوسرا تم پشاور میں مکان خرید کے میں گاؤں واپس نہیں جاؤں گی۔ تیسرا تم یاری خان سے مل کر کرو گے اور اس سے معذرت بھی کرو گے اور چوتھا نکاح نا ہے پر لکھ کر دو گے کہ تم میرے مرنے سے پہلے دوسری سادی نہیں کرو گے۔“

”مجھے منظور ہے۔“ محمد یار خان خوشی سے چپکا۔ اور گل رخ نے بتاؤٹی حیا سے سر جھکا لیا۔

اس کے بعد محمد یار خان گل رخ کو خوش کرنے کی کوششوں میں مصروف ہو گیا۔ اس کے لیے اچھے اچھے کپڑے اور میک کا سامان خرید لایا۔ گل رخ بھی دل پر جبر کیے وہ تحائف خوشی سے وصول کرتی رہی۔ اس کے رویے سے محمد یار خان کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ بھی اس سے محبت کرتی ہے۔ اور پھر ایک دن موقع پا کر وہ وہاں سے

دروازہ کھولا؟“

”مجھ سمجھے۔“ عدنان حیدر نے اثبات میں سر ہلایا۔

”مگر اسے پتا کیسے چلا کہ گل رخ نے آپ کے ہاں پناہ لی ہے؟“

”کہانی کے اختتام پر آپ کو پتا چل جائے گا۔“ داؤد نے میرا جیس بھال رکھا۔

”چلو..... پھر شروع رہو۔“ میں نے منہ بنایا۔ اور داؤد خان نے ہنستے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔

”بابا جان چند ماہ تک گل رخ کو ڈھونڈتے رہے مگر انہیں پتا نہ ہوئی۔ بابا جان کی طرح محمد یار خان بھی دیوانوں کی طرح گل رخ کو تلاش کرتا رہا مگر وہ اس علاقے میں ہوتی تو اسے ملتی۔ بابا جان کا دل وہاں سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ چھوٹے بھائی سے یوں بھی اس کی بول چال بند تھی۔ ماں کے لیے دونوں بیٹے برابر تھے وہ بھی بابا جان کو کوئٹے لگتی جو اپنے چھوٹے بھائی کو بھائی دلانے پر کمر بستہ تھے اور کبھی محمد یار خان کو کوئٹے لگتی جس کی وجہ سے یہ سارا کھٹ راگ پھیل گیا تھا۔ گھر کے کشیدہ ماحول سے تنگ آکر بابا جان نے اپنا ترک بچا اور انگلینڈ کا دیزہ بنا کر اپنا علاقہ کیا ملک بھی چھوڑ دیا۔ یہ سارا فساد اس کے انگلینڈ جانے کے منسوب ہے سے ہی پھیلا تھا، مگر اس وقت انگلینڈ جانے کا مقصد کوئی اور تھا جبکہ ابھی اسے حالات سے دل برداشتہ ہو کر جانا ہی تھا۔

انگلینڈ میں انہیں چند مختص پنھان مل گئے جنہوں نے بابا جان کی صحیح رہنمائی کی۔ بابا جان نے وہاں ٹیکسی ڈرائیور سے شب روز کا آغاز کیا اور جلد ہی اپنی ٹیکسی خرید لی۔ انہیں انگلینڈ میں سال بھر ہی ہوا تھا کہ ایک دن ایک نیم صاحب جن کی کار کا ڈرائیور بچہ ہوا تھا، وہ بابا جان کی ٹیکسی میں آن بیٹھی۔ اور پھر ایک سادہ لوح پنھان کی کلابی انگریزی سے ایسی محفوظ ہوئی کہ بابا جان کو دل دے

سے وہ وہاں سے دور بھاگ جانا چاہتی تھی۔ پشاور لاری اڈے سے وہ پنڈی جانے والی بس میں بیٹھی اور پھر وہاں سے بغیر کسی منصوبے کے اتفاقاً گجرات جانے والی بس میں بیٹھ گئی۔ اس کے پاس زادراہ کے طور پر بہت محدود رقم تھی۔ تنہا خوبصورت اور جوان لڑکی کا مردوں کی دنیا میں اکیلا اپنی عزت کو محفوظ رکھنا ناممکنات میں سے ہے۔ عورت ذات کو ہمیشہ مرد کے سہارے کی ضرورت رہی ہے ورنہ ہر مرد اسے مال غنیمت سمجھ کر اس کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے۔ محمد یار خان نے بھی سب سے پہلے اس کے سہارے کو ختم کیا تھا اور اس کے بعد اس کی عزت کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا۔ وہ محمد یار خان کو معاف نہیں کر سکتی تھی مگر ابھی تک گیند محمد یار خان کے کورٹ میں تھی لیکن اس کا اس بات پر بھی ایمان تھا کہ ہر ظالم کی ری کھینچنے کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ اللہ پاک ہر فرعون کو مہلت ضرور دیتا ہے لیکن اس کے ساتھ یہی اس کی رعب کا قانون ہے کہ ہر فرعون کے لیے ایک موسیٰ بھیجتا ہے۔ گجرات سے چندہ میں کلومیٹر پہلے بس فرما کر ہوئی۔ ڈرائیور کنڈیکٹر تو بس کو ٹھیک کرنے میں جڑ گئے جبکہ سوار یاں نیچے اتر کر بیٹھنے لگیں۔ گل رخ بھی نیچے اتری۔ وہاں فریب ہی اسے ایک گاؤں کے آمار نظر آ رہے تھے۔ ایک ادھی سفید رنگ کی حویلی کو دیکھ کر اس کے قدم کئی چٹنگ کی طرح بے اختیار اس طرف بڑھ گئے۔ پتا ہے وہ حویلی کس کی تھی؟ ”کہانی سناتے سناتے اچانک وہ مجھ سے مستفسر ہوا۔“

”مجھے کیا معلوم؟“ میں نے خیرانی سے جواب دیا۔

”وہ میرے دادا چوہدری حیدر علی کی حویلی تھی۔“ خاموش بیٹھے عدنان حیدر نے لقمہ دیا۔

”اوہ.....“ میں ششدر رہ گیا تھا۔ ”مطلب آپ کے دادا نے گل رخ کو پناہ دے کر محمد یار خان سے دشمنی کا

بیٹھی۔ بابا جان پختہ مسلمان تھے۔

ابیس کو ان سے ایسی محبت ہوئی کہ اس نے اسلام قبول کرنے میں ایک لمحہ بھی پس و پیش نہیں کی۔ ان کا نام بابا جان نے یاسمین رکھا، جو کہ میری امی جان تھیں۔ شادی کے ایک سال بعد میری پیدائش ہوئی، جس وقت میری عمر سات سال ہوئی بابا جان کے دل میں ماں کی محبت نے جوش مارا اور انہوں نے واپسی کی راہ لی۔

امی جان کو بھی پاکستان دیکھنے کا شوق تھا۔ یہاں آکر بابا جان نے پشاور میں پلاٹ خریدا اور ایک اعلیٰ قسم کی کوٹھی تعمیر کی اس کے ساتھ اس نے اپنا سارا پیسا ٹرانسپورٹ کے بزنس میں لگا دیا۔ اس کام میں یوں بھی اسے کافی مہارت تھی۔ محمد یار خان جو اس کے انگلینڈ جاتے وقت نو جوان تھا ابھی بھر پور جوان ہو گیا تھا۔ اس کا اٹھنا بیٹھنا مجرم اور غلط قسم کے لوگوں سے تھا لیکن جب اسے پتا چلا کہ اس کا بھائی انگلینڈ سے کافی پتہ لگا کر لوٹا ہے تو وہ بغیر کسی جھجک کے اسے ملنے آن پہنچا، ماں کا انتقال ہوئے دو سال گزر گئے تھے۔ بابا جان نے بھی بھائی کی ساری خطائیں معاف کر کے اسے گلے سے لگالیا گواہی جان نے انہیں محمد یار خان کا پچھلا رویہ یاد دلایا پر بابا جان میں کڑاں لگے۔ مگر کہتے ہیں ناکہ کم ظرف جس تھالی میں کھانا ہے ہمیشہ اسی میں چمید کرتا ہے۔ محمد یار خان بھی چند ماہ سے زیادہ ممبر نہ کر سکا اور اس کا بحرمانہ دماغ اسے مجبور کرنے لگا کہ وہ کسی طرح سے بڑے بھائی کی دولت پر قبضہ کرے۔ اس ظالم نے دولت کے حصول کے لیے گھٹیا پن کی انتہا کر دی اور ایک دن بھائی کو زہر آلود مشروب پلا دیا۔ بابا جان کی موت نے امی جان کو نیم پاگل کر دیا تھا اور اس پاگل پن کا قاعدہ اٹھا کر محمد یار خان نے اپنے بھائی کو چپکے سے دفن دیا۔ تعزیت کے لیے آنے والوں کو اس نے بتایا کہ اس کے بھائی کو ہارٹ ایٹک ہوا ہے۔ دو تین ماہ کے اندر امی جان کی

حالت کچھ سنبھل گئی اور پھر ایک دن جب محمد یار خان نے مجھے مارنے کی کوشش کی تو امی جان کو پتا چل گیا کہ اس کے شوہر کا قاتل بھی وہی ہے۔ دراصل وہ بکلی کی نکلی تار میری طرف بڑھا کر مجھے پکڑنے کی دعوت دے رہا تھا۔ امی جان نے دیکھ لیا۔ محمد یار خان بہانہ بنا کر کہنے لگا کہ وہ اپنے بھتیجے سے مذاق کر رہا تھا، مگر امی جان کوئی ان پڑھ جاہل عورت نہیں تھیں۔ انہوں نے فی الفور واپسی کا فیصلہ کیا۔ اگر وہ اپنے دیور کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی کوشش کرتی تو اسے اندیشہ تھا کہ محمد یار خان اس کے اکلوتے بیٹے کو نقصان پہنچانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ ہم دونوں انگلینڈ پہنچ گئے، وہ میرے جوان ہونے کا انتظار کرنے لگی تاکہ اپنے شوہر کے قاتل سے بدلہ لے سکے۔ لیکن امی جان کی عمر نے بھی وفات کی میں بمشکل اپنا تعلیمی سفر پورا کر سکا تھا کہ ان کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ البتہ مرنے سے پہلے وہ مجھے ساری کہانی سنا گئی تھیں۔ میں نے سب سے پہلے ان کے چھوڑے ہوئے کاروبار کی دیکھ بھال کی کیونکہ اپنے دشمن سے انتقام لینے کے لیے مجھے دولت کی ضرورت تھی۔ گواہی جان میرے لیے کافی کام چھوڑ گئی تھیں لیکن وہ صرف میری ضروریات کے لیے کافی تھا جبکہ مجھے ایک ایسے شخص کا مقابلہ کرنا تھا جو اس وقت صوبائی اسمبلی کا ممبر تھا۔ اس کے بارے امی جان شروع دن سے باخبر رہتی تھیں۔ پاکستان میں رہائش کے دنوں میں امی جان نے کافی لوگوں سے تعلقات بنائے تھے اور انہی لوگوں سے انہیں محمد یار خان کے بارے تازہ معلومات ملتی رہتی تھی۔ میں نے امی جان کے چھوڑے ہوئے کاروبار کو کافی وسعت دی اور جب سمجھا کہ اب میں دشمن کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو گیا ہوں تو، پاکستان آ گیا۔ اپنا سارا اثاثہ میں نے انگلینڈ سے پاکستان منتقل کیا اور ایک اسپورٹ، ایکسپورٹ کمپنی کی بنیاد ڈالی۔ دولت کی فراوانی نے مجھے کسی مشکل سے

محمد یار خان بھائی کی جائیداد اور ٹرانسپورٹ کے کاروبار کا بلا شرکت غیرے مالک بن چکا تھا اس نے ٹرانسپورٹ کمپنی فروخت کر کے ساری رقم سیاست میں لگا دی اور پہلی ہی بار صوبائی اسمبلی کا ممبر بن گیا۔ یہ سیٹ اس کے جرائم پر پردہ ڈالنے کے لیے کافی تھی۔

گل رخ کو چودھری حیدر علی کے گھر رہنے نو سال ہو گئے تھے۔ اس نے اپنے دکھوں کی سن گن بھی کسی کو نہیں کہنے دی تھی۔ اسی دوران چودھری فرمان حیدر کی بیوی یعنی میری پہلی امی جان بقضائے الہی وفات پا گئی۔ پہلی بیوی سے ابو جان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ بیٹے کی دوسری شادی کے لیے چودھری حیدر علی کی فکر انتخاب گل رخ پر پڑی۔

وہ ایک خوش شکل اور انتہائی خوددار لڑکی تھی۔ چودھری فرمان حیدر کو بھی گل رخ بہت پسین لگتی تھی اس لیے اس نے بغیر کسی جھجک کے والد صاحب کی رائے پر سر جھکا لیا۔ گل رخ کی حالت بھی کئی چٹنگ کی سی تھی، گو یہاں اسے پناہ مل گئی تھی مگر بغیر مرد کی رفاقت کے ساری زندگی بزارت عورت کے لیے اتنا ہی مشکل ہے جتنا ایک مرد

کے لیے بغیر عورت کے ساری عمر بتا دینا۔ اس نے بھی لمحہ بھر سوچنے کے بعد اثبات میں سر ہلا دیا۔

چچا قربان حیدر باقاعدگی سے انکیشن میں حصہ لیتا تھا گو اب تک وہ اسمبلی تک رسائی حاصل نہیں کر پایا تھا مگر خاندانی پس منظر کی وجہ سے اس کا اثر رسوخ کافی زیادہ تھا۔ بڑے بھائی کی شادی میں اس نے کافی جاننے والوں کو دعوت دی تھی، بد قسمتی سے ان لوگوں میں محمد یار خان بھی شامل تھا۔ نکاح کی تقریب کے لیے حویلی کے وسیع و عریض لان میں خوبصورت شامیانے اور قاتیں لگائی گئی تھیں۔ اور جب نکاح کے لیے گل رخ جج سنور کر وہاں پہنچی تو محمد یار خان کے دل کی دھڑکن بے ربط ہونے لگی اس نے گل رخ کو پہچان لیا تھا اور اس کے بعد ناممکن تھا کہ وہ خاسوش رہتا۔ نکاح سے پہلے وہ چودھری قربان

دوچار نہیں ہونے دیا۔ کاروبار کے ساتھ ساتھ میں نے محمد یار خان کے دشمنوں کی تلاش بھی جاری رکھی کیونکہ دشمن کا دشمن دوست ہوتا ہے۔ محمد خان کے دشمن تو کافی ہیں مگر ان میں کچھ تو بالکل عام سے لوگ ہیں اور کچھ سیاسی دشمن ہیں۔ جو کہ اس کے گل کا انتہائی قدم نہیں اٹھا سکتے۔ تنگ آکر میں نے کچھ مجرم قسم کے آدمی تیار کیے تاکہ ہر میدان میں اسے منہ توڑ جواب دے سکوں، پھر مجھے عدنان حیدر کے چچا قربان حیدر اور والد فرمان حیدر چودھری کے بارے پتا چلا کہ وہ بھی محمد یار خان کی جان کے دشمن ہیں اس طرح اس خاندان سے بھی میری دوستی ہو گئی۔

”لالہ داؤد! اس ساری تفصیل میں اس کردار کا ذکر مخدوف ہے جس کی وجہ سے آج میں ادھر موجود ہوں۔“

وہ ہنسا۔ ”شیر دل خان! ابھی تک میری بات جاری ہے۔“

”ٹھیک ہے جناب۔“ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہاں سے عدنان حیدر نے بات آگے بڑھائی۔ ”داؤد لالہ نے گل رخ کا ذکر درمیان میں چھوڑ دیا تھا۔ بس سے اتر کر وہ حیدر علی یعنی میرے دادا کی وسیع و عریض حویلی کی طرف بڑھی۔ اور چونکہ دار کی وساطت سے میرے دادا حیدر علی سے ملی، جاگیر دار ہونے کے باوجود وہ بہت اچھے انسان تھے۔ اس نے ایک وکیل لڑکی کو پناہ دینے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کی تھی۔ گل رخ حویلی کے ایک فرد کی طرح وہاں رہنے لگی۔ پھر پھوٹا، گل رخ کی گہری سہیلی بلکہ منہ بولی بہن بن گئی تھیں ان کا آپس میں برتاؤ بالکل سچی بہنوں کا سا تھا۔ اسی اثناء میں پروفیسر والا واقعہ ہوا جس کی تفصیل میں بتلا چکا ہوں۔ اور بواصالہ کو پروفیسر کی محبت نے بھری جوانی میں ہی موت کا تلخ پیالہ پینے پر مجبور کر دیا۔“

تھی۔ اور بدلے میں ایک ایسی دشمنی اس کے حوالے کر مئی تھی کہ جو لوگ اس کی نگر کے، بلکہ خاندانی لحاظ سے اس سے بہت فائق تھے۔

چودھری فرمان حیدر ایک اچھا شوہر ثابت ہوا تھا۔ شادی کے سال بعد اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک پیارے سے بیٹے سے نوازا جس کا نام گل رخ نے عدنان حیدر رکھا۔ جب عدنان چند ماہ کا ہوا تو گل رخ نے اپنے شوہر سے صالحہ کے محبوب ارشد زمان کے متعلق دریافت کیا، وہ ابھی تک اپنی عزیز از جان نکلی صالحہ کو نہیں بھلا سکی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کے بعد چودھری فرمان نے اس سے وعدہ کر لیا کہ وہ ضرور اسے ڈھونڈے گا۔ اور پھر اپنے وعدے کے بموجب اس نے پروفیسر کو ڈھونڈ لیا۔ پروفیسر نے شادی کر لی اور انہی دنوں ایک پیاری سی بیٹی کا باپ بنا تھا۔

”ٹھیک ہے فرمان! یہ لڑکی ہماری بیوی بنے گی۔“

فرمان نے کہا۔ ”میں کس منہ سے پروفیسر سے اس کی بیٹی مانگوں گا؟“

”آپ کو زحمت کی ضرورت نہیں ہے۔ پروفیسر کی بیٹی لینے ہمارا بیٹا خود جائے گا۔“ امی جان نے فیصلہ صادر فرمایا۔

فرمان حیدر ہنسنے ہوئے بولا۔ ”جیسے تمہاری مرضی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی اور امی جان بھی ہنس دی تھی۔“

شادی کے چند سال تک تو محمد یار خان نے دو تین بار ہماری حویلی پر چڑھائی کی مگر اسے منہ کی کھائی پڑی، اس بار اس کا واسطہ خود سے محضے دشمن سے پڑا تھا، مگر وہ اتنی جلدی ہار ماننے کے لیے تیار نہیں تھا، وہ کینہ اور گھٹیا طبیعت کا شخص تھا۔ لومڑی کی طرح مکار اور اونٹ کی طرح کینہ رکھنے والا۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ ہمارے خاندان سے ضرور بدلہ لے گا۔

عدنان کی پیدائش کے پانچ سال بعد چودھری

حیدر کو ٹھپے میں لے جا کر بتانے لگا کہ گل رخ اس کی خالہ زاد ہے اور کس طرح وہ گھر سے بھاگ کر وہاں پہنچی ہوئی ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ گل رخ کو اس کے حوالے کر دیا جائے۔

چودھری قربان حیدر بے غیرت نہیں تھا مگر محمد یار خان کے رتبے کو دیکھتے ہوئے اس نے کہا کہ وہ مہر کرے پہلے وہ گل رخ سے سب کچھ پوچھے گا پھر اس کے بعد اسے جواب دے گا۔ والد صاحب اور بڑے بھائی کو ساتھ لے کر اس نے گل رخ کو ٹھپے میں بلایا، دیکھنے والوں نے سمجھا کہ کسی خاندانی رسم کی وجہ سے دہن کو لے جایا جا رہا ہے اس لیے کسی نے اس بات پر توجہ نہیں دی تھی۔

جب گل رخ سے قربان حیدر نے محمد یار خان کی بابت دریافت کیا تو پہلے تو وہ ہکا بکا رہی کہ انہیں کیسے اس بارے پتا چلا۔ بعد میں روتے ہوئے اس نے ساری کہانی ان کے سامنے دہرا دی۔

”اس کی اتنی جرأت؟“ چودھری حیدر علی غصے سے کہتا تھا۔ اس نے اسی وقت محمد یار خان کو وہیں بلا کر کھری کھری سنادیں۔ محمد یار خان نکاح کی تقریب میں شمولیت اختیار کیے بغیر وہاں سے دفع ہو گیا، لیکن جاتے جاتے وہ بھی ہمارے خاندان کو بدلہ لینے کی دھمکی دے گیا تھا۔ نکاح کی تقریب ہوئی، مہمان رخصت ہو گئے۔ رخصتی کی تقریب ایک ہفتے بعد ہوئی تھی۔ اس سے پہلے محمد یار خان نے کچھ غنڈوں کے ساتھ ہماری حویلی پر ہلہ بولا مگر بابا جان اور چچا غافل نہیں تھے۔ انہوں نے محمد یار خان کو بھرپور جواب دیا اور محمد یار خان کو اپنے دو ساتھیوں کی لاش وہاں چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ البتہ اس فائرنگ میں ایک گولی دادا جان کو بھی لگی تھی جو بعد میں ان کی موت کا باعث بنی۔

رخصتی کی تقریب اپنے وقت پر ہوئی۔ محمد یار خان انگاروں پر لوٹا رہا۔ گل رخ اس کے ہاتھوں سے نکل گئی

نظر آنے لگتا ہے تو مجبوراً وہ اپنی ماں دہکتی ہے، امی جان بھی پریشان ہو جاتی ہیں، وہ سب کچھ بابا جان اور مجھے بتا دیتی ہیں۔ اس وقت تک عائشہ میری بیوی بن کر گھر آ چکی ہوتی ہے۔ عائشہ کے مشورے پر ہم نے ایک کمپیوٹر کے باہر سے سائرہ کے خوابوں میں آنے والے نوجوان کی تصویر بنائی تاکہ اسے پہچانا جاسکے مگر وہ ایک انجان آدمی تھا۔ آپ یقیناً اس کی تصویر دیکھنا چاہیں گے؟“ کہتے ہوئے عدنان نے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک تصویر نکال کر میری جانب بڑھائی۔ میں حیران رہ گیا تھا کیونکہ وہ تصویر میری ہی تھی۔

یہ..... تو..... میں ہوں۔“ میں اٹکتے ہوئے بولا۔

”ہاں بالکل آپ ہیں اور جو تصویر آپ نے اخبار میں چھپوائی تھی وہ میری چھوٹی بہن سائرہ کی تھی۔“

”سائرہ کہاں ہے؟“ میرے لہجے میں بے خبری نمایاں تھی۔

”اُسے سعد یار خان نے اغواء کر لیا ہوا ہے۔“ عدنان نے بے بسی سے سر ہلایا۔

”کیا اس نے بدلے کی تان ایک معصوم لڑکی کے اغواء پر آن ٹوٹی؟“ میرے لہجے میں شامل غیظ و غضب مجھے خود حیران کر گیا تھا۔

داؤد کہنے لگا۔ ”کل رخ کی شادی کے کچھ عرصہ

بعد سعد یار خان نے بھی شادی کر لی تھی اور اس نے عہد کیا

تھا کہ چودھریوں کے خاندان کی کسی عورت کو زبردستی اپنی

بیوی بنائے گا۔ اس کی وہ قسم تو پوری نہیں ہو سکی کہ اس کی

عمر اب ساٹھ سے تجاوز کر گئی ہے۔ البتہ اپنے بیٹے کے

لیے جو ابھی تک جوان نہیں ہوا، اس نے سائرہ کو اغواء کر

لیا ہے اور جیسے ہی وہ جوان ہوگا سعد یار خان اپنی قسم پوری

کرے گا۔“

”پہلے سے اغواء کرانے کی وجہ؟“

فرمان حیدر کے ہاں ایک خوبصورت بچی نے جنم لیا جس کا نام اس نے سائرہ رکھا، میرا نام امی جان نے رکھا تھا، گڑیا کا ابو جان نے خود رکھا۔ سائرہ نہایت خوب صورت اور ذہین بچی تھی۔ تمام گھر والوں کی لاڈلی۔ جب وہ جوان ہوئی تو ایک رات اس نے خواب دیکھا کہ ایک کالے رنگ کا ناگ اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ اور وہ تیزی سے نامعلوم سمت بھاگ رہی ہے، پھر ایک جوان وہاں پہنچ جاتا ہے سانپ کو دیکھ کر وہ نوجوان بھی بھاگنے لگتا ہے اسی دوران سائرہ گر جاتی ہے۔ سانپ اسے ڈسنے ہی والا ہوتا ہے کہ بھاگنے والا نوجوان ایک دم پھٹتا ہے اور سانپ کی گردن سے پکڑ کر اس کا سر پتھر پر گرا کر اسے ہلاک کر دیتا ہے اور خود وہاں سے چلا جاتا ہے۔ سائرہ پہلے تو خوف کے مارے اپنی جگہ سن کھڑی ہوتی ہے۔ پھر سانپ کے ہلاک ہوتے ہی اس کے اوسان جگہ برآتے ہیں اور وہ نوجوان کو آواز دینے کی کوشش کرتی ہے مگر اس کے حلق سے آواز برآمد نہیں ہوتی۔ وہ اس نوجوان کا پیچھا کرتی ہے وہ نوجوان ایک وادی میں داخل ہوتا ہے۔ وہ بھی اس کے پیچھے وہیں داخل ہو جاتی ہے۔ وہاں کا منظر نہایت خوب صورت اور دل موہ لینے والا ہوتا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی آگے بڑھتی ہے پھولوں کے ایک خوبصورت کنج کو عبور کر کے وہ تھوڑا سا آگے بڑھتی ہے تو اسے وہ نوجوان ایک خوب صورت جھنگ کے کنارے کھڑا نظر آتا ہے۔ وہ اس کی طرف بڑھتی ہے مگر اس وقت اس کے لب قوت گویائی سے محروم ہو جاتے ہیں اس کے چہرے پر افسردگی کے آثار نمودار ہوتے ہیں۔ وہ نوجوان بھی بولنے کی کوشش کرتا ہے مگر بول نہیں پاتا۔ یہ بے بسی کی انتہا تھی کہ وہ اپنے سچا سے بات نہیں کر پاتی، اس کی آنکھوں میں آنسو نمودار ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ اس کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ پہلی بار تو اس خواب کو سچ کے قابل نہیں سمجھتی مگر جب یہ خواب ایک سلسلے سے

”کیوں نہیں بتائی مگر وہ کوئی ثبوت تو نہیں ہے؟“
ایک ضمیر فروش کی بات کو عدالت تو نہیں مانتی؟ یوں بھی
وہ ہمارے لیے عدالت میں گواہی دینے سے تو رہا؟“
”کیا اس نے سارہ کے قید ہونے کی جگہ نہیں
بتائی؟“

داؤد نے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں۔۔۔ اس بارے
میں کچھ معلوم نہیں۔“
”اسے کب اغواء کیا گیا؟“

”جس دن آپ صمد یار خان سے صلح کی بات
کرنے گئے تھے اس سے دو دن پہلے یہ واقعہ ہوا۔“
”سمجھ گیا۔“ میں نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا۔
”آپ کچھ بتا رہے تھے؟“

وہ دوبارہ تفصیل بتانے لگا۔ ”پھر تم نے اخبار میں
اشتبہ شائع کرایا۔ جس میں سارہ کی تصویر بھی شائع
ہوئی۔ وہ اشتہار جیسے ہی عدالت کی نظر سے گذرا وہ میرے
پاس دوڑتا چلا آیا۔ مجھے سارہ کی بابت وہ تفصیل سے بتا
چکا تھا۔ پس میں نے اپنے ایک ملازم کو حکم دیا کہ وہ تم
سے رابطہ کرے۔ اس وقت تک ہمارے وہم و گمان میں
بھی نہیں تھا کہ یہ تم ہو؟ خیر میرے آدمی نے تم سے بات
کر کے اس بات کی تصدیق کر دی کہ اشتہار شائع کرانے
والے کا فون آن ہے۔ پس میں نے اس نمبر کو ٹریس کرایا
تو پتا چلا کہ وہ تو ان رجسٹرڈ نمبر ہے البتہ جس فون میں
استعمال ہو رہا ہے اس فون میں ایک اور کنکشن بھی استعمال
ہو رہا ہے۔ جو شیر دل خان کے نام پر ہے۔ دو اور دو چار
کی طرح آپ کی شخصیت ہمارے سامنے کھل گئی اور ہم
اس عجیب اتفاق پر حیران رہ گئے۔“

”موبائل فون کے اپنے نمبر سے مجھے ٹریس کیا؟“
میں نے حیرانی سے پوچھا۔

”عجیب بات ہے۔۔۔ آپ کو نہیں معلوم؟“
”نہیں۔۔۔ میں نے نفی میں سر ہلایا۔

عدالت بولا۔ ”تا کہ یہ نہ ہو کہ ہم اسے کسی اور جگہ
پناہ دیں۔ حالانکہ وہ ابھی تک فرسٹ ایئر کی طالبہ ہے۔“
”کیا آپ لوگوں نے اس کے خلاف کوئی
کارروائی نہیں کی؟“

داؤد نے کہا۔ ”بغیر کسی ثبوت کے ہم کیا کارروائی
کر سکتے تھے۔ اگر اس پر حملہ کرتے تو جوابی کارروائی میں
وہ سارہ کو جانی نقصان پہنچا سکتا تھا۔“
”اچھا آپ لوگ مجھ تک کیسے پہنچے؟“ میں نے
ذہن میں چلتا سوال پوچھا۔

”تمہارے بھائی اور والد کی صمد یار خان سے
ہونے والی لڑائی کی خبر مجھ تک بھی پہنچ گئی تھی۔ اس کے
ساتھ تمہارے بارے بھی پتا چلا تھا کہ لڑائی جھگڑے
سے دور رہنے والے بلکہ لڑائی جھگڑے کو بردہ کی حد تک
نا پسند کرنے والے ہو، لیکن اس وقت تک ہم تمہاری شکل
سے ہم ناواقف تھے۔ پھر تم صلح کرنے کے لیے صمد یار
خان کے بنگلے پر گئے مگر وہاں تمہارے ساتھ نہایت
افسوس ناک واقعہ پیش آیا۔“

”اس بارے آپ کو کیسے پتہ چلا؟“ میں نے قطع
کلامی کی۔

”میاں شیر دل خان۔۔۔ دشمن سے مقابلے کا پہلا
اصول یہی ہے کہ آپ اس پر برابر نظر رکھے ہوئے
ہوں۔ اور دشمن پر نظر رکھنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اس
کے کسی اہم آدمی کو خرید لیا جائے۔“

”گو کیا اس کے آدمیوں میں آپ کا کوئی ساتھی
موجود ہے؟“

”ساتھی تو نہیں ہے۔ بس اس کے ایک ساتھی کو
ہڈی ڈال کر اس سے صمد یار خان کے بارے ضروری
معلومات حاصل کر لیتا ہوں۔“

”تو پھر اس آدمی نے آپ کو سارہ کی بات نہیں
بتائی؟“

بھی دشمن ہے۔ سائرہ کو اغواء کرنے کی وجہ سے بھی، میری عزت نفس بکروچ کرنے کی وجہ سے بھی اور میرے بابا جان اور بھائی کے ساتھ جھگڑا کرنے کی وجہ سے بھی۔ گویا میرے پاس اسے قتل کرنے کے لیے ایک سے زائد وجوہات موجود ہیں اس نسبت سے آپ لوگ میرے ساتھ ہوئے نہ کہ میں آپ کے ساتھ ہوا۔ اسی ضمن میں یہ آپ لوگوں کا مجھ پر احسان ہے، میرا آپ پر کوئی احسان نہیں ہے۔

”اعلیٰ ظریفی سے آپ کی.....“ عدنان محبت سے بولا۔ جبکہ داؤد خان نے مجھے اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا۔
”اچھا اب کیا لائحہ عمل ہوگا؟“ میں نے داؤد خان سے علیحدہ ہو کر پوچھا۔
”سب سے پہلے تو آپ گھر جائیں۔ اپنے والد اور بھائی کی خیر خبر لیں۔ پھر ہم چچا جان اور ہر دل خان کو بھی اس مشورے میں شامل کریں گے۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ”ذکر کے میں نکل جاؤں گا۔“
اور ان دونوں نے اثبات میں سر ہلادیا۔

☆☆☆

راشد کو میں نے اپنی واپسی کے بارے مطلع کر دیا تھا وہ بڑی بے صبری سے میرا انتظار تھا۔ میرے پاس اپنی جیب موجود تھی اس لیے ٹرانسپورٹ کی کوئی پرالیم موجود نہیں تھی۔ پر تکلف ذکر کے میں وہاں سے نکل آیا تھا۔ داؤد خان اور عدنان حیدر نے بڑی محبت سے مجھے رخصت کیا تھا۔ تین گھنٹوں کی تیز ڈرائیونگ کے بعد میں پشاور پہنچ گیا تھا۔
”ہاں بھی! رستا کیسے کتنا؟“ گھر کا دروازہ راشد ہی نے کھولا تھا۔

”رستا کسی نہ کسی طرح کٹ ہی جاتا ہے میاں! بس قدم نہیں رکھنے چاہئیں۔“

”ہر موبائل کا ایک ایسی نمبر ہوتا ہے۔ آپ جب بھی کسی سم کو ایک موبائل میں استعمال کرتے ہیں تو بہت آسانی سے پتا چل جاتا ہے کہ یہ سم کس موبائل فون میں استعمال ہو رہی ہے۔ اسی طرح اگر موبائل کا ایسی نمبر معلوم ہو تو بھی پتا چل جاتا ہے کہ اس موبائل میں کون سی سم استعمال ہو رہی ہے۔“

میں نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے پوچھا۔ ”اور اس طرح آپ کو میرے بارے پتا چل گیا؟“

”جی ہاں..... پھر مجھے اچانک ایک ضروری کام سے کراچی جانا پڑ گیا اور میں نے اپنے دست راست راجا طارق کو بتایا کہ تمہیں کسی بہانے کے ذریعہ سے یہاں بلا لے۔ البتہ اصل بات نہ بتائے، یوں ہی راجا طارق اصل بات سے لاعلم تھا۔ اب مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ بیوقوف تمہیں دشمن سمجھ لے گا۔ خیر اپنی بیوقوفی کے ہاتھوں اسے جان سے ہاتھ دھونے پڑے، وہ تمہیں آخر تک بزدل سمجھتا رہا۔“

”بزدل نہیں تھا۔“ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔
”مگر حالات کے سلسلے میں ایسے جھکے دینے کہ میری بزدلی کو کہیں غائب ہونا پڑا۔“

میرے انداز پر وہ دونوں مسکرا اڑے تھے۔
”اچھا اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟“ داؤد خان نے پوچھا۔

”لالا جی! عدنان بھائی سے معذرت کرتے ہوئے کہوں گا کہ، اس سے پہلے بھی میری زندگی کا مقصد ہے خوابوں میں آنے والی معصوم صورت دوشیزہ کی تلاش تھی۔ اب تو میں اس کے بارے سب جان گیا ہوں اور میرا ارادہ اتنی جلدی نہیں بدلا کرتا۔“

”گویا صمد یار خان کے خلاف ہمارا ساتھ دو گئے۔“
”نہیں.....“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”آپ کا ساتھ کیسے دوں گا؟ وہ اکیلا آپ کا دشمن نہیں ہے۔ وہ میرا

دوڑائی وہاں حنا کرسی پر بیٹھی بظاہر صحن میں لگے درخت کی طرف متوجہ تھی، مگر مجھے معلوم تھا حقیقت میں وہ مجھے دیکھ رہی تھی۔ افسردہ انداز میں سر ہلاتے ہوئے میں جیب میں بیٹھ گیا۔

ظہر کے ٹائم تک میں اپنے گاؤں پہنچ گیا تھا۔ امی جان نے مجھے دیکھتے ہی اپنے ساتھ لپٹایا اور ماتھے پر بوسا دیتی ہوئے پوچھنے لگیں۔

”شیر دل اتنے دن سے کہاں غائب تھے۔ پتا ہے تیرے بابا جان بہت پریشان تھے تیرے لیے۔“

”نہیں ہو سکتا امی جان!“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اگر وہ پریشان تھے تو کال کر کے میرا پوچھ سکتے تھے۔ میں چند گھنٹوں کی مسافت پر ہی تو تھا۔“

زرغونہ بولی۔ ”بھیا! امی جان ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ بابا جان آپ کے بعد بہت فضا تھے مگر بظاہر انجان بنے رہے۔“

”زرغونہ! میں جانتا ہوں بابا جان ہمیں بہت چاہتے ہیں۔ مگر میری طبیعت ایسی بزدلانہ تھی کہ وہ مجھ سے ہمیشہ فضا رہے۔“

”بھیا! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ آج تک آپ خود کو امن پسند کہتے رہے آج ایک دم بزدل کہنا شروع کر دیا۔“ زرغونہ نے سچے میں حیرانی تھی۔

”صحیح کہہ رہا ہوں زرغونہ! میں اپنی بزدلی پر امن پسندی کا پردہ ڈالتا رہا، ورنہ فار کی آواز سن کر کوئی امن پسند بے ہوش نہیں ہو سکتا اور نہ امن پسند اپنی مردانگی کو چوڑیوں کے بار پہناتا ہے؟“ میرے لہجے میں دکھ کی آمیزش تھی۔

”چوڑیوں کے بار؟“ زرغونہ نے حیرانی سے پوچھا۔ ”بعد امی جان سر ہٹھکتی پٹن کی طرف بڑھ گئیں میری اور زرغونہ کی فضا میں وہ کم ہی حصہ لیتی تھیں۔“

”تم نہیں سمجھو گی زرغونہ۔ یہ بتاؤ بابا جان کہاں

”ڈنرتو کر کے ہی آئے ہوں گے؟“

”بالکل..... اور ابھی میں کافی تھکا ہوا ہوں۔ تھوڑی دیر آرام کروں گا۔“

”ہم ممکن.....“ اس نے انکار میں سر ہلایا۔ ”جب تک میں ساری تفصیل نہیں سن لیتا تم نہیں سو سکتے۔“

”یار! حقیقت میں میں بہت تھکا ہوا ہوں؟“ اس کے بیٹے پر لہبا پڑتے ہوئے میں نے جان چھڑانے کی آخری کوشش کی۔

”کوئی بات نہیں۔ میں بھی تھکا ہوا ہوں۔ تم بولنا شروع کر دو میں کافی منگوا لیتا ہوں خیند ایک منٹ میں غائب ہو جائے گی۔“ میں کراہتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔ اس نے حنا کو آواز دے کر دو کپ کافی لانے کا کہا اور میری طرف متوجہ ہو گیا۔

رات کا بقیہ حصہ مجھے اس کے ساتھ کپ شپ میں گزارنا پڑا۔ صبح کی اذان کے وقت تک میں اسے ساری کہانی سنا چکا تھا، نماز پڑھ کر میں نے دو تین گھنٹے آرام کیا کہ ممکن سے میری آنکھیں بند ہو رہی تھیں اور اس کے بعد میں نے فریش ہو کر ناشتا کیا اور گاؤں جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ گھر سے آئے مجھے بمشکل دو ہفتے ہوئے تھے مگر یوں لگ رہا تھا کہ جانے کتنے عرصے سے میں گھر سے باہر ہوں، اس سے پہلے میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے لیے ہاسٹل میں کافی نامزدگار چکا تھا مگر اس طرح گھر سے دوری کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔

”میں ساتھ چلوں؟“ راشد نے پر غلوں کے لیے میں آفر کی۔

”نہیں یار! جب تمہاری ضرورت ہوئی تو ضرور بتاؤں گا؟“

”اپنا بہت سا خیال رکھنا۔“ اس نے مجھ سے ہوداعی مصافحہ کیا۔ میں نے برآمدے کی طرف نگاہ

تھا؟“ میں اسے اپنی بزدلی کے قصے تو نہیں سنا سکتا تھا؟“

”وہ جبرے میں ہیں۔ کل پھر اس خبیث آدمی کے چچوں سے فارنگ کا تبادلہ ہوا ہے۔“ زرغونہ کا اشارہ صدر یار خان کے آدمیوں طرف تھا۔ ”آج بابا جان نے علاقے کے سرکردہ افراد کا جرمہ بلایا ہوا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں سر ہلاتا ہوا بابا جان کے کمرے کی طرف بڑھا جہاں اس کی چار پائی کے اوپر ایک نئی ریشم کلاشکوف لگی ہوئی تھی۔ یہ کلاشکوف بابا جان نے میری تعلیم مکمل ہونے کے بعد مجھے تحفہ دینے کے لیے خریدی تھی اور میں نے بابا جان کا یہ تحفہ قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کلاشکوف کے ہمراہ ایک خوبصورت برٹا پٹیل بھی تھا جو بابا جان نے بڑی جاہت سے

افغانستان سے منگوایا تھا۔ یہ وہ پٹیل تھا جو کسی امریکی فوجی کو جہنم واصل کر کے چھینا گیا تھا۔ چونکہ اس کی قیمت کلاشکوف سے بھی تین چار گنا زیادہ تھی اس لیے جس کے ہاتھ بھی ایسی چیز لگتی وہ بیچ کر دام کمرے کرنے کی کوشش کرتا۔ جبکہ دولت مند اور شوقین افراد ہاتھوں

ہاتھوں خرید لیتے۔ بابا جان نے یہ بھی میرے لیے ہی منگوایا تھا۔ پٹیل اور کلاشکوف کے بارے میں معلومات مہر دل نے میرے کس گزار کی تھیں۔ مہر جان اپنے اکھڑ مزاج کے باعث بابا جان کو پسند ضرور تھا مگر جتنی محبت بابا جان کے دل میں میرے لیے تھی وہ کسی اور کے حصے

میں نہیں آتی تھی۔ یہ علیحدہ بات کہ وہ میری بزدلی کے باعث ان کے دل کی گہرائیوں میں پنہاں رہتی تھی۔ کمرے میں بابا جان کے وجود کی خوشبو بھیجی تھی۔

میں نے سب سے پہلے بابا جان کا ذاتی ٹریک کھول کر برٹا پٹیل باہر نکالا اسے ہولسر سے نکالتے ہی میرا دل عجیب انداز میں دھڑکنے لگا۔ لکڑی کا دست اور ٹھنڈی نولادی ٹال۔ وزن میں ہلکا مگر کارکردگی میں بے مثال۔

جبکہ اس کی فصل مخالف کا پٹا پائی کرنے والی تھی۔ اس کے ہولسر میں دو میگزینوں کی جگہ بھی ایک میگزین کافی لمبی تھی یقیناً اس میں عام میگزین کی نسبت زیادہ گولیاں آتی ہوں گی جبکہ دوسری میگزین پٹیل میں لگی میگزین جتنی تھی۔ تینوں میگزینیں راؤنڈز سے فل تھیں۔ ہولسر کمرے سے باہر کمرے میں نے دیوار سے لگی کلاشکوف اتاری کندھے سے لٹکا کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ زرغونہ صحن میں مرغیوں کو دانہ ڈال رہی تھی، مجھے دیکھ کر اس کی پیڑی پیڑی آنکھیں جھپٹ جھپٹنے کے قریب ہو گئیں۔

”بھائی! وہ چیخ پیڑی تھی۔“

”میں آیا آپ لوگ مجھے اسی روپ میں دیکھنے کے خواہش مند تھے نا؟“

وہ بھاگ کر میرے قریب آئی اور مجھ سے لپٹے ہوئے بولی۔ ”بھائی، بہنوں کو ہر حالت میں چارے ہوتے ہیں۔ مگر جب وہ حفاظت کی جگہ میں نظر آئیں تو ہمیں زیادہ تحفظ محسوس کرتی ہیں۔“

”پگلی ہے تو!“ میں نے مسکرا کر اس کے سر پر ہلکی سی چپٹ لگائی اور گھر سے باہر نکل آیا۔ رستے میں میرا سامنا کسی سے نہیں ہوا تھا۔ جبرے کے قریب پہنچا تو میری سماعتوں میں مختلف قسم کی اونچی نیچی آوازوں کا شور گونجنے لگا۔

میں چند لمحوں کے لیے جبرے کے دروازے پر رک گیا۔ اس حالت میں انداز چلتا مجھے کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ بابا جان بڑے زور و شور سے صدر یار خان کی بد معاشیوں کا ذکر کر رہے تھے۔ ”وہ صدر یار خان جو کبھی ایک تھرڈ کلاس چور اور اٹھائی گیارہواں تھا آج ایم پی اسے صحت مند بن کر علاقے کے سرداروں کے گلے بڑ رہا تھا۔ ایسا شخص جہاں پہنچے جگہ بھائی تک کو قتل کر سکتا ہو وہ کسی اور کا کیا لحاظ کرے گا۔ ایسے بیچ اور کہیں شخص سے کوئی بعید نہیں ہے۔“

بابا جان کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ جو کہانی

عزت کا جنازہ نکالنے کے مترادف تھا۔ میں اس حسین اتفاق پر حیران رہ گیا کہ..... یہ سوال وہ چند لمحے پہلے بھی پوچھ سکتا تھا مگر یقیناً رب تعالیٰ کو باباجان کی عزت رکھنا مقصود تھا اس لیے اس نے یہ سوال اس وقت کیا جب میں دروازے پر گونگی کیفیت میں کھڑا اندر جانے اور نہ جانے کی سوچوں میں غلطاں تھا۔

میں نے زیادہ دیر باباجان کو اذیت بھری سوچوں کے حوالے نہیں کر سکتا تھا۔ شاید وہ اس وقت یہی سوچ رہے ہوں گے کہ اگر میرا بڑا بیٹا یہاں موجود ہوتا تب بھی وہ اس جرمے میں شامل نہ ہوتا۔ دروازہ کھول کر میں ایک دم اندر داخل ہوا۔

”اسلام علیکم!“ میں نے زوردار لہجے میں سلام کرتے ہوئے کہا۔ ”معافی چاہتا ہوں باباجان مجھے تھوڑی سی دیر ہو گئی ہے۔“ (یہ دلچسپ و سنسنی خیز جاری ہے)

مجھے لالا دادو نے سنائی ہے اس میں شک کی گنجائش بالکل نہیں تھی۔ اور باباجان کو پہلے سے صمد یار خان کے کرتوتوں کا علم ہے۔ البتہ میں اسے بطور ایم این اے اور بد معاش کے تو جانتا تھا۔ یہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ اپنے بھائی کا بھی قاتل ہے۔

”خان جی! جرمے کی کارروائی کافی دیر سے شروع ہوئی ہے اور اب تک آپ کا بڑا بیٹا نظر نہیں آ رہا؟ حالانکہ اس کی یہاں موجودی لازمی تھی۔“ یہ سوال ساتھ والے گاؤں کے شر (سردار) نے کیا تھا۔ اس کا نام سردار گل جان تھا۔ اور اس سے دو تین بار باباجان کی تلخ کلامی بھی ہو چکی تھی۔ لازماً میری بزدلی کے قصے اس تک پہنچ چکے تھے اور وہ باباجان کی سرعام ہنک کرنا چاہتا تھا۔ یوں بھی کسی سردار زادے کی بزدلی صندراز میں نہیں رہ سکتی۔ باباجان ایک دم خاموش ہو گئے۔ میں جانتا تھا کہ باباجان کبھی جھوٹ نہیں بولتے اور اس وقت سچ بولنا گویا اپنی

اطلاع برائے مریضان

اسلام آباد، راولپنڈی، ایبٹ آباد، پشاور وغیرہ

آپ کو مطلع کیا جاتا ہے کہ مریضوں کے پُر زور اصرار پر ماہنامہ ”حکایت“ کے ماہر معالج ڈاکٹر رانا محمد اقبال صاحب کے ہر ماہ راولپنڈی کے دوروزہ دورے کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ خواہشمند حضرات ایڈوانس فیس کے ساتھ ٹائم لے سکتے ہیں۔ شکریہ!

ڈاکٹر رانا محمد اقبال 0321-7612717

عارف محمود 0323-4329344

رابطہ:

فرار کے چند مشہور اور دلچسپ واقعات

چھ پاکستانی فوجی قیدیوں نے بھارت کے فوجی کمپ سے فرار کے لئے صرف ایک چھری اور ناخن تراش کی مدد سے 150 فٹ لمبی سرنگ بنا کر سب کو حیران کر دیا



☆ انتخاب: ڈاکٹر عبداللہ

چارلس سوہراج

بدنام زمانہ مجرم چارلس سوہراج، متعدد بار جیل سے فرار ہوا مشہور زمانہ سیریل کٹر چارلس سوہراج، ہر چار سالک میں قتل، ذہنی اور لوگوں کو لوٹنے کے واقعات، مقدمات درج ہیں۔ چارلس کے جیل سے فرار کے لئے زبان زد عام ہیں۔ وہ اپنی مجرمانہ زندگی کے دوران متعدد بار جیل سے فرار ہوا۔ تاہم وہ فرار ہونے کے کچھ عرصے بعد دوبارہ کسی نہ کسی جرم میں پکڑا جاتا۔ آج کل وہ نیپال کی جیل میں عمر قید کی سزا کاٹ رہا ہے۔ 1970ء میں وہ انڈیا کے ہوٹل اشوکا میں واقع ایک جیولری سنور کو لوٹنے ہوئے پکڑا گیا۔

قید کے دوران اس نے بیماری کا جھوٹا بہانہ بنایا اور اپنی بیوی کی مدد سے دہلی کی تہاڑ جیل سے فرار ہو گیا لیکن بہت جلد گرفتار کر لیا گیا۔ اس بار اس نے دیت نام میں موجود اپنے باپ سے ایک بڑی رقم حاصل کی اور ضمانت پر رہا ہونے کے بعد افغانستان فرار ہو گیا۔ یہاں وہ دہلی کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔

اور جرائم پیشہ افراد کے درمیان آنکھ قانون چھوٹی کا کھیل صدیوں سے جاری ہے۔ مجرموں کو قانون کے کٹہرے تک پہنچانے اور انہیں قمار واقعی سزائیں دیئے جانے کے باوجود یہ کھیل جاری رہتا ہے۔ میدان بدلنے سے کھیل کے ضوابط اور طریقہ کار تبدیل نہیں ہوتے۔ قانون کی آنکھوں میں دھول بھرنے کا عمل جیل کی چار دیواری کے اندر بھی جاری رہتا ہے۔ فریق اول (پولیس) فریق ثانی (قیدی) پر گہری نظر رکھتا ہے جبکہ فریق ثانی اس تاک میں رہتا ہے کہ موقع ملے ہی کال کوٹھری سے اڑن چھو ہو جائے۔ اس کھیل میں عموماً جیت فریق اول کی ہوتی ہے لیکن بسا اوقات فریق ثانی بھی بازی مار جاتا ہے۔

جیل سے فرار کے واقعات دنیا بھر میں ہوتے رہتے ہیں۔ بعض مشہور اور دلچسپ واقعات کا یہاں ذکر کرتے ہیں جو کہ دنیا بھر میں مشہور ہوئے۔ واضح رہے جنگی قیدی عام قیدیوں سے الگ ہوتے ہیں انہیں جرائم پیشہ افراد میں شمار نہیں کیا جاتا۔

سزا ہو گئی۔

سلاو میر راویز

سلاو میر راویز پولینڈ کا فوجی تھا جو دوسری جنگ عظیم میں روسی فوجیوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا تھا۔ جنگ کی ابتدا میں چوں کہ روس، جرمنی کا اتحادی تھا اس لئے راویز کو قیدی بنا کر سرودھنم کے نام سے مشہور سائبریا کے گولامک فوجی کیمپ بھیج دیا گیا۔ 9 اپریل 1941ء کو سائبریا میں برفانی طوفان آ گیا۔ راویز اور دیگر سات قیدی طوفان کا فائدہ اٹھاتے ہوئے فرار ہو گئے۔ خراب موسم کے باعث محافظوں نے ان کا پیچھا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ راستے میں ان کی ملاقات پولینڈ سے تعلق رکھنے والی 17 سالہ مفرد لڑکی کرشننا سے ہوئی، جو ان کے قافلے کے ساتھ شامل ہو گئی۔

آٹھ مفردوں پر مشتمل اس قافلے نے 9 دنوں میں دریائے لینا پار کیا اور تحصیل بیکال کے کنارے کنارے سفر کرتے ہوئے یہ لوگ منگولیا کی سرحد تک پہنچ گئے۔ خوش قسمتی سے انہیں تمام راستے بھر دو اور تیس لوگ ملے جنہوں نے ان کی بہت مدد کی۔ صحرائے گوبی پار کرتے ہوئے بھوک اور پیاس سے نڈھال کرشننا اور میکوونکی نامی مفرد قیدی کی موت واقع ہو گئی جبکہ دوسروں نے سانپ اور کیتڑے کھا کر خود کو موت کے منہ میں جانے سے بچا۔ اکتوبر 1941ء میں چھ افراد پر مشتمل یہ قافلہ تبت پہنچا۔ سردیوں کے موسم کے وسط میں انہوں نے ہمالیہ کا علاقہ پار کیا۔ اس دوران ان کا ایک ساتھی سردی کی شدت سے مر گیا اور دوسرا گھری کھائی میں مر گیا۔

بالآخر مارچ 1942ء کو 4 ہزار میل کا فاصلہ طے کر کے راویز اور اس کے تین ساتھی انڈیا پہنچنے میں کامیاب ہو گئے جہاں انگریز سرکار نے انہیں اپنی حفاظت میں لے

قید کے دوران اس نے باہر کے کسی آدمی کی مدد سے ایک سرخ حاصل کی اور اپنے بازو سے خون نکال کر منہ میں ڈال دیا۔ پھر سب کے سامنے تڑپتے ہوئے اپنے منہ میں ڈالا ہوا خون اٹھنے لگا۔ چارلس نے نقاہت بھری آواز میں گارڈ سے کہا کہ اس کا پرانا السر بگڑ گیا ہے۔ جیل انتظامیہ نے اسے فوراً ہسپتال پہنچایا۔ اس نے کمرے میں تعینات محافظ کو نشہ آور چیز کھلا کر بے ہوش کر دیا اور وہاں سے فرار ہو کر ایران کے راستے ترکی جا پہنچا، جہاں استنبول میں اس کا چھوٹا بھائی اینڈریس رہتا تھا۔

دونوں بھائیوں نے ترکی اور یونان میں سیاحوں کو لوٹنے کا کام شروع کر دیا۔ کچھ عرصے بعد یہ دونوں یونان کی پولیس کے ہتھ جوڑے گئے۔ چارلس نے فوری طور پر اپنے ذہن میں ایک منصوبہ ترتیب دیا جس کے تحت دونوں بھائیوں کو اپنا نام ایک دوسرے سے تبدیل کرنا تھا۔ اینڈریس کا پہلے سے کوئی جرمانہ گارڈ موجود نہیں تھا، اس لئے چارلس، اینڈریس بن کر چند ہفتوں میں چھوٹ جاتا اور پھر چارلس کے یونان کی سرحد پار کرنے کے بعد اینڈریس جیل انتظامیہ کو بتاتا کہ انہوں نے غلط آدمی کو چھوڑا ہے۔ اصل اینڈریس وہ خود ہے۔ اس طرح اینڈریس کو بھی زیادہ سزا نہ ہوئی۔

جب منصوبہ پر عمل شروع ہوا تو پولیس کو شک ہوا اور اس نے کسی قسم کی نگرانی و پے بغیر دونوں کو جیل بھجوا دیا۔ اپنا منصوبہ ناکام دیکھ کر چارلس نے جیل سے فرار کا اپنا پرانا نسخہ آزمایا۔ وہ ایک بار پھر سے بیمار پڑ گیا، جب پولیس دین میں اسے ہسپتال پہنچایا جا رہا تھا تو راستے میں موقع ملے ہی وہ فرار ہو گیا۔ کچھ دنوں بعد اینڈریس جیل وارڈن کے پاس گیا اور اسے بتایا کہ وہ چارلس نہیں بلکہ اینڈریس ہے۔ وارڈن غصے میں آ گیا اور اینڈریس کو ہار کرنے کے بجائے ترکی کی حکومت کے حوالے کر دیا جہاں اسے چوری، ڈکیتی اور دیگر جرائم میں 18 سال کی

قید سے فرار زندگی سے رہائی کا سبب بن گیا

ویت نام کی جنگ کے دوران ۱۰ سالہ ویت نامی گوریلوں کے حامی کمیونسٹوں کے خلاف امریکی آپریشن کیا گیا۔ یکم فروری 1956ء کو امریکہ کے نینل پائلٹ لیٹننٹ ڈیٹر ڈنگلر (Deiter Dengler) کے جہاز کو اپنی انٹرکرافٹ گمن سے نشانہ بنایا گیا۔ ڈنگلر کو اپنا جہاز ہنگامی طور پر لاؤس کے جنگلات میں اتارنا پڑا جہاں اُسے کمیونسٹ گوریلوں نے قیدی بنا لیا۔ ڈنگلر کو ہاتھ لاؤٹائی کمپ میں چھ ماہ تک تشدد کا نشانہ بنایا جاتا رہا۔ بعد ازاں اُسے پارکنگ نامی گاؤں کے فوجی کمپ لے جایا گیا جہاں پہلے سے دو امریکی، تین تھائی اور ایک چینی باشندہ قید تھے۔ ان قیدیوں میں سوائے ایک امریکی قیدی ڈیوئی ڈبلیو مارش کے باقی سب سویلین تھے، جو امریکہ کے ملازم تھے۔ مارش امریکی ایئر فورس میں بمبلی کا پٹر پائلٹ تھا جسے شمالی ویت نام سے گرفتار کیا گیا تھا۔ یہ تمام قیدی گزشتہ ڈھائی سال سے گوریلوں کے قیدی تھے، ڈنگلر نے انہیں اپنے ساتھ فرار پر آمادہ کیا۔

بانی مشاورت سے طے پایا کہ فرار کے لئے مون سون کا انتظار کیا جائے تاکہ فرار کے دوران پانی کی قلت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ انہیں شہتیر کے بنے جمونپڑی نما قید خانے میں بند کیا گیا تھا۔ پروگرام کے تحت انہوں نے جمونپڑی کے اندر سے شہتیروں کے بند ڈھیلے کرنے شروع کر دیے۔ 29 جون 1966ء کو جب محافظ کھانے میں مصروف تھے، وہ آہستگی سے جمونپڑی سے باہر نکلے اور محافظوں کے اسلحے پر قبضہ کر لیا۔ یہ سات قیدی تین گروپوں میں مختلف سمتوں میں فرار ہوئے۔ ڈنگلر کے ساتھ مارش تھا۔ دونوں کئی دن بھوکے پیٹ جنگلوں میں بھٹکتے رہے۔ اس دوران مارش کو طعیر یا ہو گیا۔ بیماری اور

نیا۔ اس واقعے پر 1956ء میں رولینڈ ڈاونک نے The Long Walk کے نام سے ایک کتاب لکھی جس پر 2010ء میں ہولی وڈ نے The Way Back کے نام سے فلم بنائی۔ اس واقعے کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ روس کی حکومت نے راویز کے فرار کی کہانی جھوٹی قرار دیتے ہوئے دعویٰ کیا کہ روسی حکومت نے اسے خود 1942ء میں رہا کر کے ایران بھیج دیا تھا۔

الکیزاز جیل سے فرار کا واقعہ معمر بن گیا

امریکی ریاست کیلیفورنیا کے شہر سان فرانسسکو کے ساحل سے ڈیڑھ میل دور الکیزاز (Alcatraz) جزیرے پر قائم جیل سے اب تک 36 قیدی فرار ہونے کی کوششیں کر چکے ہیں۔ ان میں دو قیدی ایسے بھی تھے جنہوں نے فرار کے لئے دو بار قسمت آزمائی کی لیکن دونوں مرتبہ وہ ناکام رہے۔ فرار کی کوشش کرنے والے دیگر قیدیوں میں 23 قیدی فرار کے دوران پکڑ لئے گئے اور 6 محافظوں کی گولیوں کا نشانہ بنے۔ تاہم 3 قیدی فریک مورس، جیکیرنس ہنگلین اور جون ہنگلین 11 جون 1962ء کو اس جزیرے سے ایسے فرار ہوئے کہ ان کا آج تک پتہ نہ چل سکا کہ وہ زندہ بھی ہیں یا مر گئے ہیں۔ آج بھی ان کے نام ایف بی آئی کی مطلوب افراد کی فہرست میں شامل ہیں۔

غالب گمان یہ ہے کہ یہ تینوں مغرور قیدی فرار کے دوران سمندر میں ڈوب گئے ہوں گے تاہم تلاش کی متعدد کوششوں کے بعد بھی ان کی لاشوں کا پتہ نہ چل سکا۔ ان کے فرار کا یہ واقعہ اب تک معمر بنا ہوا ہے۔ اس واقعے نے اتنی شہرت حاصل کی کہ 1979ء میں اس پر ہالی وڈ نے "اسکیپ فرام الکیزاز" کے نام سے ایک فلم بنائی، جس میں فریک مورس کا مرکزی کردار اداکار کلیٹ ایسٹ وڈ نے ادا کیا۔

کے علاقے فتح گڑھ کے فوجی کیمپ پہنچایا گیا جہاں سے وہ 17 ستمبر 1972ء کی شام فرار ہو گئے اور تین ہفتوں تک چھپتے چھپاتے پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ ان قیدیوں میں شامل راجا نادر پرویز بعد ازاں مسلم لیگ میں شامل ہو کر متعدد وزارتوں پر فائز رہے۔

قید کے دوران ان قیدیوں نے فرار کے متعدد منصوبوں پر غور کرنے کے بعد بالآخر سرگم کے ذریعے فرار ہونے پر اتفاق کیا۔ باورچی خانے میں استعمال ہونے والے ایک چھری اور ناخن تراش کی مدد سے انہوں نے 150 فٹ لمبی سرنگ بنائی۔ زمین کھودتے وقت انہیں سانپوں اور بچھوؤں سے بھی واسطہ پڑا لیکن انہوں نے اپنا کام جاری رکھا۔ بالآخر 17 ستمبر کی شام وہ اس سرنگ کے راستے فتح گڑھ کے فوجی کیمپ سے فرار ہو کر ایک کشتی کے ذریعے ممبئی پہنچے اور پھر وہاں سے وہ پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس دوران متعدد بار انڈین سکیورٹی فورسز کے ساتھ ان کا سامنا ہوتے ہوئے رہ گیا۔

نوٹ:- اس فرار کی مکمل داستان ماہنامہ "حکایت" کی کتاب "فتح گڑھ سے فرار" میں ملاحظہ فرمائیں۔ اس کے راوی کیپٹن نور احمد قائم خانی ہیں۔

قندھار کی جیل سے فرار

24 اپریل 2011ء کو قندھار کی جیل سے 470 سے زیادہ قیدی 320 کیمپ لمبی سرنگ بنا کر فرار ہو گئے۔ فرار ہونے والے قیدیوں میں 100 کے قریب سرکردہ طالبان کمانڈر اور باقی طالبان جنگجو تھے۔ قیدیوں کو سرنگ بنانے میں پانچ ماہ کا عرصہ لگا۔ واضح رہے کہ جون 2008ء میں ایک خودکش حملہ آور نے اسی جیل کے گیٹ کے باہر دھماکا کر کے گیٹ اور قریبی پولیس چوکی تباہ کر دی تھی۔ اس واقعے میں 900 قیدی فرار ہوئے تھے۔



بھوک کے باعث مارٹن نے مشورہ دیا کہ قریبی گاؤں سے مدد اور کھانا حاصل کیا جائے۔ ڈینگر نے منع کیا لیکن مارٹن نہ مانا اور گاؤں میں داخل ہو گیا۔ گاؤں والوں نے اسے دیکھتے ہی "امریکی امریکی" کا شور مچا کر اسے ہلاک کر دیا۔ ڈینگر بڑی مشکل سے اپنی جان بچا کر وہاں سے فرار ہوا۔

ڈینگر اور تھائی باشندہ پیسڈھی انڈرا دات (Pisidhi Indrada) کے علاوہ دوسرے چار مفروروں کے بارے میں کچھ پتا نہ چل سکا ان کے ساتھ کیا گزرائی۔ اسی چینی قیدی اپنے امریکی اور تھائی ساتھیوں کے ساتھ نکلا تھا، دوسرے ہی دن وہ اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گیا۔ 33 دن جنگل میں اکیلے بھٹکنے کے بعد وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں دوبارہ کمیونسٹ گوریلوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا۔ بعد ازاں اسے ایک امدادی کارروائی کے ذریعے گوریلوں کی قید سے آزاد کرا لیا گیا۔ ڈینگر واحد قیدی تھا، جو جنگل میں رہ رہے کیمڑوں اور کمیونسٹ گوریلوں سے بچتا بچتا بھوک کی حالت میں مسلسل 23 دنوں تک بھاگتا رہا بالآخر 20 جولائی کو نئے ایک امریکی ہیلی کاپٹر کی مدد سے جنگل سے نکالا گیا۔ اس واقعے پر 2007ء میں ہولی وڈ میں Rescued Dawn کے نام سے فلم بنی جس میں ڈینگر کا کردار Christian Bale نے ادا کیا۔

بھارتی قید خانے سے پاکستانی فوجیوں کا فرار

1971ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران سکس پنجاب رجمنٹ سے تعلق رکھنے والے چھ پاکستانی فوجی میجر طارق پرویز، لیفٹیننٹ شاہد آغا جان، لیفٹیننٹ شہناز جاوید، لیفٹیننٹ جمیل، کیپٹن نور اے کیو خان اور میجر راجا نادر پرویز بھارتی فوج کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے۔ ان قیدیوں کو ریل گاڑی کے ذریعے اتر پردیش

میاں کا امید

اردو ادب کے ممتاز ایدب ممتاز مفتی نے یہ افسانہ ”اُخروٹ، جھاڑو، خسر“ کے نام سے لکھا تھا۔ ہم قارئین ”حکایت“ کی نذر کر رہے ہیں

☆ ممتاز مفتی



ہیں۔

میں نے جواب دیا۔ ”بالکل پر دور ہی سے چھپتے ہیں۔ پاس جاؤ تو پتہ چلتا ہے کہ گوند سے لگائے ہوئے ہیں، اصل کی نہیں۔“

”میں نہیں مانتی۔“ عطیہ نے کہا پھر انجم سے مخاطب ہو کر بولی۔ ”تو نہیں بولتی انجم؟“ انجم مسکرا دی، منہ سے کچھ نہ بولی۔

”یہ نہیں بولیں گی۔“ سنبل نے کہا۔ ”انہیں تو چپ کی ہے۔“

”یہ نہیں، اس چپ کے نیچے کتنے بڑے ہم کا گولا چھپائے ہوئے ہے۔“ عطیہ نے کہا۔

”اس کی بات کا تو چہ چا گھر گھر ہوتا رہا تھا مبینوں۔“ سسلنی بولی۔ ”اور کیوں نہ ہوتا، بات ہی ایسی تھی۔“

”ہاں بالکل۔“ عطیہ سنجیدہ ہو گئی۔ ”جب ماں باپ زبردستی اسے اونٹ کے گلے میں باندھنے لگے تھے تو اس نلی نے اس قدر شن شن کیا تھا کہ سارے محلے میں آواز گونجی تھی۔“

”ہاں۔“ میں نے کہا۔ ”بھی کہتے تھے کہ یہ ناؤ جو اس تو رڈول رہی ہے، کنارے نہیں لگے گی۔“

”اور جسے کنارے لگ گئی۔“ عطیہ نے کہا۔ ”تو کہنے لگے نیچے کی ہیں۔“

”ہاں سبھی کہتے تھے، چھینے اڑیں گے۔“ سنبل مدح آمیز آواز میں بولی۔

”ہے۔“ سسلنی نے چھاتی پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”پھر ایسی بھی ایسی بھی کہ سبحان اللہ، دنیا حیران رہ گئی۔“

”کہتے تھے، مثالی جوزی ہے۔“ سنبل بولی۔

”ہاں۔“ میں نے کہا۔ ”لوگ کہتے تھے کہ انجم نے گھر نہیں، جنت بسائی ہے۔“

”پھر پتہ نہیں، اس جنت میں کون شیطان آ

نہیں، اس روز میاں پر بات کیسے چل نکلی ورنہ چہتہ غور میں مل بیٹھیں تو میاں پر بات نہیں کرتیں۔ باتوں باتوں میں کوئی اپنے میاں کی نندا کر دے تو اور بات ہے اور کوئی جب بھی کرے گی نندا ہی کرے گی، میاں کے ساتھ بیٹے ہوئے بیٹھے لمحوں کا ذکر کوئی نہیں کرتی۔ مجھے یاد نہیں، کس نے بات پھینچی تھی۔ عطیہ جواب میں بولی۔ ”میاں بھی اللہ نے کیا شے بنائی ہے۔“ بات میں حیرت کم تھی، تسخیر زیادہ۔

اس پر سسلنی بولی۔ ”دس سال ہو گئے ہیں اسنے رجتے ہوئے، پر میں نے آج تک اپنے میاں کا بھید نہیں پایا۔“

”کس نے پایا ہے۔“ انجم نے زیر لب کہا۔ سسلنی ہنسی۔ ”میرا میاں تو اخروٹ کی طرح ہے۔ کاغذی نہیں، جنگلی اخروٹ۔ سخت چھلکا ہی چھلکا جو توڑے سے نہیں ٹوٹتا۔ کسی وقت بلاوجہ آپ ہی آپ ٹوٹتا ہے اور پھر نرم مٹھی مٹھی گری۔“ اس پر گویا ساری کہانیاں چٹک کر نکلیں۔

عطیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اس مخلوق کا میں جواب نہیں۔ ہر دانے کا اپنا ہی سواد ہوتا ہے، ایک سے دوسرا نہیں ملتا۔ اللہ نے اپنے رنگ میں بنایا ہے۔ وحدہ لا شریک۔“

سنبل گھبرا کر بولی۔ ”ہے میرے میاں تو اتنے اچھے ہیں، اتنے اچھے کہ کیا بتاؤں۔“

سسلنی نے کہا۔ ”سنبل! تیری بات اور ہے۔ شادی کو ابھی چھ مہینے ہوئے ہیں، وہ ابھی میاں نہیں بنا۔ ابھی تو وہ محبت کے چو لھے پر چڑھا ہوا ہو گا۔ یہ دیکھ تو دو ایک سال بعد تیار ہوتی ہے۔“

میں قبچہہ مار کر ہنسی تو عطیہ بولی۔ ”موی! تیرا میاں تو پہلے ہی روز سے ریڈی میڈ میاں تھا۔ وہ تو جہاں چاہا ہے۔ منہ پر اتنے نوکیلے کانٹے ہیں کہ دور ہی سے چھپتے

انجی کو دیتے۔ انجی میں جھجک قطعی طور پر نہ تھی۔ بات کرتے ہوئے نہ ڈرتی تھی، نہ شرماتی تھی، نہ جنتی سنورتی تھی، نہ خزا کرتی تھی۔ رومان پسند بھی نہ تھی۔

دو تین لڑکے اُس کی جانب نرمی طرح مائل تھے لیکن انجی نے انہیں کبھی منہ نہ لگایا تھا۔ جب ہم چھٹی کے وقت گھر آتیں تو ایک لڑکا کالج کے دروازے پر اس کے انتظار میں کھڑا ہوتا۔ اس کا نام کامران تھا۔ خوش شکل تھا، شوخ تھا اور بہت دلیر تھا۔ غالباً کسی بڑے افسر کا بیٹا تھا۔ ذرا نہ بھگتا۔ ”ہیلو انجی!“ وہ مسکراتا۔

”ہیلو“۔ انجی کامران کی طرف دیکھے بغیر جواب دیتی۔

”آؤ، میں تمہیں سونے کا کنگن پر گھر چھوڑ آؤں، بیٹھ جاؤ دونوں ہی۔“ وہ کہتا۔

”ہمیں پیدل چنے سے دلچسپی ہے۔“ وہ بے نیازی سے کہتی۔

”وقت بچ جائے گا۔“ کامران کہتا۔

وہ رک جاتی، بھرپور نگاہ سے کامران کی طرف دیکھتی۔ ”کیوں اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔ کسی پھل دار شہنی کو جھلاتے مسٹر کے انگوٹھ گرے۔ ٹیکر سے کچھ نہیں گرے گا۔ یہ ٹیکر“ وہ پھل پڑتی۔

چھپے سے آواز آتی۔ ”ہمیں تو ٹیکر پسند ہیں۔“

بی اے کے امتحان کے بعد ایک روز میں اُس کے گھر گئی تو اُس کی مئی انجم کی شادی کی بات کر رہی تھیں۔ میں نے پوچھا۔ ”کیوں آنٹی! انجم کی شادی کر رہی ہیں آپ؟“

وہ بولیں۔ ”ہاں! اگلے مہینے، انجم کے ڈیڈی نے فیصلہ کر دیا ہے۔“ اُن کے گھر میں انجم کے ڈیڈی کا فیصلہ پتھر کی ٹیکر ہو جاتا تھا۔ کسی کی جرأت نہ تھی کہ اُن سے کیوں، کس لئے پوچھے۔ وہ دو دروازے چار قسم کے باپ تھے رنارڈ ڈاؤری افسر تھے شاید اس لئے۔

گھسا۔ عطیہ نے ہاتھ چلا کر کہا۔ ”دفعۃً میاں نے طلاق بھیج دی اور اس اللہ کی بندی نے بھی بھید نہیں کھولا آج تک۔“

”دیکھو تو مسکرا رہی ہے پر منہ سے نہیں بولتی۔“ سلی نے انجم کی طرف اشارہ کیا۔

”اتنا ہی بتا دے کہ ہوا کیا تھا؟“ عطیہ بولی۔

”پتہ ہو تو بتا دوں۔“ انجم کی مدھم آواز آئی۔

”میں نہیں مانتی۔“ عطیہ نے کہا۔ ”کہ اسے پتہ نہ ہو۔“

”خود ہی تو کہہ رہی تھی کہ میاں کا بھید کسی نے نہیں پایا۔“ انجم بولی۔

”کیوں موی! تجھے تو پتہ ہو گا؟“ سلی نے کہا۔

”تم دونوں تو جانی تھیں اک دو بے کی۔“

”وہ تو ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”پر میاں کے بھید کون کسی سے کھلتی ہے۔“ سب قہقہہ مار کر خنس پڑیں۔



سلی سچ کہتی تھی۔ انجم اور میں جانی سہیلیاں تھیں۔ کالج میں بھی انہیں پڑھائی کرتی تھیں۔ ان دونوں میں اُسے انجی کہہ کر پاپا کرتی تھی۔ کالج میں وہ اتنی چلی تھی کہ میڈموں کو چوبی تھی۔ وہ اسے چڑ کر انجن کہا کرتی تھیں۔ آرام سے بیٹھنا اُسے عیب نہ تھا۔ اندر مدھانی چلتی رہتی تھی۔ ہر وقت سوڑے کی بو کی طرف بلبلے، ابھی گراؤنڈ میں جا ٹنگ کر رہی ہے۔ پھر جو دیکھا تو درخت کی شہنی سے لٹکی جھول رہی ہے۔ کلاس میں تبھی تبھی سنی مارو جتی۔ میڈم کہتی۔ ”انجن چلنے کو ہے کیا؟“

فٹ اٹھ کر کہتی۔ ”میڈم انجن میں تو کوئلہ ہی نہیں۔“

میڈم کہتی۔ ”یہ انجن کوئلے کے بغیر چلتا ہے۔“

شرارتوں میں سب سے پہلے پڑھائی میں فرسٹ ڈویژن، ڈیپٹ میں اول رہتی۔ ذرا اما ہوتا تو میل پارٹ

یہاں آئی تو پتہ چلا کہ انجی کو طلاق ہو چکی ہے اور اسکول میں پڑھاتی ہے۔ انجی سے ملی تو حیران رہ گئی۔ اب انجم وہ انجی نہ تھی، نہ وہ تیزی نہ شوخی جیسے آگ پانی میں بدل چکی ہو۔ یہ تبدیلی دیکھ کر میں تو حیران رہ گئی۔ میں نے کئی بار انجی سے پوچھا کہ کیا ہوا تھا؟ وہ مسکرا کر کہتی۔ ”موی! ہوئی تھی، ہو گئی۔“

اب ہم اکثر ملا کرتی ہیں۔ ہمارے بچے مل کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ دو بچے انجی کے ہیں، دو میرے۔ میرے سوا بھی انجم کے بڑے مداح ہیں۔ بڑا اچھا وقت کٹ رہا ہے۔

”دو چاروں کی بات ہے۔“ میں نے انجم سے کہا۔ ”چلو بچوں کو مری لے چلیں، دو ایک دن وہاں پکنک کریں گے۔“ وہ مان گئی۔ میرے میاں نے سارا انتظام کر دیا لیکن خود ساتھ نہ جاسکے۔

ایک رات مری میں ہم دونوں جاگ رہی تھیں۔ بچے سوئے ہوئے تھے۔ موسم بڑا خوشگوار تھا۔ چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ انجم بڑی خوش خوش نظر آ رہی تھی۔

آپ ہی آپ بولی۔ ”موی! احسن اور میں کئی بار یہاں آئے تھے۔ اسی ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرا کرتے تھے۔“

پہلی مرتبہ اس نے مجھ سے احسن کی بات کی تھی۔ مجھے موقع مل گیا۔ میں نے پوچھا۔ ”انجی! احسن کیسا آدمی تھا؟“

وہ خواب آلود لہجہ میں بولی۔ ”وہ خس کی طرح تھا موی، خوشبو ہی خوشبو۔ مدھم خوشبو۔ جتنا پیار مجھے احسن نے دیا، کسی اور نے نہیں دیا تھا۔“

میں یہ سن کر حیران رہ گئی۔ ”پر تو تو اس سے بیاہ کرنا نہیں چاہتی تھی۔“ میں نے کہا۔

”نہیں چاہتی تھی۔“ وہ بولی۔ ”احسن کو بھی پتہ تھا کہ میں نہیں چاہتی تھی پر اس نے یہ بات کبھی جتنی نہیں۔“

ایک روز انجی مجھ سے ملی۔ ”بھئی بھئی تھی۔ میں نے پوچھا۔“ کیا ہوا؟“

”کہنے لگی۔“ ڈیڈی سے بات ہوئی، میں نے کہا ڈیڈی! میں شادی نہیں کروں گی۔“

بولے۔ ”تو شادی کرے گی اور احسن ہی سے کرے گی۔ ہم نے تیرے لئے بہت سوزوں رشتہ تلاش کیا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”ڈیڈی! آپ مجھے مجبور کریں گے تو میں گھر چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔“ انہوں نے کہا۔

”دیکھ انجم! تو میری بیٹی ہے اور میں تیری پور پور سے واقف ہوں، مجھے پتہ ہے کہ تو گھر چھوڑ کر نہیں جائے گی۔“ انجی کی باتیں سن کر میں نوڈرنگی۔ مجھے بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ انجم کے ڈیڈی نے احسن سے اس کی شادی کیوں ملے کی۔ میں نے احسن کو دو ایک بار ان کے گھر میں دیکھا تھا، وہ افسر تھا، امیر گھرانے سے تھا، بھلاڑ تھا، مدھم طبیعت کا مالک تھا، پہلی بیوی فوت ہو چکی تھی اور نہ پندرہ سال بڑا تھا اور بالکل ہواکش نہیں تھا، پتہ نہیں، اس کے ڈیڈی نے انجم کے لئے احسن کو کیوں چنا تھا۔

انجی کہنے لگی۔ ”موی! کسی طرح کا سران کا پتہ لگاؤ میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔“

کامران کا پتہ مجھے آسانی سے لگ گیا۔ اس کی ایک کزن کالج میں پڑھتی تھی تا۔ پتہ چلا کہ کامران کے باپ کو ہارٹ ایک ہو گیا تھا اور وہ باپ کو لے کر لندن گیا ہوا ہے۔ جب انجی کو اس بات کا پتہ چلا تو وہ بالکل ہی الجھ گئی۔ انہی دنوں میرے ابا کا تبادلہ ہو گیا اور ہم کراچی چلے گئے۔ وہاں میں نے سنا کہ انجی کی شادی احسن سے ہو گئی ہے۔ پھر میری شادی بھی ہو گئی اور ہم دونوں ایک دوسرے سے بالکل کٹ گئیں۔



بیس سال بعد میرے میاں کا تبادلہ پنڈی ہو گیا۔

ضروری بات کہنی ہے۔ میں نے کھڑکی کھلی، وہ پوچھے بغیر کھڑکی پھلانگ کر اندر آ گیا۔ کہنے لگا، آپ نے نئے بلایا تھا کیا؟ ہاں بلایا تھا میں نے کہا، لیکن آپ بہت دیر کے بعد آئے۔ پھر وہ اپنے ڈیڑی کے ہارٹ انیک کا قصہ سناتا رہا اس کے بعد یونیورسٹی کے قصبے چل پڑے۔ باتوں باتوں میں دس بج گئے اور مجھے پتہ ہی نہ چلا۔ پھر دفعتاً اندر کا دروازہ بجا۔ "کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"دروازہ کھول۔" ماں کی غصے بھری آواز آئی۔ آواز سن کر میں گھبرا گئی۔ "پتہ نہیں، یہ بڑھیا کیا فساد مچائے۔ اس قدر گھبرائی تھی میں اس وقت کہ زندگی کی سب سے بڑی غلطی کر بیٹھی۔ کمرے میں ایک قد آدم الماری کھڑی تھی۔ میں نے کامران کو الماری میں چھپا دیا۔ دروازہ کھولا تو بڑھیا بڑے غیظ و غضب میں تھی۔ آتے ہی اس نے کمرے کی تلاشی مینی شروع کر دی پھر آواز بلند ہوئی۔ "یہیں ہو گا کہیں، میں نے خود اسے کھڑکی سے نندہ آتے دیکھا تھا۔" دفعتاً میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھ سے بات نہیں کر رہی ہے۔ میں نے مڑ کر دیکھا، دروازے میں حسن کھڑے تھے۔ میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ ضرور اس الماری میں چھپا ہو گا۔" بڑھیا چلائی۔ "میں دیکھتا ہوں، احسن آگے بڑھے۔"

"میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ یا اللہ تو ہی میری عزت رکھنے والا ہے۔ ایک طویل خاموشی چھائی رہی۔ میں یوں محسوس کر رہی تھی جیسے کچہری میں کھڑی جج کے فیصلے کا انتظار کر رہی ہوں۔"

"تو یہ ہے۔" میں جذبات کی شدت سے چلائی لیکن حلق میں آواز نہ تھی۔

دیر تک انہی چپ چاپ بیٹھی رہی پھر چونک کر

کہی نہیں۔ اس نے مجھ پر کبھی کوئی پابندی نہیں لگائی، مجھے یوں رکھا جیسے گل دان میں پھول سجاتے ہیں۔ وہ رک گئی پھر آپ ہی بولی۔ "گھر میں ہم تین تھے۔ احسن، اس کی ماں اور میں۔ اسے ڈرتا تھا کہ کہیں ماں ساس بن کر حکم نہ چلائے اس لئے اس نے ماں کے لئے ایک علیحدہ نوکرائی رکھ لی تھی۔ ماں بہت بوڑھی تھی، زیادہ چل پھر نہیں سکتی تھی۔ احسن نے ماں کو گھر کے ایک طرف کمرہ دے رکھا تھا۔"

"کیسے مزاج کی تھی وہ؟" میں نے پوچھا۔

"جلی کٹی ہوئی بڑھیا۔ مجھے یوں دیکھتی تھی جیسے قصائی بکرے کی طرف دیکھتا ہے۔ میرا خیال ہے، احسن نے ماں سے کہہ رکھا تھا کہ انہی کو رہے وہ جیسے وہ رہتی ہے۔ نکل نہ ہوتا۔"

"پھر وہ کیا بات ہوئی کہ اس نے آٹھ سال بعد ملائی دے دی۔"

"کوئی بات بھی نہیں ہوئی تھی۔" وہ بولی۔

"آخر میں وہ تو ہوگی؟"

"مجھے نہیں پتہ۔" اس نے جواب دیا۔ "تیری قسم۔"

"اچھا، یہ بتا کامران ملا تھا کبھی؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔" وہ بولی۔ "ملا تھا۔"

"کب؟"

"شادی کے ایک مہینے بعد۔" اُف۔ اس نے ایک لمبی سانس لی۔ "اس روز میں نے زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی تھی۔ وہ رک گئی پھر بولی۔ "اس روز احسن دورے پر گئے ہوئے تھے۔ گھر میں ماں اور میں اکیلے تھے۔ شام کے آٹھ بجے تھے، میں اسٹڈی میں بیٹھی پڑھ رہی تھی کہ کھڑکی سے مارچ کی لائٹ مجھ پر پڑی، اٹھ کر دیکھا، باہر کامران کھڑا تھا۔ کہنے لگا، مجھے آگے بڑھو، آگے بڑھو، آگے بڑھو۔"

تہوار اوبہم تھا۔

”اس پر بڑھاپا غصے میں غرائی لیکن احسن نے مجھ سے کہا۔ انہم مجھے کافی کا ایک پیالہ بنا دو، میں بہت تھک گیا ہوں، یہ کہہ کر وہ ہم دونوں کو ڈائننگ روم میں لے گئے۔“

”لیکن، لیکن۔“ میں نے پوچھا۔ ”کیا کامران تیرے میاں کو نظر نہیں آیا تھا.....؟“

”مجھے نہیں پتہ۔“ وہ بولی۔ ”اُس واقعے کے بعد میں کئی دن سن رہی لیکن احسن کا رویہ ایسا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ احسن کی اس بات نے مجھے دل و جان سے اس کی باندی بنا دیا۔ اس کے بعد آٹھ سال احسن اور میں نے اسٹے گزارے۔“

”پھر احسن نے کبھی وہ بات نہ کی؟“ میں نے پوچھا۔

”بالکل نہیں۔ کبھی اشارتا بھی اس کا ذکر نہیں کیا۔“ وہ بولی۔ ”یوں جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔“

”تو پھر احسن نے کامران کو نہیں دیکھا۔“ میں نے کہا۔

”ہاں۔“ وہ بولی۔ ”میرے دل میں بھی یہ خیال آیا تھا۔“

”مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ میں نے کہا۔

”غالبا اُس نے میری بات نہیں سنی، وہ خواب آلود انداز میں کہنے لگی۔ ”سوی! تجھے پتہ نہیں، میری زندگی میں ایک عجیب بات ہے، ایک نہ اسرار طاقت۔“

”پھر؟“ میں نے بے تابی سے پوچھا۔

”وہ ہماری آخری بات تھی سوی! انہی نے آہ بھر کر کہا۔ ”میری بات سن کر جواب دیئے بغیر وہ اٹھ کر دوسرے پر چلے گئے اور چار دن بعد مجھے ایک رجسٹری موصول ہوئی کھولا تو اندر طلاق نامہ تھا۔“

تم بہت بوڑھے ہو گئے ہو جبکہ میں بالکل
جوان ہوں، میرے بھی جذبات ہیں، اس لئے اب تم صبر کرو، حوصلے سے
کام نواور شور نہ مچایا کرو اور سن لو کہ مجھے تمہارے شور کی پروا بھی نہیں ہے۔

یو ایف سیٹ



☆ ڈاکٹر عبدالغنی فاروق

شہباز ہمارے علاقے کا بادشاہ تھا۔ عام لوگوں کے مقابلے میں اس کی وہی حیثیت تھی جو کوؤں اور چڑیوں کے مقابلے میں شہباز کی ہو سکتی ہے۔ وہ پارعب شخصیت کا حامل تھا۔ فراخ چہرہ، بڑی بڑی روشن آنکھیں، گھنے آبرو، بھاری مونچھیں اور پاٹ دار آواز۔ وہ رانا کے مقابلے میں اس کی وہی حیثیت تھی جو کوؤں اور چڑیوں کے مقابلے میں شہباز کی ہو سکتی ہے۔ وہ پارعب شخصیت کا حامل تھا۔ فراخ چہرہ، بڑی بڑی روشن آنکھیں، گھنے آبرو، بھاری مونچھیں اور پاٹ دار آواز۔ وہ

سڑک کے کنارے واقع اپنی حویلی میں کسی مزارع یا ملازم کی لڑکی کے ساتھ تعلق رکھتا تھا، تو پھر تک اس کی ایک ایک بات کی کرج صاف سنائی دیتی تھی۔ اس کے آواز اجداد نے نہایت نازک حالات میں انگریزوں کے اقتدار کو استحکام بخشنے کے لئے غیر معمولی خدمات انجام دی تھیں جس کے

قیتمے لگاتے اور وہ لہک لہک کر جتنی انداز میں ہنستا چلا جاتا۔

”حاضرین!“ تبصرہ کرتے۔ ”رانا شہباز نر آدی ہے، وہ ہمارا بادشاہ ہے، وہ ہمارا راجہ ہے۔“

رانا شہباز کی خاص خوبی یہ تھی کہ وہ عام لوگوں اور غریب غرباء کے بہت کام آتا تھا۔ علاقے میں چوریاں عام تھیں اور بعض اوقات غریب لوگوں کی بمینیں غائب کر دی جاتی تھیں۔ ایسے موقعوں پر رانا لوگوں کے بہت کام آتا تھا اور اپنے اثر و رسوخ سے چوروں اور ڈاکوؤں کو پکڑا دیتا اور مال مسروقہ بازیاب کرا دیتا تھا۔ اکثر لوگوں کا گمان یہ تھا کہ دراصل چوریاں رانا کے اپنے پالتو آدی کرتے ہیں اور اس کی آشر باد سے کرتے ہیں۔ اس طرح رانا شہباز کا عمل بہت شاعر کے اس قول کے مطابق تھا جس نے ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا۔

رانا شہباز انگریزوں سے بڑھ کر انگریز تھا۔ فرق یہ تھا کہ انگریز جیسے بھی تھے مگر اپنے مذہب کے لئے گہرا تعصب رکھتے تھے۔ اتوار کو لازماً گرجے میں حاضری دیتے تھے۔ انہوں نے جتنے تعلیمی ادارے یعنی سکول اور کالج قائم کئے، ان میں ایک شاندار گرجا لازماً موجود ہوتا تھا اور ان اداروں کے سربراہ اور اساتذہ کی اکثریت پادریوں پر مشتمل ہوتی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انگریز اپنے مذہبی رہنماؤں یعنی پادریوں کی خصوصی نگریم کرتے اور انہیں خاص حیثیت دیتے تھے لیکن رانا شہباز اس معاملے میں اپنی ایک الگ شناخت رکھتا تھا۔ اس کی حویلی کے سامنے سڑک کے کنارے پرانے وقتوں کی بنی ہوئی ایک شاندار مسجد تھی مگر اس کے پورے دور میں یہ مسجد ویران و سنسان رہی۔ رانا یہاں کسی مولوی کو برداشت نہ کرتا تھا، اُسے اذان کی آواز سے چڑھتی۔ اس لئے مسجد کو آخری حد تک بے آباد رکھنے میں اس نے کوئی کسر اٹھانہ رکھی۔ مسجد میں پانی کا انتظام نہ تھا، چٹائیاں۔

سلے میں انہیں مختلف مقامات پر وسیع زری زمینوں سے نوازا گیا تھا حالانکہ اُس زمانے میں اس خاندان کے کسی نوجوان کی تعلیم مدل سے زیادہ نہ تھی مگر انہیں فوج اور پولیس میں باعزت عہدوں پر متعین کیا گیا تھا۔ رانا شہباز بھی کسی زمانے میں پولیس میں خدمات انجام دے چکا تھا اور سب انسپکٹر کے عہدے سے ریٹائر ہو کر اب ساری توجہ چودھراہٹ بکھارنے اور زمینوں کی نگہداشت پر صرف کر رہا تھا۔

رانا شہباز کی دلچسپیاں عجیب و غریب تھیں۔ وہ عام زمینداروں کی طرح بد عمل نہ تھا۔ شراب پیتا تھا مگر صرف کھانے کے ساتھ تھوڑی سی، جس سے اس کی طبیعت بے تکلیف نہ تھی اور وہ اعلیٰ اول فول نہیں بکتا تھا۔ بس اتنا کرتا کہ بیٹے میں دو تین بار اپنی وسیع حویلی میں دربار لگاتا، علاقے کے غریب غرباء، مزارع، کیوں کو بلاتا اور کسی ایک کی دوسروں سے پٹائی کراتا۔ یہ اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا اور اس سے شاید اس کے شاہانہ مزاج کو تسکین ملتی تھی۔ خصوصاً سردیوں کے موسم میں اس طرح کے اجتماعات دیکھنے کو عام ملتے تھے۔

مثال کے طور پر رانا کرسی پر براجمان ہوتا اور سب لوگ اس کے سامنے زمین پر اکڑوں بیٹھے ہوتے۔ جاموں کو ہار سست اور غمزہ نظر آ رہا ہے۔ اس نے سر اور منہ کو کھیس میں چھپایا ہوا ہے۔ تو رانا غصے میں آ جاتا، اس کے اندر کا تھانیدار اپنے سامنے کسی سپاہی کو سست نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ گونج دار آواز میں جاموں کو موٹی سی گالی دیتا (بہنی اور بہن کی گالی اس کا تکیہ کلام تھا) اور رشید مودی اور رفیق دھولی کو حکم دیتا کہ جاموں کی سستی اتارو اور حکم سنتے ہی یہ دونوں اس پر نوٹ پڑتے، اس کا کھیس اتار کر پھینک دیتے اور اس پر جوتوں اور مکوں کی بارش کر دیتے اور جاموں بے چارے کی ساری سستی دور ہو جاتی۔ باقی سب لوگ رانا کو خوش کرنے کے لئے فرمائشیں

قائد اعظم کا خطاب افسران حکومت سے

لوگ جب آپ سے ملاقات کر کے واپس جائیں تو ان کو یہ احساس نہیں ہوتا چاہئے کہ آپ ان سے نفرت کرتے ہیں، آپ نے ان کی توجہ کی ہے، آپ بے دلی سے ملے، آپ خوش اخلاقی سے پیش نہیں آئے۔ اگر آپ میرے بتائے ہوئے طریقے پر عمل کریں گے تو یقین کیجئے کہ آپ لوگوں سے عزت و احترام حاصل کریں گے۔

(چٹاگانگ-25 مارچ 1948ء)

خبردار آئندہ ہم نے شور مچایا تو.....

اللہ نے رانا شہباز کو دولت و شہرت اور رعب و دبدبے سے بھی نوازا تھا اور اولاد کی نعمت بھی خوب عطا کی تھی۔ اس کی شادی نوعمری ہی میں ہو گئی تھی اور پچاس سال کی عمر تک وہ تین بیٹوں اور تین بیٹیوں کا باپ بن گیا تھا لیکن ساری آسائشوں اور سہولتوں کے باوجود اب وہ سخت پریشان رہنے لگ گیا تھا اور اس کی راتوں کی نیند اور دنوں کا سکون لٹ گیا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اس کی بیگم کی سب سے چھوٹی بہن میں پانچ سال کی ہو گئی تھی اور وہ بے حد خوبصورت لڑکی تھی۔ وہ اس کے حواس پر چھائی رہتی تھی۔ تب تقدیر نے اس کی بددلی اور اس کی بیگم ایک روز پُر اسرار طور پر یکایک دم توڑ گئی۔ لوگوں نے بہت چہ میگوئیاں کیں لیکن رانا کے اندر سوچ کے سامنے سب ہوا ہو گئیں اور یہ دیکھ کر کسی کو بھی اچھا نہ ہوا کہ رانا شہباز نے اپنی سالی شہزادی سے شادی کر لی۔ وہ بھی رانا ہی کی طرح اسم باسنی تھی۔ شہزادیوں کی مانند طرح دار، پاکلی نکلی اور بے حد خوبصورت۔

ساتھ سال کی عمر کو پہنچنے تک رانا شہباز نے اپنی بیٹیوں کی شادی کر دی تھی اور بیٹیوں نے بھی اپنے قدموں پر کھڑے ہو گئے تھے۔ ایک افسر بن گیا تھا، ایک نے کاروبار شروع کر دیا تھا اور ایک مختلف مقامات پر بھی

تھیں، کوئی خادم نہ تھا۔

میں گریسوں کی تحلیلات یعنی جولائی اگست کے مہینے گاؤں میں گزارتا اور عصر کے بعد نہر پر سیر کے لئے جاتا تو وہیں سے وضو کر کے سیدھا رانا کے گاؤں چلا جاتا اور مغرب کی نماز اسی مسجد میں ادا کرتا اور اذان بھی دے دیا کرتا۔

مسجد کی حالت دیکھ کر طبیعت بے طرح سے پریشان ہو جاتی۔ صحن میں بے تحاشا گھاس اور جڑی بوٹیاں اُگی ہو تھیں، مسجد کے ہال میں ابابیلوں کا بسیرا ہوتا اور زمین دروازہ کھولتا تو سینکڑوں ابابیلیں شور مچاتی ہوئی ہال کے اندر چکر کھانے لگتیں۔ ان کی بیٹ اور گندگی اور بدبو سے اندر جانے کی ہمت ہی نہ رہتی اور زمین صحن ہی میں اینٹوں اور گھاس کے فرش پر نماز ادا کرنے پر مجبور ہو جاتا۔ میرے گمان کے مطابق اس زمانے میں غیر مسلموں کے دیہات میں بھی مساجد شاید اس سیڑھی سے دو چار نہ ہوتی ہوں اور اس کا سب سے زیادہ ذمہ دار رانا شہباز تھا۔

اس کی حقیقت یوں سامنے آئی کہ ایک شام میں نے اذان دی تو میں چار بوڑھے اور دو نوعمر لڑکے بھی مسجد میں آ گئے۔ ہم نے باجماعت نماز پڑھ ڈالی اور ایسا واقعہ شاید لمبے عرصے کے بعد مسجد میں ظہور پذیر ہوا تھا۔ نماز کے بعد میں نے ایک لڑکے سے جو غلام محمد کہہ رہا تھا، کہا کہ اس مسجد میں صفائی کر دیا کرو اور اذان دیا کرو۔ مسجد تمہیں بہت دعائیں دے گی اور تمہیں بہت خوب ہو گا۔

”جی، میں نے اذان دینی شروع کی تھی۔“ اس نے سہمے ہوئے انداز میں دائیں بائیں دیکھ کر رازدارانہ انداز میں کہا۔ ”لیکن تین چار دن کے بعد ہی رانا صاحب نے مجھے بلا کر سخت ڈانٹا تھا۔ اس نے کہا تھا، تمہیں ناک ساف کرنا آیا نہیں اور تم نے نوں نوں شروع کر دی ہے،

میں جب میرا بی بی شہزادی اور ملک شوکت سے آنا سامنا ہوا تو دونوں باقاعدہ رک گئے۔

”مسٹر فاروق! تم بہت پریشان لگ رہے ہو؟“ شہزادی کہنے لگی۔ ”وراصل دیہاتی ہونا ورنہ یہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ میں رانا شہباز کی بیگم ہوں لیکن ملک شوکت میرا بوائے فرینڈ ہے۔ امریکہ ہمارا گہرا دوست ہے اور امریکی کلچر کا یہ لازمی حصہ ہے۔ میرا خیال ہے اب تمہاری پریشانی دور ہو چکی ہو گی۔“ یہ کہہ کر وہ مسکرائی، لگتی ہوئی ملک شوکت کا ہاتھ پکڑے آگے بڑھ گئی۔

لیکن میری پریشانی دور نہ ہوئی بلکہ بڑھتی چلی گئی اور میرے تصور میں صورت حال کا جو نقشہ بناؤ وہ مجھے لرزا دیتا اور اللہ تبارک و تعالیٰ کی بے نیازی اور صفت انتقام پر مفسر کا نپ کا نپ جانتا نہیں دیکھتا کہ بی بی شہزادی اور ملک شوکت دونوں رانا شہباز کی لکھی میں داخل ہوئے ہیں۔ رانا دونوں کو اکٹھے دیکھ کر دھماکا ہے، اس کے منہ سے غلیظ گالیوں کا فوارہ بہہ نکلا ہے لیکن اب اس کی آواز میں وہ غلط نہیں رہا۔ بڑھاپے نے اب اس کو زیر کر لیا ہے کہ اس کی عراب ستر سے تجاوز کر گئی ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں اس کے منہ سے جھاگ پبنے لگا ہے اور وہ ملک شوکت کو مارنے کے لئے لپکا ہے، اس پر شہزادی درمیان میں آ جاتی ہے۔

”دیکھو رانا خواجہ بخوار پریشان نہ ہو۔“ وہ ہاتھ بلند کر کے رانا سے مخاطب ہوتی ہے۔ ”اور اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں۔ تم بہت بوز سے ہو گئے ہو جبکہ میں بالکل جوان ہوں، میرے بھی جذبات ہیں، اس لئے اب تم صبر کرو، حوصلے سے کام لو اور شور نہ مچایا کرو اور سن لو کہ مجھے تمہارے شور کی پروا بھی نہیں ہے۔“

میں جولائی 1968ء سے ستمبر 1970ء تک یعنی دو سال اس ڈائجسٹ کے ادارے سے وابستہ رہا اور بڑی پابندی کے ساتھ ہر اتوار کو بی بی شہزادی اور ملک شوکت کو

ہوئی زمینوں کی نگرانی کرتا تھا لیکن تینوں بڑے شہروں میں مقیم ہو گئے تھے۔ گاؤں میں صرف رانا تھا یا شہزادی جو کسی وجہ سے اولاد سے محروم تھی حالانکہ بہت صحت مند تھی اور تیس پینتیس سال کی عمر میں بھی اس کی چلت پھرت نو عمر لڑکیوں والی تھی۔

شہزادی کے اصرار پر رانا شہباز لاہور منتقل ہو گیا۔ وہاں اس نے ایک معروف ہسپتال میں مکان خریدا لیا۔

میں ایم اے کرنے کے بعد ایک اردو ماہنامے کے ادارتی عملے کے ساتھ وابستہ ہو گیا اور من آباد کے قریب ہی نیشنل بینک کالونی کے عقب میں کچھ دوستوں کے ساتھ رہائش اختیار کر لی۔ گاؤں والی نہر کی وجہ سے سیر کی عادت طبیعت میں اس قدر راسخ ہو گئی تھی کہ علی آج نماز فجر کے بعد میں لازماً میر کے لئے نکل جاتا اور من آباد میں مسجد حضری کے ساتھ والی دو گلی گراؤنڈ میں اپنا شوق پورا کر لیتا۔ اس زمانے میں اس علاقے میں یہ گراؤنڈ بھی بھد غنیمت تھی۔

اتوار کا دن تھا، میں حسب معمول گراؤنڈ کی بھداری پر تیز تیز چل رہا تھا کہ اپنے سامنے ایک منظر دیکھ کر میں ٹھیک کر رہ گیا اور میرے پاؤں جیسے زمین نے پکڑ لئے۔ بی بی شہزادی اور ملک شوکت ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے، مسکراتے ہوئے محو خرام تھے۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ سوچا میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں، کیا یہ میرا وہم ہے؟ میں نے باقاعدہ رک کر اپنی آنکھوں کو ملا۔ نہیں یہ میرا وہم نہیں تھا، حقیقت تھی، ٹھوس حقیقت۔ وہ شہزادی اور ملک شوکت ہی تھے۔ میں دونوں کو بہت اچھی طرح پہچانتا تھا، اچھی طرح شناسا تھا۔ ملک شوکت کا آبائی تعلق قرہی قبیلے سے تھا اور وہ رانا شہباز کے بڑے بیٹے کا کلاس فیلو تھا اور اس خاندان سے اس کا گہرا تعلق تھا۔

گراؤنڈ کے اندر چکر لگاتے ہوئے دوسرے گراؤنڈ

مرجھایا ہوا چہرہ، غم والہ کی تصویر، میں نے اُسے فوراً پہچان لیا۔ علیک سلیک کے بعد پوچھا۔ یہاں کیوں کھڑے ہیں؟

”بھائی فاروق! کیا بتاؤں۔“ وہ انتہائی پڑمردہ لہجے میں بولا۔ ”چار لڑکیاں ہیں ایک جیسی جوان، مگر رشتے نہیں ملتے۔ میں نے اس ادارے میں رجسٹریشن کرا رکھی ہے۔ پتہ کرنے آیا ہوں شاید کوئی بات بن جائے۔“

”بھئی کتنے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”کتنے لگے“ ایک ہی بیٹا ہے۔“

”وہ جنوبی افریقہ کے شہر جوہانسبرگ میں بیٹھا ہے۔“

”حیرت ہے، ایک بیٹا اور اُسے آپ نے اتنی دور بھیج دیا۔“ میرے استفسار پر ملک شوکت نے لمبی اور ٹھنڈی آہ کھینچی۔

”ہم نے کہاں بھیج دیا، نہ میں راضی تھا کہ وہ باہر جائے نہ اُس کی ماں اُسے نظروں سے دور کرنا چاہتی تھی۔“

مردود ہمارے ہاتھوں سے یوں پھسل گیا جیسے پھسلنے سے پھسلتی ہے اور اب کیفیت یہ ہے کہ میری بیوی کے دونوں گردے بیکار ہو گئے ہیں۔ بیٹھے میں دوبار اُس کا ڈاکسز ہوتا ہے جس پر ہماری رقم خرچ آتی ہے۔ میں خود شوگر کا مریض ہوں، دل کی تکلیف بھی ہے اور بیٹائی بھی کم ہو رہی ہے۔ ہم دونوں میاں بیوی نہ زندوں میں ہیں نہ مردوں میں..... لیکن زندگی کے سانس تو کسی طرح پورے کرنے ہیں۔ اس لئے جوں توں جی رہے ہیں، دیکھیں خدا کو کیا منظور ہے۔“

یہ کہہ کر ملک شوکت کی آنکھیں آنسوؤں سے بھگ گئیں اور میں مصافحہ کر کے آگے بڑ گیا۔ میرا اپنا جی بھر آیا تھا۔

ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے باہم سیر کرتے ہوئے دیکھتا رہا اور ہر اتوار کو میرے کانوں میں رانا شہباز کی آوازیں گونجتیں جن میں احتجاج، بے بسی، شکست اور ذلت کا عجیب عبرت ناک امتزاج ہوتا تھا اور میں اس احساس سے لرزلرز جاتا کہ جو شخص طلق خدا کو ذلیل و خوار کر کے خوش ہوتا تھا، حقیقہ لگتا تھا۔ جو مسجد کو ویران حالت میں دیکھ کر مطمئن و مسرور تھا اور اُسے اذان کی آواز سے جڑ تھی، جس نے مکاری و سفاکی سے پہلی بیوی کو راستے سے ہٹایا تھا، اب وہ اپنے گھر کے اندر ذلت و رسوائی کی غیر معمولی کیفیت سے دوچار ہے اور اس کی عزت و غیرت کی اس کی نظروں کے سامنے نیلامی ہو رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ میری زندگی کا ایک ہولناک مشاہدہ

اور تاثر ہے جو یادوں سے بہت کم ٹھوکتا ہے۔

میں 1970ء میں لکچرار بن کر لاہور سے باہر

شکر گڑھ چلا گیا اور جنوری 1980ء میں واپس لاہور آ گیا۔ پتہ چلا کہ اس دوران میں رانا شہباز فالج میں مبتلا ہو گیا۔ وہ کئی سال تک موت و حیات کی کشمکش میں دوچار رہا۔ اللہ نے اسے خوب خوب ذلیل و خوار کیا اور بڑی دیر کے بعد اُسے اس عبرت ناک زندگی سے چھٹکارا مل سکا۔ بی بی شہزادی کو یہ سزا ملی کہ وہ چھاتی کے کینسر میں مبتلا ہو گئی اور پچاس سال کی عمر تک اس نے بھی مختلف طبی و عملی مسائل سے رہائی پالی۔

اب سنئے، ملک شوکت کا حال۔ وہ نیکی پلاننگ کے جھگے میں افسر تھا۔ وہاں اس پر نہیں کاکیں بنا اور اُسے ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔ میری اس سے ملاقات تقریباً تین سال پہلے اچانک ایک مقام پر ہوئی۔ میرے گھر کے قریب ایک دینی ورفانی ادارہ تھا جو رضا کارانہ طور پر رشتے کرانے کی خدمت انجام دیتا تھا۔ ایک روز میں عصر کی نماز پڑھ کر مسجد سے نکلا تو دیکھا کہ ملک اس دفتر کے سامنے کھڑا تھا۔ سر پر نماز والی میلی سی نوچی تھی،





ان کے استاد علامہ اقبال تھے۔ میاں صاحب کہتے تھے۔ ”پہلے میں شاعری کرتا تھا لیکن علامہ صاحب کی ہدایت پر میں شعر لکھنے لگا۔“ اُن کے قلم میں بڑی روانی تھی۔

☆ حبیب اشرف صہجی

برصغیر پاک و ہند کے آب و گل میں اللہ رب العزت نے وہ مردم خیزی رکھی ہے جس کا جواب نہیں، خصوصاً قلمکاری کے میدان میں بنگال سے درہ خیبر، ایران سے زاہدان تک اور شمالی ہند سے لنکا و دکن تک اتنے ادیبوں کے نام اور چہرے نظر آتے ہیں جن کا مقابلہ شاید دنیا کا کوئی اور ملک نہیں کر سکتا۔ پھر ان قلمکاروں میں قصہ نویس بھی ہیں، شاعر بھی ہیں، مضمون نگار بھی ہیں، مرثیہ نویس بھی ہیں، ناول نگار بھی ہیں، سوانح نویس بھی اور سفر نامے لکھنے والے بھی۔ ان میں

فروری 2015ء میں محترم ربانی عبدالجبار سالنامہ صاحب کا ایک مضمون ”کچھ یادیں کچھ باتیں“ کے عنوان کے تحت نظر سے گزرا جس کا عنوان تھا ”ایم اسلم۔ نقاشِ فطرت“۔ ربانی صاحب! ایم اسلم صاحب اور میرے والد اشرف صہجی صاحب میں بڑی دوستی تھی اور ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا بھی تھا۔ میرے ذہن میں اس کلاسیک قلمکار سے وابستہ کچھ یادگار واقعات موجود تھے جو میں قارئین ”حکایت“ کی نذر کر رہا ہوں۔

شیروانی کے جن بند ہوتے تھے۔ میں آتے ہی پوچھتا تھا کہ حاجی صاحب پانی پینا پسند کریں گے؟ تو گرمی کے باوجود انکار کر دیتے تھے کہ نہیں۔ میں کہتا تھا کہ پانی پینے میں بھی تکلف ہے۔

اس وضعداری کو پروفیسر اسلم فرنی صاحب نے "اشرف صبحی کی پچاس سالہ نثری خدمات" کے سلسلے میں ایک تقریب میں ان الفاظ میں بیان کیا کہ "قیامت کے روز اللہ تعالیٰ بندوں سے حساب کتاب کر رہا ہوگا تو جب اشرف صبحی صاحب کی باری آئے گی تو اللہ تعالیٰ فرشتوں سے کہے گا کہ ان کو بغیر حساب کتاب کے جنت میں جانے دو کیونکہ انہوں نے چالیس سال تک میاں اسلم صاحب کے ناول کے مسودے بڑے صبر اور شکر کے ساتھ بغیر کسی لالچ کے سنے۔"

میاں صاحب بڑے مہمان نواز تھے، ان کا دسترخوان بڑا وسیع تھا۔ اتوار کو ان کے ہاں صبح ناشتہ کی محفل ہوتی تھی جس میں انواع و اقسام کی نعمتیں ہوتی تھیں۔ بڑا ایسی مذاق ہوتا تھا۔ ہر اتوار کو آنے والوں میں ڈاکٹر خواجہ عابد نظامی، مولانا اسماعیل پانی پتی، پروفیسر خالد بڑی، ڈاکٹر عبدالوحید قریشی، شیخ عبدالغفور، نواب مشتاق احمد خان، مولوی اعجاز، انور، عبدالجبار ربانی صاحبان اور میرے والد (اشرف صبحی صاحب) شامل ہوتے تھے۔ دوپہر تک یہ مجلس اختتام پذیر ہوتی تھی۔ اکثر دوستوں کے ساتھ مقبرہ جہانگیر، شالامار باغ، شاعی قلعہ اور دیگر تفریحی مقامات پر پکنک منانے جاتے۔

میاں صاحب کو پرانے گانے سننے کا بہت شوق تھا۔ اس کے لئے ایک گراموفون بھی رکھا ہوا تھا۔ ریکارڈ بھی بیکزوں کی تعداد میں تھے۔ اکثر پرانے گانے کئی کئی دفعہ سنتے تھے کہتے تھے کہ ان گانوں سے مجھے ناولوں کے پلاٹ مل جاتے ہیں اور مجھے ناول لکھنے میں آسانی رہتی ہے۔ میاں صاحب کو شکار کا بھی شوق تھا، نشانہ بہت بڑا

خواتین بھی ہیں اور مرد حضرات بھی جنہوں نے اپنے اپنے مقامی رنگ میں اور زبان میں اپنے فن کا جادو چکایا ہے۔ ادیبوں اور قلمکاروں کی اس انجمن میں مجھے ایک منفرد نام جگاتا نظر آتا ہے اور وہ ہیں جناب "ایم اسلم" جنہوں نے ناول نگاری کے میدان میں ایک جداگانہ طرز اپنائی ہے۔

آج جبکہ وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں ان کی یادیں حافظے کی لوح سے محو نہیں ہو پاتیں بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی یادوں کے نقوش مزید گہرے ہوتے جاتے ہیں۔ آج میں میاں ایم اسلم صاحب کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے ان کی زندگی کے چند گوشوں سے نقاب کشائی کرنا چاہوں گا۔

جب میں نے ہوش سنبھالا اور اپنے گرد و پیش کو دیکھا تو والد صاحب (اشرف صبحی) کے قریب ترین دوستوں میں میاں ایم اسلم صاحب کو پایا اور گھر میں ان کا روبرو بہت سنا۔ والد صاحب ڈاک خانے میں ملازم تھے۔ جب پوسٹ آفس سے چھٹی ملتی تو سیدھے میاں صاحب کے پاس پہنچ جاتے۔ اس پروگرام میں بھی تبدیلی نہیں آئی تھی چاہے آندھی آئے یا مینہ برسے۔ میاں صاحب سارا دن اپنے ناول کا مسودہ لکھتے اور شام کو والد صاحب کو سناتے اور بائیں شور سے اس میں رد و بدل کرتے۔

والد صاحب کی طبیعت میں بڑی وضعداری اور انکساری تھی۔ میاں صاحب اور ان کے خاندان کے سارے لوگ والد صاحب کو "حاجی صاحب" کہتے تھے اور بہت عزت کرتے تھے بلکہ اپنے گھر کا ایک فرد سمجھتے تھے۔ میاں صاحب اکثر مجھ سے کہتے تھے کہ جب حاجی صاحب ڈاک خانے سے سیدھے میرے گھر آتے تھے تو گرمی کی وجہ سے چہرے پر پسینے آئے ہوتے تھے۔ لب تک ہوتے تھے۔ سر پر ترکی ٹوپی ہوتی تھی اور گل تک

ایک روز میں گیا تو وہ اپنی ریاضت کی باتیں بتا رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی میاں صاحب نے کہا۔

”بیر صاحب! یہ دیکھئے یہ حاجی صاحب کے صاحبزادے ہیں۔ پانچوں وقت کی نماز پڑھنے کے علاوہ تہجد گزار ہیں۔ میری بے انتہا تعریف کی۔

تھوڑی دیر بیٹھ کر میں گھر آ گیا۔ چند روز بعد میں میاں صاحب کے پاس گیا اور ان سے پوچھا کہ آپ نے بیر صاحب کے سامنے مجھے تہجد گزار بنا دیا۔ میں پانچوں وقت کی نماز پڑھ لوں تو غنیمت ہے۔ میاں صاحب کہنے لگے کہ میں نے صحیح کہا تھا کہ تم تہجد گزار ہو۔

یعنی تہجد گزار رہتے ہو۔ کیا میں نے جھوٹ کہا تھا؟ میں اگر کبھی کسی کے بارے میں کہتا کہ وہ پکا نمازی ہے تو میاں صاحب مذاق میں کہتے۔ ہاں میں اس کو جانتا ہوں وہ ”خونفک نمازی“ ہے۔ میاں صاحب کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ اپنی ایک ملازمہ کی پتی لے کر بالا۔ وہ اب بھی بہ قید حیات ہیں۔ میاں صاحب نے دو شاہدیاں کی تھیں۔

میاں صاحب نہایت وضعدار اور دوست نواز انسان تھے۔ جب ہم ہجرت کر کے انڈیا سے لاہور آئے تو میاں صاحب کے کئی ماہ مہمان رہے۔ ہمارے چچا شاہد احمد دہلوی بھی ہمارے ساتھ تھے۔ اپنے گھر کے نزدیک دو مکانات جو خالی کر کے گئے تھے، ہمیں الاٹ کرا کے دیئے۔ جب ہمارے چچا شاہد احمد دہلوی کراچی چلے گئے تو ہم اس گھر میں شفٹ ہو گئے۔ ان کی بے شمار نیکیاں تھیں جو بھلائے نہیں بھولتیں۔

ان کے استاد علامہ اقبالؒ تھے۔ میاں صاحب کہتے تھے۔ ”پہلے میں شاعری کرتا تھا لیکن علامہ صاحب کی ہدایت پر میں نثر لکھنے لگا۔“ اُن کے قلم میں بڑی روانی تھی۔

اللہ تعالیٰ اُن کی مغفرت فرمائے!



تھا۔ اڑتے ہوئے پرندے کو غائر کر کے گرا دیا کرتے تھے۔ مچھلی کے شکار کو بھی جاتے تھے۔ ایک روز میاں صاحب کے دوستوں نے میاں صاحب سے سوال کیا کہ آپ کا ولیمر کب ہوا تھا اور اس میں کیا کیا پکا تھا۔ میاں صاحب نے جواب دیا کہ فلاں سن میں میرا ولیمر ہوا تھا اور یہ یہ چیزیں نکلی تھیں۔ دوستوں نے کہا کہ میاں صاحب ہم نے تو آپ کا ولیمر کھایا نہیں تھا، ہمیں ولیمر کھلائیں۔ چنانچہ ایک اتوار کو وہ تمام چیزیں پکوائیں جو اُن کے ویسے میں شامل تھیں اور دوستوں نے دعوت اڑائی۔

میاں صاحب نے کئی سو ناول لکھے جس میں رومانی، تاریخی، اطلاقی اور مزاحیہ وغیرہ شامل تھے۔ یہ ناول بڑے ضخیم ہوتے تھے۔ اس زمانے میں میڈیا نے اتنی ترقی نہیں کی تھی، لوگوں کی دلچسپی کا باعث یہی ناول ہوتے تھے۔ مہنگائی بھی اتنی نہیں ہوئی تھی اور یہ ناول لوگوں کی پہنچ سے باہر نہیں ہوتے تھے۔ میاں صاحب کو پودوں سے بھی بڑی دلچسپی تھی، ان کے صحن میں کئی کئی قسموں کے پھولوں کے گملے ہوتے تھے۔ نیا سال شروع ہوتے ہی دوستوں سے وہ نئے نئے کیلنڈرز کے لئے کہا کرتے تھے۔ ان کی سبب سے والے کیلنڈرز بہت پسند تھے۔

میاں صاحب کا ایک ملازم تھا جس سے وہ بڑے الگ تھے۔ ایک دن والد صاحب سے کہنے لگے کہ یہ ملازم مجھے اتنا تنگ کرتا ہے اور میری کوئی بات نہیں سمجھتا۔ اس لئے میں نے اس کا نام ابو جہلا (یعنی جاہلوں کا باپ) رکھ دیا۔ والد صاحب نے کہا اتنا لبا نام رکھنے کی کیوں زحمت کرتے ہیں۔ ابو جہل ہی کہہ دیا کریں تاکہ اس کو بھی معلوم ہو کہ اس کی کیا اہمیت ہے؟

میاں صاحب کے ایک دوست تھے جو بیر صاحب کہلواتے تھے اور اوکاڑہ سے آتے تھے۔ اپنی روحانیت، پابنازی اور ریاضت کا بہت زیادہ تذکرہ کرتے تھے۔

تقسیم اور فوج کی فرض شناسی

balochsk@yahoo.com

☆ سکندر خان بلوچ

کے لوگ نشانہ بنے ہوئے تھے۔ برصغیر کے طول و عرض میں مہاجرین بھر گئے۔ ہر طرف انسانی لاشیں، آؤٹاکا، غرت ہی نفرت اور آگ، انسان بھیڑیے بن گئے۔ مہاجرین کے قافلے اور مہاجرین بھری ریل گاڑیاں دونوں طرف خصوصی نشانہ تھے۔ لہذا فوج کو مہاجرین کیپ، مہاجرین قافلے اور مہاجرین بھری ریل گاڑیوں کی حفاظت کے لئے بلایا گیا۔

یہ جون 1947 کا واقعہ ہے کہ کپٹن سعید احمد منصور دہلی کے نزدیک نمبر 1 مہار بنالین میں ایک مرہٹہ کمپنی کمانڈ کر رہا تھا۔ اس پونٹ میں کوئی مسلمان سپاہی نہ تھا۔ پوری پونٹ کی نفری میں آدھے سکھ اور آدھے مرہٹے تھے۔ کپٹن منصور واحد مسلمان تھا لیکن منصور کا اپنے جوانوں پر اور جوانوں کا اپنے کمپنی کمانڈر پر اعتماد مثالی تھا۔ کپٹن احمد منصور کو دہلی G.H.Q. بلا کر اور کچھ سپاہی دے کر مہاجرین بھری آنے اور جانے والی ریل گاڑیوں

تقسیم ہند ایک بہت بڑا انسانی سانحہ تھا جس میں کم از کم 30 کروڑ کے لگ بھگ انسانی آبادی نہ بچ سکی۔ اسے متاثر ہوئی اور تقریباً 10 لاکھ کے قریب بچے اور معصوم انسان مذہب کے نام پر منافرت کا شکار ہو کر مارے گئے۔ اتنے بڑے سانحہ میں فوج نے انسانوں کو بچانے کے لئے بہت سے خطرات مول لئے اور اپنی جانوں کی پروا کئے بغیر مذہبی منافرت سے بالاتر ہو کر انسانی خدمت کی ورنہ یہ اسات 10 لاکھ سے کہیں زیادہ ہو سکتی تھیں۔ تقسیم ہند کے وقت پوری فوج کی حفاظتی کارروائیوں کا احاطہ کرنا تو ممکن نہیں لیکن چند ایک درج ذیل مثالیں فوج کی بلا تفریق فرض شناسی اور انسانی خدمت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

تقسیم ہند کے اعلان کے ساتھ ہی ہر طرف فسادات کی آگ بھڑک اٹھی جسے قابو میں رکھنا کسی بھی انسانی قوت کے بس میں نہ تھا۔ ہر طرف مخالف مذہب

کیا۔ مجمع آگے بڑھتا آیا۔ جونہی مجمع نزدیک آیا منصور نے فائر کا حکم دے دیا۔ فائر کی پہلی باڑ کے ساتھ کافی سارے بلوائی گر گئے مجمع چند منٹوں میں منتشر ہو گیا۔ دو گھنٹے بعد دوسرا انجن آگیا اور یہ ٹرین بحفاظت لاہور پہنچ گئی۔ اٹاری ریلوے سٹیشن پر ایک غیر مسلم ٹرین تیار تھی جسے یہ لے کر دہلی آ گئے۔ اس کے بعد جہاں کہیں بھی فرض نبھایا کوئی نقصان نہ ہوا۔ پاکستان بن گیا۔ کیپٹن منصور ایبٹ آباد تعینات ہوا اس کی اعلیٰ کارکردگی کی وجہ سے اے۔ م۔ ب۔ اے۔ (ممبر آف برٹش ایمپائر) جیسے اعزاز کے لئے نامزد کیا گیا۔ فروری 1948ء ایک صبح کیپٹن منصور کو فوری طور پر G.H.O. جا کر ڈپٹی کمائنڈر انچیف جنرل گریسی کے کیمپ ٹی سے ملنے کا حکم دیا گیا۔ وہاں شاندار خدمات کے عوض صدر ہند کی طرف سے شکر یہ اور اعزازی سند سے نوازا گیا۔

اکتوبر 1947ء میں 21/15 بجاب، جنت کوہاٹ میں قیام پذیر تھی۔ یونٹ کو حکم دیا گیا کہ کوہاٹ سے آگے بارہ چنار کے علاقے میں بہت سے غیر مسلموں کی جان خطرے میں ہے انہیں بچایا جائے۔ لہذا میجر سردار جو کہ یونٹ کا سینڈان کمانڈ بھی تھا فوری طور پر ایک کمپنی کے ساتھ بارہ چنار پہنچا اور ان سب غیر مسلموں کو کوہاٹ کیمپ میں لے آیا جہاں ان کی حفاظت کے لئے فوج تعینات تھی کیونکہ قبائلی اور لوکل لوگ انہیں ہر قیمت پر ختم کرنے کے لئے تلے ہوئے تھے۔ ایک رات اس یونٹ کا ڈپٹی آفسر میجر مظفر الدین کیمپ کے ارد گرد چکر لگا رہا تھا کہ اسے کیمپ کی طرف آتا ہوا ایک سایہ نظر آیا۔ میجر مظفر نے فوری طور پر چھپ کر پوزیشن سنبھالی۔ جب سایہ نزدیک پہنچا تو میجر مظفر نے چیلنج کیا۔ آنے والے نے کوئی چیز زمین پر رکھ کر کہہ دیا کہ یہ میجر مظفر کی کمپنی کا اپنا سپاہی زرین گل تھا۔ میجر مظفر نے پوچھا کہ یہ کیا چیز آپ نے زمین پر رکھی ہے اور یہاں کیا کر رہے

کی حفاظت کی ذمہ داری سونپی گئی۔ یاد رہے کہ یہ سپاہی اس کی اپنی یونٹ کے نہ تھے۔ ان کی ڈپٹی کے دوران بلوہ ہو گیا اور بہت سے معصوم لوگ مارے گئے۔ دوسرے دن فوجی میٹنگ میں یہ بلوہ اور اتنی اموات زیر بحث لائی گئیں۔ جب کیپٹن منصور سے پوچھا گیا تو اس نے جواب دیا "سر کیا یہ حیران کن نہیں کہ اتنے لوگ مارے گئے اور حفاظتی گارڈ کا ایک بندہ بھی زخمی نہیں ہوا۔ اس سے کیا ثابت ہوتا ہے؟" پھر کیپٹن منصور سے طنز یہ پوچھا گیا کہ کیا تم مسلمان مہاجرین کی ٹرین کی حفاظت کر سکو گے یا ان کے ساتھ بھی ایسا ہی کرو گے؟ منصور نے جواب دیا "سر میں خوشی سے یہ چیلنج قبول کرتا ہوں بشرطیکہ مجھے اپنی یونٹ کی اپنی سرہٹ کمپنی کے جوان بطور حفاظتی گارڈ دیئے جائیں تو" جو اسے مل گئے۔ منصور نے ڈپٹی شروع کرنے سے پہلے اپنے تمام سرہٹ جوانوں کو اکٹھا کر کے پوچھا، سب نے بیک زبان جواب دیا "ہم اپنا فرض بلا خوف و خطر بلا مذہبی تفریق اپنی جان پر لھیں گے۔"

اس عزم اور اس وعدہ کے ساتھ کیپٹن سعید احمد منصور اور اس کے مرہٹہ جوان مسلمان مہاجرین کی ٹرین لے کر دہلی سے لاہور روانہ ہوئے۔ جالندھر تک تو یہ ٹرین بحفاظت پہنچ گئی، جالندھر سٹیشن کے نزدیک ریلوے کی پٹری اکھڑی ہوئی تھی لہذا انجن پٹری سے اتر گیا۔ کیپٹن منصور نے سٹیشن ماسٹر کو دوسرے انجن کا ہندو بست کرنے کے لئے کہا۔ اتنی دیر میں باہر فائر اور شور کی آواز سنائی دی۔ دیکھا تو ایک بہت بڑا سکھ بلوائیوں کا مجمع بک بانیں، تلواریں، لٹھیاں اور کچھ بندوقیں لہراتا ہوا ٹرین کی طرف دوڑا آ رہا تھا۔ شکر ہے کہ اس وقت اتنا خود کار اسلحہ نہ تھا۔ منصور نے اپنے جوانوں کو پوزیشن سنبھالنے کا حکم دیا جس پر انہوں نے فوری عمل کیا۔ منصور نے بلند آواز سے مجمع کو واپس جانے کا حکم دیا لیکن کسی نے اس پر عمل نہ

انسانیت

انسان ہونا ہمارا انتخاب نہیں، یہ قدرت کی عطا ہے لیکن اپنے اندر انسانیت بتائے رکھنا ہمارا انتخاب ہے۔

(جوادیہر - تلہ گنگ)

سپاہی ہانپتا کانپتا میجر آفتاب کے پاس آیا "صاحب کچھ سوچیں مکمل آپ سے ملنا چاہتے ہیں"۔ لہذا وہ اپنے کمپ سے باہر انہیں ملنے آیا۔ سامنے ایک گھوڑ سوار سکھ دستہ پورے طور پر مسلح نظر آتا تھا۔ ساتھ ایک بہت بڑا مسلمانوں کا قافلہ بھی تھا جس میں بچے، بڑھے اور خواتین شامل تھیں۔ سکھ سردار گویا ہوا "میجر صاحب میں فلاں گاؤں کا نمبر دار ہوں۔ میرے ساتھی بھی اسی علاقے کے زمیندار ہیں۔ میرے علاقے کے تمام مسلمان آپ کے سامنے ہیں۔ ان سے پوچھ لیں ہم نے ان میں سے کسی کو لاکھ تکلیف نہیں دی۔ اب ہم انہیں یہاں تک بحفاظت لے آئے ہیں اب ہماری ذمہ داری ختم۔ آگے آپ کی ذمہ داری ہے۔" یہ کہہ کر سکھ دستے نے مسلمانوں کی طرف دیکھ کر رب راکھا کہا اور ہاتھ ہلا کر واپس مڑ گئے۔ قافلے کے تمام لوگوں نے ہاتھ ہلا کر انہیں رخصت کیا کچھ بوڑھے لوگوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ تمام قافلے نے سکھوں کے حسن سلوک کی بہت تعریف کی۔

ستمبر 1947ء میں میجر آفتاب تقریباً 5 ہزار غیر مسلموں کے قافلے کی عارف والا اور پاک چین کے درمیان نقل و حرکت کی حفاظت پر تعینات تھا۔ اچانک کچھ لوگ بندو قوں کے ساتھ ریلوے سٹیشن کی اوٹ میں پوزیشن لیتے ہوئے نظر آئے۔ میجر آفتاب اپنی جیب روک کر ان کے پاس گیا اور انہیں کسی قسم کی کارروائی کرنے کے خلاف وارننگ دی۔ وہ یہ کہہ کر پیچھے ہٹا تو

ہو۔ زرین گل نے جواب دیا "سر میں شام کو ڈیوٹی پر تھا۔ اس کمپ میں کچھ معصوم بچے ہیں جو دودھ کے لئے رو رہے تھے۔ ڈیوٹی ختم کر کے بازار سے ان کے لئے دودھ لایا ہوں"۔ زرین گل نے دودھ بھری بالٹی آگے کر دی۔ میجر مظفر نے مزید پوچھا تم نے ان سے دودھ کی قیمت تو نہیں لی۔ زرین گل نے انہیں شن ہو کر سیلوٹ کر کے جواب دیا "سر پاکستانی سپاہی اتنا کمینہ نہیں ہو سکتا" یہ قافلہ بحفاظت ہندوستان پہنچایا گیا۔

جون 1947ء میں 1/2 پنجاب رجمنٹ کوئٹہ سے ملتان اور پھر منٹمری (ساہیوال) بھیج دی گئی۔ لیفٹیننٹ کرنل گورنجن سنگھ کمانڈنگ آفیسر تھا۔ یہ یونٹ 77 ہزار بریگیڈ کا حصہ تھی جسے باؤنڈری کمیشن کے لئے تعینات کیا گیا تھا۔ اچانک اوکاڑہ میں فسادات پھوٹ پڑے اور یونٹ سے مدد مانگی گئی۔ کرنل گورنجن سنگھ نے یونٹ کے مسلمان آفیسر میجر آفتاب کو ایک کمپنی کی نگرانی کے لئے اوکاڑہ بھیج دیا۔ اوکاڑہ پہنچ کر اُس نے دیکھا کہ فسادات جاری تھے اور غیر مسلموں کی جانیں سخت خطرے میں تھیں۔ شری چندر کی طور زک ہی نہیں رہے تھے۔ لہذا میجر آفتاب نے علاقے کے سرکردہ لوگوں کو بلایا۔ اپنی کمپنی کو حکم دیا کہ وہ پوزیشن لے کر ہوائی فائر کرے۔ فائر کے بعد میجر آفتاب نے صرف ایک فقرہ کہا "میرا فرض ان لوگوں کی حفاظت ہے جو میں ہر قیمت پر بلا تفریق ادا کروں گا۔"

سب موجود لوگوں نے تعاون کا یقین دلایا۔ غریب فسادات رک گئے۔ دو دن بعد میجر آفتاب اور اس کی کمپنی کو فاضلکا جانے کا حکم ملا۔ 14 اگست کو سکھ اور ہندو فاضلکا میں اکٹھے ہونے شروع ہوئے۔ مسلمانوں نے خطرہ محسوس کیا اور میجر آفتاب سے پاکستان جانے کے لئے مدد مانگی۔ دو دنوں کے اندر اندر اُس نے تمام مسلمانوں کو سلیمان کی میں پہنچا دیا۔ ایک دن بعد ایک

ایک گولی کی آواز آئی۔ مجمع کی طرف دیکھا تو گولی ایک غیر مسلم کے سر میں لگی تھی۔ حفاظتی جوانوں نے فوری طور پر ریلوے لائن کے ساتھ لیٹے ہوئے بلوائیوں پر فائر کھول دیا اور وہ چند منٹوں میں کہیں غائب ہو گئے۔ عارف والا میں کچھ سرکردہ لوگوں نے میجر آفتاب سے مل کر غیر مسلموں کی تلاش لینے کی اجازت مانگی۔ میجر آفتاب نے سختی سے منع کر دیا اور یوں یہ تمام قافلے بحفاظت اپنی منزل مقصود پر پہنچ گئے۔

جولائی میں تو پٹانے کے ایک آفیسر میجر عبدالغنی کو ملتان میں ملتان اور دریائے ستلج کے درمیان حفاظتی ذمہ داری سونپی گئی۔ میجر عبدالغنی نے فوری طور پر اپنا ہیڈ کوارٹر دنیا پور میں قائم کیا اور اپنی آؤٹ پوسٹیں لودھراں، شجاع آباد اور ملیسی میں قائم کیں۔ تمام غیر مسلموں کو مکمل تحفظ فراہم کیا گیا۔ ایک دن کچھ سکھ میجر عبدالغنی کے پیش ہوئے۔ اس سکھ دستے کا سربراہ ایک ریٹائرڈ فوجی تھا۔ اُس نے میجر عبدالغنی کو سیلوٹ کر کے کہا ”سرویسے تو ہم اپنے گاؤں میں سکون سے ہیں لیکن باہر نہیں نکل سکتے اور ہمارے پاس راشن ختم ہو گیا ہے“۔ میجر عبدالغنی سب کو اکٹھا کر کے اپنے یکپ کے نزدیک لے آیا جہاں راشن وغیرہ مہیا کیا اور دو دن بعد بخیریت ہندوستان بھیج دیا۔ اس پر علاقے کے کچھ سرکردہ مسلمانوں نے میجر عبدالغنی کے پاس آ کر شکایت کی کہ ”ہندوستان میں ہمارے بھائیوں کو بیدردی سے قتل کیا جا رہا ہے اور آپ یہاں سکھوں کو مہمان بنائے بیٹھے ہیں“۔ میجر عبدالغنی نے جواب دیا ”یہ تو میرا فرض ہے جو میں نبھار رہا ہوں لیکن مجھے آپ لوگوں میں سے کچھ دائمی نو جوان چاہئیں جنہیں میں ہتھیار بھی دیتا ہوں اور وہ ہندوستان جا کر ظلم کا بدلہ لیں“۔ کوئی شخص سامنے نہ آیا۔

جولائی میں تو پٹانے کے ایک آفیسر میجر عبدالغنی کو ملتان میں ملتان اور دریائے ستلج کے درمیان حفاظتی ذمہ داری سونپی گئی۔ میجر عبدالغنی نے فوری طور پر اپنا ہیڈ کوارٹر دنیا پور میں قائم کیا اور اپنی آؤٹ پوسٹیں لودھراں، شجاع آباد اور ملیسی میں قائم کیں۔ تمام غیر مسلموں کو مکمل تحفظ فراہم کیا گیا۔ ایک دن کچھ سکھ میجر عبدالغنی کے پیش ہوئے۔ اس سکھ دستے کا سربراہ ایک ریٹائرڈ فوجی تھا۔ اُس نے میجر عبدالغنی کو سیلوٹ کر کے کہا ”سرویسے تو ہم اپنے گاؤں میں سکون سے ہیں لیکن باہر نہیں نکل سکتے اور ہمارے پاس راشن ختم ہو گیا ہے“۔ میجر عبدالغنی سب کو اکٹھا کر کے اپنے یکپ کے نزدیک لے آیا جہاں راشن وغیرہ مہیا کیا اور دو دن بعد بخیریت ہندوستان بھیج دیا۔ اس پر علاقے کے کچھ سرکردہ مسلمانوں نے میجر عبدالغنی کے پاس آ کر شکایت کی کہ ”ہندوستان میں ہمارے بھائیوں کو بیدردی سے قتل کیا جا رہا ہے اور آپ یہاں سکھوں کو مہمان بنائے بیٹھے ہیں“۔ میجر عبدالغنی نے جواب دیا ”یہ تو میرا فرض ہے جو میں نبھار رہا ہوں لیکن مجھے آپ لوگوں میں سے کچھ دائمی نو جوان چاہئیں جنہیں میں ہتھیار بھی دیتا ہوں اور وہ ہندوستان جا کر ظلم کا بدلہ لیں“۔ کوئی شخص سامنے نہ آیا۔

6 جنوری 1948ء کو کراچی میں بندر روڈ پر گوردوارہ جاتے ہوئے کچھ سکھوں کو نشانہ بنایا گیا جس سے خطرناک قسم کے فسادات پھوٹ پڑے۔ 10 بجے جو طیر میں تھی اسے حکم دیا گیا کہ فسادات پر فوری قابو پائے۔ کرنل گلزار احمد اس یونٹ کی کمان کر رہے تھے۔ یونٹ ایک گھنٹے کے اندر اندر بندر روڈ پہنچ گئی اور فسادات پر قابو پا لیا۔ فوری طور پر علاقے میں کرفیو لگا دیا گیا۔ دوسرے دن ایک گھنٹے کے لئے کرفیو اٹھایا گیا تو کرنل گلزار کو پتہ چلا کہ کچھ شریہند لوگ میونسپل کمیٹی کی عمارت کے نزدیک فسادات پھیل رہے تھے۔ کرنل گلزار فوری طور پر وہاں پہنچا تو کچھ لوگ دوکانوں کے تالے توڑ رہے تھے اور کچھ دوکانیں توڑ کر سامان لوٹ رہے تھے۔ کچھ آگ لگا رہے تھے۔ ان سب کو وہاں سے جانے کے لئے وارننگ دی گئی لیکن فرق نہ پڑا، فسادات کا حکم دینا پڑا۔ سات آدمی موقع پر ہلاک ہو گئے لیکن فسادات پر مکمل طور پر قابو پا لیا گیا۔ بعد میں قائد اعظم نے کراچی میں اس مثالی کارکردگی اور دیر پا امن قائم رکھنے پر اس یونٹ کو خصوصی مبارک باد دی۔ یاد رہے کہ فساد برپا کرنے والے سب مسلمان تھے۔ اسی طرح منڈی بہاء الدین میں بھی کچھ اسلام کو خطرناک بلوائیوں پر فائر کھولنا پڑا جس سے چھ آدمی مر گئے۔ پولیس نے انہیں الزام لگا کر میجر اسلم کے خلاف کیس بنا دیا۔ انکوائری کا حکم دیا گیا اور یہ انکوائری ایک انگریز آفیسر کرنل بلڈف نے کی۔ اُس نے میجر اسلم کو تمام الزامات سے بری کیا اور اس کی کارکردگی کو سراہا۔ نتیجتاً جنرل میسرودی، کمانڈر انچیف کی طرف سے میجر محمد اسلم اور اس کی بیٹی کو تعریفی سند عطا کی گئی۔

اسی طرح اور بھی بے شمار واقعات ہوئے اور یہ سرحد کی دونوں جانب وقوع پذیر ہوئے اکثر و بیشتر فوج کو جو فرائض سونپے گئے وہ انہوں نے بہ احسن طریقے سے نبھائے اور یہی ایک اچھی فوج کی نشانی ہے۔ فرض کی ادائیگی میں نہ تو جان کی پرواہ کی جاتی ہے اور نہ اپنے ہم نڈہبوں، دوستوں یا رشتہ داروں کی۔ پاکستان فوج

6 جنوری 1948ء کو کراچی میں بندر روڈ پر گوردوارہ جاتے ہوئے کچھ سکھوں کو نشانہ بنایا گیا جس سے خطرناک قسم کے فسادات پھوٹ پڑے۔ 10 بجے جو طیر میں تھی اسے حکم دیا گیا کہ فسادات پر فوری قابو پائے۔ کرنل گلزار احمد اس یونٹ کی کمان کر رہے تھے۔ یونٹ ایک گھنٹے کے اندر اندر بندر روڈ پہنچ گئی اور فسادات پر قابو پا لیا۔ فوری طور پر علاقے میں کرفیو لگا دیا گیا۔ دوسرے دن ایک گھنٹے کے لئے کرفیو اٹھایا گیا تو کرنل گلزار کو پتہ چلا کہ کچھ شریہند لوگ میونسپل کمیٹی کی عمارت کے نزدیک فسادات پھیل رہے تھے۔ کرنل گلزار فوری طور پر وہاں پہنچا تو کچھ لوگ دوکانوں کے تالے توڑ رہے تھے اور کچھ دوکانیں توڑ کر سامان لوٹ رہے تھے۔ کچھ آگ لگا رہے تھے۔ ان سب کو وہاں سے جانے کے لئے وارننگ دی گئی لیکن فرق نہ پڑا، فسادات کا حکم دینا پڑا۔ سات آدمی موقع پر ہلاک ہو گئے لیکن فسادات پر مکمل طور پر قابو پا لیا گیا۔ بعد میں قائد اعظم نے کراچی میں اس مثالی کارکردگی اور دیر پا امن قائم رکھنے پر اس یونٹ کو خصوصی مبارک باد دی۔ یاد رہے کہ فساد برپا کرنے والے سب مسلمان تھے۔ اسی طرح منڈی بہاء الدین میں بھی کچھ اسلام کو خطرناک بلوائیوں پر فائر کھولنا پڑا جس سے چھ آدمی مر گئے۔ پولیس نے انہیں الزام لگا کر میجر اسلم کے خلاف کیس بنا دیا۔ انکوائری کا حکم دیا گیا اور یہ انکوائری ایک انگریز آفیسر کرنل بلڈف نے کی۔ اُس نے میجر اسلم کو تمام الزامات سے بری کیا اور اس کی کارکردگی کو سراہا۔ نتیجتاً جنرل میسرودی، کمانڈر انچیف کی طرف سے میجر محمد اسلم اور اس کی بیٹی کو تعریفی سند عطا کی گئی۔

عزیز و اقارب بھی فسادات کی زد میں آئے اور کنبے لے کنبے مارے گئے۔ ان حالات میں جوانوں میں نفرت، غصہ، بدلہ لینے کا جذبہ ایک فطری عمل تھا۔ ایسے حالات میں انسان اکثر وحشی بن جاتا ہے۔ ان حالات میں بہت ہمت و دل گردے والا جوان ہی اپنے جذبات پر قابو رکھ سکتا ہے۔ لیکن داد و دینی پڑتی ہے برٹش انڈین فوج کے ڈسپلن کی کہ ان حالات میں بھی پُر سکون رہی اور اپنے جذبات کے خلاف اپنا فرض نبھایا۔ ایک اچھی فوج ہمیشہ اور ہر حال میں ڈسپلن کی پابند رہتی ہے۔ یہی خصوصیت ایک معیاری فوج کو عام لوگوں سے ممتاز کرتی ہے۔ یہی وہ صلاحیت ہے جس نے برطانیہ جیسے ایک چھوٹے سے جزیرے کو دنیا کی عظیم اور سب سے بڑی ایمپائر بنا دیا۔ (عسکریت پسندوں)

○❁○

میں بھی اس کی کئی مثالیں موجود ہیں اور برٹش فوج میں بھی۔ فوج سب سے بڑا قومی ادارہ ہے اور اس کی کارروائی ہمیشہ قومی مفاد میں قومی سطح پر ہی ہونی چاہئے۔ برٹش انڈین آرمی کی تربیت اس معیار کی تھی کہ فوج نے بلا چوں و چراں اپنا فرض نبھایا سوائے کچھ تعصب پسند کالی بھیڑیوں کے جو ہر جگہ اور ہر ادارے میں ماحول خراب کرتی رہتی ہیں۔ ہندوستانی فوج کسی خاص علاقے اور خاص مذہب کے لوگوں پر مشتمل نہ تھی۔ اس میں ہر مذہب، ہر نسل اور ہر علاقے کے لوگ موجود تھے۔ یہ لوگ کئی سالوں تک جرمنی اور جاپان کے خلاف کدھے سے کدھا ملا کر لڑے۔ خطرات کا مشترکہ طور پر مقابلہ کیا۔ ایک دوسرے کی زندگیوں کی ضمانت بنے۔ ایک دوسرے سے دوستیاں اور جذباتی لگاؤ تھا۔ انڈین فوج میں ایک وسیع تعداد کا تعلق پنجاب سے تھا جو شدید طور پر متاثر ہوا۔ ان سپاہیوں کے گاؤں، روستا دار اور

بچوں اور بڑوں کے محروف ادیب

خادم حسین مجاہد

کی طلبہ کے لیے وطن کی محبت سے بھرپور

کہانیوں پر مشتمل کتاب

حُرمت وطن

شائع ہو گئی ہے

ملنے کا پتہ ادارہ مطبوعات طلبہ

اے ذیلدار پارک اچھرہ لاہور 042-7553991



قیمت 70 روپے

دو گنا خسارہ

شامت در شامت



صفحہ 92

کفارہ

لفظی پوسٹ مارٹم

سب کی تمنا پاکستان مخالف بنے تھے

کچھ مزید واقعات

الیہ مشرقی پاکستان میں ہماری پیور کریسی کا بڑا ہاتھ ہے جس نے ایسے
ناگفتہ بہ حالات پیدا کئے جنہیں ہماری مسلح افواج آخروں تک سمجھاتی ہیں۔

☆ ملک محمد ساجد گل اعوان

کے ایک تھیٹر میں بم پھینکے جس سے بھارتی شہریوں کے
موسلے بہت ہو گئے اور ان کی اکثریت اگر تلہ سے
بھاگ گئی۔ مشرقی پاکستان کے ان تمام رضا کاروں اور
اسلام پسند قائدین کی خدمت میں مجھے بس یہی کہنا ہے۔
ہاں گروہ کے از ساغر وفا مستند
سلام ما برسانید ہر کجا ہستند

میجر جنرل نذر حسین شاہ جی اوسی 16 ویں ڈویژن
اور بریگیڈر جنرل حسین ملک 205 انفنٹری بریگیڈ جیپ
میں رنگ پور سے اپنے ہیڈ کوارٹر جا رہے تھے جبکہ دشمن
کے ٹروپس ان کے عقب میں آ گئے جب دونوں افسران
دریا پار کر کے آ گئے تو معلوم نہیں تھا کہ دشمن آ گئے آ
چکا ہے جس نے ان دونوں کو دیکھ لیا تھا اور دشمن نے فوراً
گھات لگایا۔ جیپ جب قریب پہنچی تو دشمن کی طرف

”حکایت“، فروری 2015ء کے شمارے میں کرٹل
سکندر خان بلوچ کا مضمون ”سب بنگالی
تو پاکستان مخالف بنے تھے“ نظر سے گزرا جس کی تائید میں
کچھ مزید واقعات قارئین کرام کے شرف نظر کرتا ہوں۔

ہیڈ لیفٹیننٹ جنرل امیر عبد اللہ خان نیازی کہتے
ہیں کہ ”البدیر“ میں حد درجہ وفادار لوگ شامل تھے جنہوں
نے خود کو پاکستان کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ ”الغفس“
والے بھی بڑے محبت وطن پاکستانی تھے۔ دونوں تنظیموں
نے دل و جان سے پاک افواج کا ساتھ دیا اور کبھی دغا نہ
دی اور نہ ہی ہمارا ساتھ چھوڑ کر مکتی پہنی سے ملے۔ مجھے
اپنے کمانڈر کو دشمن کے علاقے میں بھیجنے کی اجازت نہ
تھی۔ چنانچہ دشمن کی سرزمین پر یہ کارروائیاں ”البدیر“ اور
”الغفس“ کے رضا کار کیا کرتے تھے انہوں نے اگر تلہ

تبخیر معدہ کے مایوس مریض متوجہ ہوں
مفید ادویات کا خوش ذائقہ مرکب

ریمینال شربت

تبخیر معدہ اور اس سے پیدا شدہ عوارضات
مثلاً دائمی بخش، گھبراہٹ، سینے کی جلن، نیند کا
نہ آنا، کثرت ریاخ، سانس کا پھولنا، تیز ابیت
معدہ، جگر کی خرابی اور معدہ کی گیس سے پیدا
ہونے والے امراض کے لیے مفید ہے۔

اپنے قریبی دوا فروش سے طلب فرمائیں

نوٹ

تبخیر معدہ وغیرہ امراض کے طبی مشورے کے لئے



ممتاز مطب

سے رابطہ فرمائیں

ممتاز دوا خانہ (رجسٹرڈ) میانوالی

فون: 233817-234816

۔۔۔ گولی چلی ڈرائیور نے جب کو نہایت پھرتی سے روکا
اور موٹر تو جنرل نذر حسین شاہ اور بریگیڈیئر محل حسین
ملک جیپ سے کود گئے اور ادھر ادھر روپوش ہو گئے پھر
رات کی تاریکی میں دونوں گھات سے نکلے۔ انہیں ایک
مکان نظر آیا۔ یہ ایک بنگالی مسلمانوں کا تھا دونوں اس
میں داخل ہو گئے وہاں ایک بنگالی مسلمان اور دو اس کی
بیٹیاں تھیں جب انہیں پتہ چلا کہ یہ تو دونوں پاک افواج
کے اعلیٰ افسران ہیں تو اس بنگالی مسلمان نے دونوں کو
اپنے گھر میں چھپا لیا۔ بھارتی سروسے بھی ان کے
تعاقب میں اندر آ گئے انہوں نے اس بنگالی مسلمان سے
کہا کہ پاک افواج کے افسران اندر ہیں تو اس نے
صاف انکار کر دیا جب اس کی دونوں لڑکیاں سامنے
آئیں تو بھارتیوں نے دونوں کو ہر گز نہ سہارا اور ان کی
عصمت دری کر دی۔ اس بوڑھے مسلمان بنگالی نے پاک
افواج کے دو سینئر افسران کی خاطر اپنی معصوم بیٹیوں کی
عزت قربان کر دی مگر اپنی زبان پر قائم رہا اس دوران
دونوں افسران وہاں سے چائے تھے۔

ہندو میجر سید خیر جعفری اپنے ”یادگار سفر“ میں لکھتے
ہیں: میں جنرل نیاداسی کے ہمراہ بمبئی کا سفر میں مین سنگھ
اور کوسیلا گیا۔ دریا اور ندی تالے بھرے ہوئے تھے،
بستیاں پانی میں اس طرح گھری ہوئی تھیں کہ اگر لوگ
گھروں سے باہر قدم رکھ لیں تو پانی میں جا پڑیں۔ مین
سنگھ اور کوسیلا میں جنرل نیاداسی کی مصروفیات دیکھ کر
اندازہ ہوا کہ عسکری قیادت اور سیاسی مصلحتوں کے
ڈانڈے ملے ہوئے ہیں۔ دونوں مقامات پر بارش کے
باوجود لوگوں کا ایک خاصا بڑا ہجوم استقبال کے لئے موجود
تھا۔ فوج اور سول افسران امن کمیٹی کے نمائندے، ملیشیا
کی شلوار قمیص میں ملبوس ”البدو“ اور ”القمس“ کے
خاکار پاکستان زندہ باد کے ٹلک شکاف نعرے لگا رہے
تھے۔ ایسے لگتا تھا کوئی فوجی کمانڈر نہیں بلکہ صوبے کا

زبان سکھائے۔ تو یوں انہوں نے ہمارے لئے ایک استانی کا بندوبست کر دیا۔ اس استانی نے ہمیں بنگلہ زبان کی تعلیم دینی شروع کر دی اور ہم کچھ عرصہ بعد اس قابل ہو گئے کہ بنگلہ پڑھ لکھ اور سمجھ سکیں۔ کیپٹن حسین محمد ارشاد (جو کہ بعد میں بنگلہ دیش کے صدر بنے) میرے کورس میٹ تھے جو ڈھاکہ میں تھے، بعد میں میرا تبادلہ بھی ڈھاکہ میں ہو گیا تو وہ مجھے ملنے آئے اور میں ان کے ہاں جاتا رہتا جس سے دن بڑے اچھے گزرنے لگے۔ بنگلہ آرمی کا ایک سابق چیف آف سٹاف بھی میرا کورس میٹ تھا وہ شملہ ڈھاکہ کے بعد جب یہاں سے بھیجا گیا تو اس نے اپنی واپسی پر مجھے فون کیا کہ میں آپ سے ملاقات کا متمنی ہوں تو میں اسے ملنے گیا اور اُسے کچھ چیزیں بھی بطور تحفہ دیں۔

میں نے وہاں مشرقی پاکستان میں دیکھا کہ ہمارے یہاں سے گئے ہوئے افسران بنگالی بھائیوں کو اپنے قریب نہ آنے دیتے تھے جبکہ انہیں ہم سے محبت تھی اگر سب لوگ میری طرح کرتے تو یہ فرقیں جڑ جڑ پر ویاں نہ پھٹیں جسے ہمارے ازلی دشمن نے خوب ہوا دی۔ ایسے حالات بیوروکریسی کے پیدا کردہ تھے کہ جب بھی کوئی بنگالی کسی مغربی پاکستانی آفیسر سے ملنے جاتا تو اسے کئی کئی دن ملاقات کے لئے دفتر کے چکر لگانے پڑتے تھے۔ الیہ مشرقی پاکستان میں ہماری بیوروکریسی کا بڑا ہاتھ ہے جس نے ایسے ناگفت بہ حالات پیدا کئے جنہیں ہماری مسلح افواج آخروں تک سلجھاتی رہیں۔ میں نے جنگ ستمبر 1965ء مشرقی محاذ پر لڑی اُس وقت ہم ایک تھے تو دشمن کو ہماری طرف آنکھ اٹھانے کی جرأت نہ ہو سکی جبکہ دسمبر 1971ء میں اس کا فقدان تھا اور ملک دو ٹکٹ ہو گیا۔ 1966ء میں میری وہاں سے مغربی پاکستان پوسٹنگ ہو گئی۔

وزیر اعلیٰ آن اتر ہے جنرل صاحب نے دونوں مقامات پر عوام الناس سے خطاب بھی کیا۔

جنرل عبدالرؤف خان نیازی کہتے ہیں۔ 1963ء کا ذکر ہے میں آرمی میں کیپٹن تھا کہ میری پوسٹنگ مشرقی پاکستان میں ہو گئی میں نے اپنی اہلیہ کو کراچی اپنے والدین کے پاس چھوڑا اور خود مشرقی پاکستان روانہ ہو گیا۔ سو بار گاؤں میں میری پوسٹ تھی۔ ایک دن میں کھانا کھانے ایک ریسٹورنٹ میں گیا۔ نیپل پر بیٹھا تو ایک صاحب جو پہلے ہی ایک دوسری نیپل پر براجمان تھے مجھے کہنے لگے کیا میں آپ کے ساتھ شیئر کر سکتا ہوں؟ میں نے کہا ضرور۔ تو یوں وہ میری نیپل پر آ گئے۔ وہ مشرقی پاکستان کے ایک سیاستدان تھے، مجھ سے کہنے لگے۔ دیکھیں آپ آرمی کے ایک کیپٹن میں اور مغربی صوبہ سے یہاں بسلسلہ ملازمت آئے ہیں۔ میری آپ کو چند تصدیقیں ہیں اگر انہیں اپنا میں کو بہت کامیاب رہو گے۔ میں نے کہا ارشاد فرمائیں، کہنے لگے۔ ایک تو ان بنگالیوں کو اپنے قریب رکھنا یہ مغربی پاکستانی بھائیوں کی محبت کے متلاشی ہیں۔ دوسرا یہاں رہ کر بنگلہ زبان سیکھنے کی کوشش کرنا۔ میں نے اپنے صوبیدار سے کہا کہ یہاں کا صاحب حل و عقد کون ہے؟ انہوں نے کہا کہ وہ ایک بنگالی ہے اور اس کا نام غلام مرشد ہے۔ میں نے انہیں فون کیا کہ میں کیپٹن نیازی مغربی صوبہ سے یہاں آیا ہوں اور آپ سے ملاقات کا خواہش مند ہوں۔ وہ بڑے حیران ہوئے۔ اچھا آپ مجھ سے ملیں گے۔ چشم مارو شن دل ما شادا آج تک تو کسی مغربی پاکستانی کو یہ توفیق نہیں ہوئی، ضرور تشریف لائیں۔ میں ان کے گھر گیا تو وہ بہت خوش ہوئے میں نے ان سے کہا۔ میری اہلیہ بھی مغربی پاکستان سے آنے والی ہیں، ہم دونوں کا ارادہ بنگلہ زبان سیکھنے کا ہے۔ اس لئے ہمارے لئے ایک استانی کا بندوبست کروں جو ہمیں بنگلہ

ساج کی زنگ آلود زنجیروں اور بیڑیوں سے خود کو آزاد کر کے ذہن کے درپچوں سے دنیا کا فرسودہ گرد و غبار ہٹا کر بھی انسان مطمئن نہیں ہوتا۔

قفس



☆ نسیم سیکندر صدف

یہ گھر کے ماحول کو متحد سنانوں میں تبدیل کر دیا تھا۔ ایک ایسی چپ اتری تھی ماں پر کہ بس ضرورتاً بات کر تیں ورنہ گھر میں کام کاج کے علاوہ قرآن پاک کی تلاوت میں مگن رہتیں۔ گھر میں لگے پودوں اور درختوں پر صرف پرندوں کے بولنے کی آوازیں آتیں۔ کوئی ایک دوسرے کے ساتھ بہت کم فہم بول کے بات کرتا۔

قیام پاکستان کے وقت شمشاد چوہدری کی متاع گل ماں جی اور بڑے بھائی رحمن کو اباجی کے لنگوٹیا یا رندو

سو فیصد سچا واقعہ ہے۔ اس سے متعلقہ کرداروں کے خاندان عزت دار لوگ ہیں۔ اس لئے کرداروں کے نام اور مقام تبدیل کر کے تحریر کر دی ہیں۔ اس میں ہم سب کے لئے خصوصاً نوجوان لڑکیوں کے لئے عبرت ہے جو نوجوانی کے رنگین خوابوں میں کھو کر والدین اور بھائیوں کی عزت کو اندھا دھند روند کر من چاہی منزل کی جانب سفر کرتی ہیں۔

اباجی کی جوانی کی موت نے شمشاد چوہدری کے

ششو پورہ میں کسی ملنے والے کے توسط سے ہوئی۔ جھیز کی بیشتر قیمتی چیزیں اور نگریب نے بھجوائی تھیں۔ مگر سسرال نے قدر نہیں کی۔

اریشا کو بہت جاہل قسم کا ماحول ملا۔ کچی عمر میں دیکھے گئے خوابوں کے رنگ بھی کچے ہوتے ہیں۔ ناگہمی کی عمر میں ایسے خواب دیکھنے والی معصوم لڑکیوں کو ان کی بھیا تک تعبیر کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ سوان کو پھر عمر بھر بھگتنا ہی پڑتا ہے۔ جب کبھی وہ نامو کی آتی اس کے چہرے پر اس کی زندگی کے حالات رقم ہوتے مگر سب بھور تھے کہ اب وہ دو بچوں کی ماں تھی۔ کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

شزا جو گھر میں چھوٹی ہونے کی وجہ سے گھر بھر کی لاڈلی تھی، اسی وجہ سے خود سری ہو گئی تھی۔ عطیہ خاں اور محمود چاچا پر سہا برس سے سناٹے والے گھر میں مقیم تھے۔ دونوں گھرانوں میں محبت یگانگت کا بے مثال رشتہ تھا۔ ہر مشورہ ایک دوسرے سے لیا جاتا جو کبھی کبھار ایک دوسرے کو کھلائے بغیر کھایا نہ جاتا۔ عطیہ خاں اکثر اسی سے کہتی شزا نے اگلے گھر بھی جانا ہے، اسے گھر کے کاموں کی عادت بھی ڈالو۔ مگر شزا اسی کے کہنے پر بھی گھر کیلے کام کاج میں ماں کا ہاتھ نہ بٹاتی۔

عطیہ خاں کی دو بڑی بیٹیاں تھیں جو اپنی پھوپھی کے گھر گوجرانوالہ شہر میں بیای ہوئی تھیں اور بہت خوش تھیں۔ کبھی کبھار ہی میکے رہنے آتیں۔ جب بچوں کو چھٹیاں ہوتیں۔ ایک بیٹا تھا فراز وہ اسلام آباد میں تعلیم کے سلسلے میں ہاسٹل میں مقیم تھا۔ جب بھی گھر آتا تو دونوں گھروں کی رونقیں جاگ اٹھتیں یا تو وہ شاہ زیب کے پاس ہوتا یا اُسے اپنے گھر بلا لیتا۔ ساری رات خوب ہلا گھ ہوتا۔ شاہ زیب گریجویشن کے بعد لوہے کے کارخانے میں باپ کے ساتھ شامل ہو گیا جہاں ایٹمسل بنے تھے جو دوسرے شہروں میں جاتے تھے۔

لال نے خنجر کے پے در پے وار سے اپنے ہی گھر کی دہلیز پر ڈھیر کر دیا۔ گاؤں میں مسلمانوں کے گھروں کو روز آگ لگنے لگی تو اس کے گاؤں میں رہنے کا جواز ہی نہ بچا۔ گاؤں میں جان بچا کر بھاگنے والے قافلے کے ساتھ شمشاد چوہدری بھی غم آنکھوں سے دشمنوں کی نظر سے بچتا بچاتا، بھوکا پیاسا، راستوں کی صعوبتیں سہتا ہوا لاہور کے کسب میں پہنچا جہاں کوئی ہی خوش قسمت خاندان تھا جو مکمل پاکستان پہنچا تھا ورنہ تو ہر کسی کا دکھ دوسرے سے بڑھ کے تھا۔ چار سمت نوے ہی نوے تھے۔ ذات برادری، امیری و غریبی سب بھولے بیٹھے تھے۔ بس روٹی کے لالے تھے جو کسب کو گھیرے ہوئے تھے۔

یہیں پر رہتے ہیں ایک ماموں سے ملاقات ہو گئی جو اپنے خاندان میں صرف ایک بیٹا زندہ لے کر نکلے میں کامیاب ہو سکے تھے۔ دونوں ماموں سماجی گاؤں نامو کی میں آباد ہو گئے۔ ان کے حصے میں کئی سرے زرخیز زمین آئی تھی۔ جو پہلے ہندوؤں کے قبضہ میں تھیں، 1947ء میں قیام پاکستان کے بعد وہ چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ جب یہ لوگ ذرا سیٹ ہوئے اپنے گھروں میں تو ماموں نے نسرین نامی ایک لاوارث لڑکی سے شمشاد چوہدری کی شادی کرادی جس سے دو بیٹے اور نگریب اور شاہ زیب اور بیٹیاں اریشا اور سزا پیدا ہوئیں۔

سب سے بڑا اور نگریب اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلینڈ گیا تھا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد جب پاکستان لوٹا تو یہاں رشتے آنے لگے۔ ماں نے پاؤں سے رشتہ کرنا چاہا تو اس نے منع کر دیا کہ میری جاب بھی وہیں ہے اور میں شادی بھی وہیں کروں گا۔

شمشاد چوہدری نے بننے کی خوشی میں خوش ہونا مناسب سمجھا اور نگریب واپس لوٹ گیا اور وہیں کسی گوری سے شادی کر لی۔ وہیں اس کے بیچے پلے بڑھے، گھر خرچہ البتہ پابندی سے بھجواتا تھا۔ جبکہ اریشا کی شادی

ضرورت اور خواہش

زندگی کی ضرورت کی طرح گزرو خواہش کی طرح نہیں۔ کیونکہ ضرورت فقیر کی بھی پوری ہو جاتی ہے اور خواہش بادشاہ کی بھی پوری نہیں ہوتی۔

(نبیلہ نازش۔ اداکارہ)

کی قدر وقت کو محسوس کرنے اور سرائے کا ایک الگ ہی خانہ ہوتا ہے۔ اگر وہ خانہ بند ہو اور اس پر محبت کے سرکش جذبے کا بھاری ڈھکن رکھ دیا جائے تو پھر خون کے رشتے کی اہمیت بھی ختم ہو جاتی ہے۔

محبت میں وہ اس قدر جھوٹی ہو گئے تھے کہ جدائی اُن کے لئے موت کے مترادف تھی۔ چند مہینوں سے محمود چاچا فراز کے ویزے کے لئے کوشاں تھے۔ آخر اُن کی امید برآئی اور سعودیہ کا ویزہ مل گیا۔ وہ پاسپورٹ بنوانے میں مصروف ہو گیا اور شزا کی بے قراری عروہ پہ تھی۔ انہی دنوں ملنے والوں کے توسط سے ایک رشتہ آیا تو ابابا اور امی اس پر غور و خوض کر رہے تھے اور شزا کی توجہ جان ہی نکل گئی وہ تو فراز کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ لہذا فراز کے ملنے پر اس کے رشتے کا ذکر کیا تو فراز کے دل میں بھی وسوسے اتر آئے۔

کبھی انسانی خدشات حقیقت کا روپ دھارنے میں زیادہ دیر نہیں لگاتے۔ شاید انسان کے اندر ابھرتے خوف اور وہم کا تقدیر اور پیش آنے والے واقعات سے کچھ خاص اور براہ راست رشتہ ہوتا ہے۔

فراز نے شزا کو سمجھایا کہ سیدھے طریقے سے ہمارا ایک ہو جانا ممکن ہے۔ اس کا آخری حل یہی ہے کہ نکاح ہو جائے تو پھر ہمیں کوئی جدا نہیں کر سکے گا۔ ہمارے گھروں کے حالات ہمارے حق میں موافق ہوتے ہی ہم گھر والوں کو بتا دیں گے۔ اگر راضی نہ ہوئے تو تمہیں

انگلینڈ سے بھائی نے لاڈلی بہن کی فرمائش پر لپ ٹاپ بھیج دیا تو شزا کی تو موہیں ہی ہو گئیں۔ فلم کے ہر رومانوی سین میں وہ ہیر وئن کی جگہ خود کو محسوس کرتی اور کالج سے آتے ہی اس کے سامنے بیٹھ کر خوابوں کی دنیا میں ایک ہینڈم سے ہیر وڈ کے ساتھ خوابوں کی دنیا میں نکل پڑتی۔ وہ خود کو ایسا بنا سنوار کر گھر سے نکلتی کہ دیکھنے والوں کی نظر اس پر ٹھہر جائے۔ وہ ایک ایسے رائجے کی تلاش میں تھی جو فلمی ہیر وڈ کی طرح اس سے محبت کرے۔ انہی دنوں سامنے والے محمود چاچا اور عطیہ خالہ کا بیٹا فراز تعلیم سے فراغت کے بعد گھر لوٹ آیا تھا۔

شزا اپنے دھیان میں گاڑ کا جلوہ عطیہ خالہ کو دینے جا رہی تھی کہ کمرے سے نکلے فراز نے آستانا سامنا ہو گیا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر ساکت ہو گئے۔ شزا کو فراز کی شکل میں اپنی تلاش مکمل ہوتی دکھائی دی۔ شزا کی سکرانی اور مخمور آنکھوں اور پُرکشش چہرے کو دیکھ کر فراز کی نظریں مست بدلنا بھول گئیں۔ عام معنوں میں محبت ایک بڑا استعارہ ہے، علامت اور نشانی ہے۔ پیشینگوئیاں رک جائیں گی۔ ظہر بھی رک جائے گا مگر محبت کبھی نہیں رک سکتی۔ گزرتے دنوں میں انہیں ادراک ہوا کہ وہ ایک دوسرے کے بغیر جی نہیں سکتے۔

زندگی میں بہت سی مشکلات درپیش تھیں۔ دونوں کی برادری جدا جدا تھی اور ان کا ایک ہونا ناممکنات میں سے تھا کیونکہ رشتہ کرنے میں دونوں گھرانے قدامت پسندی میں ذات برادری کے پابند تھے۔ فراز نے حوصلہ کر کے شزا سے کہا۔ چلو ہم نکاح کر لیتے ہیں۔ جب ہمارے گھروں کے حالات ہمارے حق میں موافق ہوں گے تو یہ راز کھول دیا جائے گا۔

قدرت نے انسان سے وابستہ دو نعمتیں عطا کی ہیں۔ اول انسانی جان اور دوسرے انسانی رشتے۔ کہنے کو تو ان نعمتوں کو کوئی نہیں جھٹلا سکتا لیکن ایک مسئلہ ہے۔ ان

انھر رہے تھے کہ اس نے غلط کیا یا ٹھیک؟ وہ اپنے آپ کو خودی تسلیاں دلا سے دیتی کہ اس نے اپنا حق استعمال کیا ہے کوئی گناہ نہیں کیا۔ ایسے میں وہ ماں باپ کے حق کو بھول گئی تھی۔

سماج کی رنگ آلود زنجیروں اور بیڑیوں سے خود کو آزاد کر کے ذہن کے درپچوں سے دنیا کا فرسودہ گرد و غبار ہٹا کر بھی انسان مطمئن نہیں ہوتا۔ اس کے اندر ایک عجیب طرح کی اٹھل پھٹل جاری رہتی ہے۔ آخر کار ای نے اس کی اداسی کی وجہ دریافت کر لی۔ اس نے سردرد کا بہانہ بنا کر ٹال دیا۔

بہت بڑا قدم اٹھایا تھا۔ خوف بھی دامن گیر ہونے لگا تھا۔ ابھی نکاح کو بڑھ ہفتہ ہی گزرا تھا کہ فراز کا ویزا آ گیا اور وہ پروپن جاتے ہوئے روتی ہوئی شزا کی آنکھوں میں بہت سے رنکین سینے اور وعدے سجا گیا۔ مگر کوئی شزا اسے پوچھتا۔ پل پل کی جدائی کی داستان اُس کے دل پر رقم ہو رہی تھی۔ صبح اور شام ایک دوسرے کے تعاقب میں گزرتے تھے۔ دو تین رشتے آئے مگر شزا نے بڑھائی کی آڑ میں ٹھکرا دیئے۔ اس بات پر ای بہت ناراض تھیں مگر اریشا نے لاڈ سے بہن کی طرف داری کر دی۔

”وہ جائے گی شادی بھی۔“ اس نے کہا۔ ”میں نے کون سا شکہ پایا ہے شادی کر کے۔“

اور ای نے اُس کا اداس چہرہ دیکھ کر بات بدل دی۔ شزا اور فراز مسلسل رابطے میں تھے۔ ایک دن جب اس نے بتایا کہ نکاح نامہ میں ساتھ لے آیا تھا اور اس پر بیوی کا ویزہ بھی میں نے نکلوا لیا ہے۔ اب بس پاسپورٹ کی فکر کرو۔ وہ خوشی سے رو پڑی۔

”میں تم کو ان سب دوسموں سے دور لے آؤں گا۔“ اس نے شزا کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اپنی جان بنا کر رکھوں گا۔“

بھی سمود یہ لے جاؤں گا پھر ہم اپنی چھوٹی سی جنت میں خوشیاں کشید کر لیں گے۔ شزا بھی راضی تھی اور اس کو بھی اسی بات میں بہتری نظر آئی۔

فراز کا ایک یونیورسٹی فیلو ڈسکہ میں رہتا تھا جس کے والدین کو میڈ شادی پر گئے ہوئے تھے اور وہ اپنی نوکری کی وجہ سے نہیں جاسکا تھا۔ اُن کے گھر میں یہ نکاح ہو سکتا تھا۔ شزا نے اس نکاح پر آمادگی ظاہر کر دی اور مقررہ دن شزا اپنی کالج فیلو دوست اور ہمزماہ رخ کو ساتھ لے کر کالج کی بجائے ڈسکہ نسبت روڈ پر واقع مکان میں پہنچ گئی جو آبادی سے ذرا ہٹ کر تھا اور اگر محلے میں ہوتا تو لوگ سوتا تھیں بناتے۔

”شزا تم جانتی ہو کہ تم کیا کرنے جا رہی ہو؟“ راستے میں ماہ رخ نے اسے سمجھانے کی آخری کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”تم انگاروں پر قدم رکھنے لگی ہو جہاں تم خود تو جلوگی ہی ساتھ اپنے خاندان کی عزت کو آگ کے حوالے کر دو گی۔“

مگر شزا تو فراز کے عشق کی آگ میں جل رہی تھی اسے اس وقت جلتے انگارے بھی بھول گئے تھے۔ اس نے کسی کی نہیں سنی۔ فراز شزا کا عروسی جوڑا اور کچھ لوازمات لئے وہاں موجود تھا اور ماہ رخ نے اُسے دلہن کے روپ میں سجا کر فراز کے پہلو میں بٹھا دیا۔ وہ بھی کالے قمیڑیں سوٹ میں نظر لگ جانے کی حد تک حسین لگ رہا تھا۔ مولوی صاحب بھی آچکے تھے۔ کچھ دوستوں کی موجودگی میں ایجاب و قبول ہوا سب کی برگر، پیزا اور کولڈ ڈرنک سے تواضع کی گئی۔

دوستوں نے چند گھنٹوں کے لئے انہیں تنہائی بخش دی۔ اس چوری چھپے کی تقریب کے فوراً بعد شزا کو ماہ رخ کے ساتھ گھر بھجوا دیا گیا اور عروسی سامان ماہ رخ کے گھر رکھوا دیا گیا کہ شزا کے گھر والوں کو بھنگ نہ مل جائے۔

شزا نے اتنا بڑا قدم اٹھا تو لیا تھا مگر اب اسے ہول

نہیں دیتی۔ اتنا سلاطم برپا ہوتا ہے کہ آنکھوں سے لہو اُٹھ آتا ہے۔ دل جیسے گرداب میں مقید ہو جاتا ہے۔ رات تو جاگتے سوتے گزری گئی کیونکہ فراز ڈسکہ میں بیٹھا اس کی راہ تک رہا تھا۔ اس کے بھائی شاہ زیب کو کچھ دنوں سے اس کی غیر ضروری مصروفیات کی وجہ سے اس پر کچھ شک ہو گیا تھا مگر وہ سمجھ نہیں سکا تھا کہ معاملہ کیا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ نہانے ہاتھ روم میں مٹی تو اس کے شوڈر بیک کو جوڈرینک کے سامنے پڑا تھا، شاہ زیب کے چپک کرنے پر اس میں پاسبورٹ اور ایک خط ملا جو اس نے لکھ کر دکھا تھا کہ جاتے ہوئے کمرے کے وسط میں پڑے نیل پر رکھ جاؤں گی کہ مجھے تلاش کرنے میں وقت ضائع نہ کریں۔ میں بائز طریقے سے نکاح کے بعد اپنے شوہر کے ساتھ جا رہی ہوں۔

پاسبورٹ اور خط دیکھ کر شاہ زیب کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ امی کچن میں ناشتہ تیار کر رہی تھیں۔ وہ نہا کر باجوڑا پہن کر ہاتھ روم سے نکل رہی تھی کہ شاہ زیب نے اس کے سینے پر فائر کیا جو سیدھا دل میں لگا اور اس کی بھیا تک پہنچنے سے سب کے دل دہلا دیئے۔ سب کے جمع ہونے تک خون کے خوارے سے فرش لال ہو رہا تھا اور اس کی روح فراز سے ملنے کی پیاس میں قفس سے رہائی پا چکی تھی۔

اس کی ماں بکھرے خون اور جوان بیٹی کی لاش دیکھ کر دل پر ہاتھ رکھ کے صدمے کے مارے وہیں گر گئی۔ باپ کو علم ہوا کہ بھائی نے بہن کو گولی مار کر ہلاک کر دیا ہے تو اس نے شاہ زیب کا گریبان تمام لیا مگر پھر شاہ زیب کی زبانی سن کر صورت حال کو دیکھتے ہوئے باپ بھی آٹل سمیت غیرت کے قتل میں تھانڈا ڈسکہ کلاں پیش ہو گیا۔

انہی دنوں ماہ رخ کے امی ابو امروہ کے لئے اپنے پاسبورٹ بنوانے سیالکوٹ جا رہے تھے تو ماہ رخ شزا کو نجی ساتھ لے گئی کیونکہ اسے پتہ تھا کہ فراز نے اس کا ویزہ نکلوا لیا ہے۔ پیسوں کا مسئلہ نہیں تھا۔ شزا کو انگلینڈ سے اس کا بھائی اور تکزیب الگ سے بھی پیسے بھجوا دیا کرتا تھا۔ اس لئے اس نے زیادہ پیسے دے کر ارجنٹ پاسبورٹ تیار کروا لیا۔ پلاننگ یہ تھی کہ وہ ساری تیاری سے آ رہا تھا۔ اُس نے شزا کو بتایا وہ تاج محل ہوٹل ٹھہرے گا۔ 22 اپریل کو شزا ہوٹل پہنچنے کی کالج ٹائم اور وہ اسے لے کر فوراً اتر پورٹ روانہ ہو جائے گا۔ پھر مگر والے جب تک ڈھونڈیں گے وہ گھر والوں کی دسترس سے دور ہو جائیں گے۔

21 اپریل کو فراز نے سودیہ سے ڈسکہ آنا تھا اور 22 اپریل کو شزا کے تاج محل ہوٹل آنے پر وہ اتر پورٹ روانہ ہو جاتے۔ جہاں شام کی فکالت تیار ہوگی اور پھر عالم کہانہ ان کے بیچ نہیں آ سکے گا۔ وہ بہت خوش تھی۔ سوتے جاگتے اپنے شوہر کو ملنے کے خواب دیکھ رہی تھی۔ اُس کے تو پاؤں ہی زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ امی نے اس کی غیر معمولی خوشی محسوس کر لی۔

”شزا آج تم بڑی خوش ہو اور یہ نیا جوڑا کیوں پریس کر رہی ہو؟“ ماں نے پوچھ ہی لیا۔ ”کیا خاص بات ہے؟“ اور وہ تھوڑا سا گھبرا گئی۔

”کوئی خاص بات نہیں امی!“ اس نے سنبھل کر کہا۔ ”وہ کل ہمارے کالج میں ایک فنکشن ہے تو اس لئے نیا سوٹ پریس کیا ہے۔“

امی شزا کی بات سن کر مطمئن ہوئی کہ نہیں مگر ان کے چہرے پر تلخ کے آثار ضرور تھے۔ شاید آنے والے وقت کا الہام ان کی چھٹی حس اُن کو دے رہی تھی۔

خیر شزا فراز کی محبت کے حصار میں کھوئی ہوئی تھی۔ کبھی محبت میں اتنی وحشت ہوتی ہے کہ خود محبت بھی سکون

اردو کو آسان کرنے کے لئے بہت سے عربی الفاظ کی املا اب
اردو میں بدل دی گئی ہے جسے محققین کی اکثریت نے قبول کر لیا ہے

اصلاح زبان و بیاں



☆ خادم حسین مجاہد

ہماری قومی زبان ہے مگر لوگ ایم اے اردو کو اردو کہہ لیتے ہیں لیکن درست اردو بول یا لکھ نہیں سکتے۔ اسے کچھ ایسی غلطیوں کی نشاندہی کرتے ہیں جو اب عام ہو چکی ہیں۔

یہ ہماری قومی بدقسمتی ہے کہ دھیرے دھیرے اردو کو دھیس نکالا دیا جا رہا ہے محفل والوں میں تو شاید ہی کوئی درست اردو بولنے والا ہو۔ اخبارات جو کبھی زبان و بیان کا عمدہ نمونہ ہوا کرتے تھے اب ان میں بھی غلطیوں کی بھرمار ہوتی ہے۔ ایک اچھی خبر بھی سننے میں آئی ہے کہ گورنمنٹ سکولوں میں نرسری سے سوم تک نصاب اردو میڈیم کر دیا گیا ہے جہاں پہلے آکسفورڈ کا نصاب پڑھایا جا رہا تھا جو انگریز بچوں کے لئے تیار کیا جاتا ہے ظاہر ہے ہمارے بچے انگریز نہ تھے اس لئے اس کے ساتھ نہ چل سکے تھے کہ علم تعلیم والے اساتذہ کو نوکریوں کے لالے پڑ گئے تو حکومت کو رحم آیا۔ اس دعا کے ساتھ کہ حکومت کو مزید عقل

آجائے اور وہ باقی کلاسوں کا نصاب بھی اردو میں کر دے۔ کچھ ایسی غلطیوں کی نشاندہی کرتے ہیں جو اب عام ہو چکی ہیں۔

اکثر اخبارات محفل اور ہماری گفتگو میں ایک مرکب استعمال ہوتا ہے ”بیرون ممالک“۔ یہ بالکل مہمل مرکب ہے، بیرون اندرون کی ضد ہے جس کا مطلب ہے باہر لہذا بیرون ممالک کا مطلب ہوا ممالک کے باہر جو کہ ایک بے معنی سی بات ہے اس کی جگہ بیرونی ممالک لکھا جائے یا بیرون ملک۔ چار اطراف یا چہار اطراف غلط ہے درست ہے چاروں طرف اسی طرح ”دونوں اطراف“ بھی غلط مرکب ہے۔ درست ہے دونوں طرف یا صرف اطراف کیونکہ اطراف کا مطلب ہے دو طرف۔ تین اطراف بھی غلط ہے۔ چاروں طرف کی جگہ اطراف

”نام کی وجہ تسمیہ“ غلط جملہ ہے کیونکہ تسمیہ میں اسم یعنی نام موجود ہے۔ ”آسانی“ بغیر م کے اسامی ہے جس کا مطلب ہے لوگ نوکری عہدہ کا کب کسان یہ عربی میں اسم کی جمع الجمع ہے لیکن اردو میں بطور واحد مستعمل ہے۔ آسام کے رہنے والے کو البتہ آسانی کہہ سکتے ہیں۔

”بربریت“ کا لفظ ظلم و وحشت کے معنوں میں عام استعمال ہوتا ہے جو کہ انگریزی اصطلاح Barbarism کی اردو ہے۔ طارق بن زیاد بربر تھے اور ان کے ساتھ بربر قبیلے کے جنگجو بھی تھے جنہوں نے اسپین میں پورے کی متحدہ فوج کو شکست دی تو ان کو بدنام کرنے کے لئے یورپ نے یہ اصطلاح گھڑی ہمیں اس کی جگہ ”سریت“ ”چٹیزیت“ یا پھر ”امریکیٹ“ کہنا چاہئے مگر ہم سوچتے ہی نہیں کہ ہم جو مسلمان مجاہدین کو ظالم اور وحشی کہہ رہے ہیں۔

کچھ الفاظ کا ہم عموماً اعراب غلط پڑھتے ہیں مثلاً بشارت کی ب پ پر یا پیش پڑھی جاتی ہے جبکہ بربر ہے اسی طرح درخشاں کی ڈ پر زبر پڑھی جاتی ہے لیکن پیش ہے۔ طول عمرہ کی و پر جزم پڑھی جاتی ہے جبکہ اس پر تشدید اور زہر ہے۔ مزاح کی م پر عموماً زبر پڑھی جاتی ہے لیکن اس پر زیر ہے۔ تقدس سرہ میں ق پر پیش ہے جبکہ عموماً زبر پڑھی جاتی ہے۔ صوم کو شوہر کے معنوں میں بولا جاتا ہے لیکن اس سے مراد ہے لڑکی کا مرد۔ آزاد عورت کا مرد خاوند کہلاتا ہے۔ اردو کو آسان کرنے کے لئے بہت سے عربی الفاظ کی الماب اردو میں بدل دی گئی ہے جسے محققین کی اکثریت نے قبول کر لیا ہے جبکہ کچھ کا خیال ہے کہ عربی الماب بہتر تھی اور زیادہ خوبصورت تھی اور اس سے عربی اور اردو کا رشتہ سمجھ میں آتا تھا بہر حال ہم اس کے کچھ نمونے پیش کرتے ہیں۔ اعلیٰ سے اعلا۔ ادنیٰ سے ادنا۔ زکوٰۃ سے زکات۔ جیسے سماء سے سمات۔ مسمیٰ سے معما۔ مولیٰ سے مولا۔ علیحدہ سے علاحدہ۔ مولنا سے

دعوت یا اطراف و اکناف بھی لکھا جاسکتا ہے کیونکہ ان کا مطلب بھی چاروں طرف ہی بنتا ہے یعنی اطراف کا مطلب ہوا و طرف اور دعوت یا اکناف کا مطلب ہے دو پہلو کوٹنے طرف۔

”آئمہ“ غلط ہے۔ بغیر م کے ائمہ ہے جو امام کی جمع ہے اور عربی کا لفظ ہے۔

”منہ“ غلط ہے درست منہ ہے۔ آتش بازیاں پھوٹنا غلط روزمرہ ہے درست ہے آتش بازیاں چھوٹنا۔ ”دیہاڑی غلط ہے درست ہے دیہاڑی اسی سے دن دیہاڑے ہے۔

”لئے کئے دیئے“ سب غیر مزہ کے درست ہیں جیسے لیے، دیے، کیے۔ ”دوکان“ بغیر واؤ کے ”دکان“ درست ہے۔

”سمجھ آگیا“ یا ”سمجھ آگئی“ دونوں غیر صحیح اور غلط العوام ہیں جو درست نہیں۔ درست ہوگا ”سمجھ میں آگیا“ یا ”بات سمجھ میں آگئی“۔ سمجھ نہیں گئی بولنا بھی غلط ہے۔ علیٰ بن ابی القیس، مافی الضمیر، نصف النہار جیسے عربی مرکبات کی عربی الماب ہی درست ہے۔

”پال ہانکا کرنا“ درست نہیں۔ ”پال بیکا کرنا“ درست ہے۔ ہانکا اور بیکا دونوں کا مطلب میڑھانی ہے مگر بیکا صحیح ہے۔ جزل کا مطلب ہے اخبار رسالہ جبکہ جزل فوجی عہدہ ہے ان کے استعمال میں عموماً احتیاط نہیں کی جاتی۔ جب کسی کو پکارا جائے تو اس میں نون غنہ نہیں آتا جیسے اے شیر دل جوانوں، سو جاؤ بچوں غلط ہے درست ہوگا۔ اے شیر دل جوانو! سو جاؤ بچو! افی الحان کو فلحال نہیں لکھ سکتے نہ فی الوقت کو فلوقت اور بالفرض کو بلغرض ان کا عربی الماب لکھیں گے۔ ”گاہے بگاہے“ غیر صحیح ہے اس کی جگہ گاہے گاہے ”لکھنا اور بولنا“ درست ہے۔ ”جائے وقوع کی بجائے جائے وقوع درست ہے۔ ”سارم“ کی درست الماب ”صارم“ ہے مطلب ہے منتظم۔

طیفہ

میرے اسکول، مساجد، بازاروں، فوجیوں اور پولیس پر حملے ہوں اور مجھے کہا جائے کہ تمہارے ملک میں انقلابی تحفظ نہیں..... واہ کیا لطیفہ ہے۔

(ریاض عاقب کوہلر)

اور ہندو اور چھوکی جمع میں بھی ہمزہ آئے گا یعنی ہندوؤں، چھوؤں (وہیے ان میں فطرۃ بھی کوئی فرق نہیں)

رضائی کی اصل المارزیدن رنگنا سے رزائی ہے لیکن اب یہ غلط العام ہو گیا ہے۔ قلی اصل الما ہے قلی کا اور منہدی ہندی کا۔ انگریزی کے وہ الفاظ جن کے شروع میں ایس (S) آتا ہے اور تلفظ میں ای (E) کی آواز نکلتی ہے اردو الما میں الف سے لکھے جائیں گے جیسے School کو اسکول، State کو اسٹیٹ، Special کو اسپیشل اور Stool کو اسٹول وغیرہ۔

فارسی کے مرکبات عطی مثلاً دیرہ و دل، جاہ و جلال، ماہ و سال، رمز و کنایہ، رسم و راہ، جنگ و شام وغیرہ میں ”و“ پر ہمزہ لکھنے کی کوئی گنجائش نہیں۔ اسی طرح فارسی مرکبات اضافی و توصیلی میں پہلے لفظ کے آخر میں ’رئی‘ ہونا اضافت (کا کے کی) ظاہر کرنے کے لئے ’ئی‘ کے نیچے زیر لگائی جائے گی ’ئی‘ پر ہمزہ لگانا غلط ہوگا جیسے نختی ایام، خرابی وقت، جوشی ہند، شوشی رفتار، علی، الی، حتیٰ کو اسی طرح لکھا جائے انہیں علامہ، الامہ میں نہیں بدلا جائے گا کیونکہ یہ اسماء نہیں بلکہ حروف جار ہیں۔ غلط العام جو غلطی عام ہو جائے اور درست مانی جائے جسے تو تا اب طوطا بھی درست سمجھا جاتا ہے، غلط العوام جو غلطی عام ہونے کے باوجود غلطی سمجھی جائے۔

(استغافہ: خبر لیجئے زبان بگڑی اطہر ہاشمی۔ اردو الماء از فرمان فتح پوری۔ الماء نمبر نگار)

مولانا، تقویٰ سے تقواء، مدعی سے مدعاء، معنی سے معلاء، اسٹیل سے اسٹائل، حلیم اللہ تعالیٰ کا نام ہے اس لئے دال اور گوشت کے آمیزے کو حلیم کہنے کی بجائے بجائے ”ایم، یکم یا داکیم کہنا بہتر ہے۔ تا نکا جھانکی ویسے بھی غلط ہے لیکن اس کی وہ الماء بھی درست نہیں۔ درست الما ہے تاکا جھانکی۔

گھما گھمی دراصل محمول گھائی کا مخفف ہے اس لئے اس کی درست الما ہے گھما گھمی۔ مصالحو کا درست الما سالہ ہے ویسے تو مضمون کی کانٹ چھانٹ درست نہیں لیکن اس کا الماء بھی درست نہیں درست الما ہے کاٹ چھانٹ اسی طرح بانٹا غلط ہے درست ہے بانٹا۔ کچھ الفاظ میں ”ے“ ہمزہ کے بغیر آئے گی جیسے گائے، چائے، اے، ہائے، اور ”ڈ“ پر کچھ الفاظ میں ہمزہ نہیں آئے گا جیسے ناؤ، دیو اور کچھ الفاظ میں ”ے“ پر ہمزہ آئے گا جیسے سوائے، بجائے۔ اسی طرح ”ئی“ پر بھی بعض الفاظ میں ہمزہ آئے گا جیسے کوئی، روئی سوئی، چھوئی سوئی، کئی، گئی، مئی، نئی، کسی مصدر کے درمیان میں جب نون کا حرف دوبار ساتھ ساتھ آئے گا دوبار لکھا جائے گا جیسے سنا بنا تھا لیکن غیر مصدر میں تشدید کا استعمال ہوگا۔ جیسے لگا، دھکا، خربوزہ میں، لکھی جائے گی لیکن تربوز میں نہیں تربوزہ غلط ہے۔ زردہ پیٹھے چاولوں کی ایک ڈش ہے جبکہ زردا کا مطلب ہے تباہ۔ یہ فرق ملحوظ رکھنا چاہئے۔

ذی قعد اور ذی الحجہ کو بعض ذوالقعدہ اور ذوالحجہ بھی لکھتے ہیں جو عربی لحاظ سے تو درست ہے مگر اردو کے لحاظ سے مناسب نہیں۔ ضیاء، ثناء، شعراء وغیرہ عربی میں تو ہمزہ کے ساتھ ہیں جیسے ضیاء، شعراء، ثناء لیکن اردو میں یہ مفرد صورت میں بغیر ہمزہ کے آئیں گے لیکن مرکب صورتوں میں ہمزہ آئے گا۔ جیسے ضیاء الاسلام، ثناء اللہ، شعراء کرام، علاء الدین، مؤنث، مؤخر، مؤثر، اسرائیل، آئینہ اور مؤدب کے درمیان عربی کی طرح ہمزہ لکھا جائے گا

شادی



گاؤں کے لوگ پرانی باتیں زیادہ دیر تک یاد نہیں رکھتے
لیکن مقصود کی شادی کو وہ کبھی نہ بھول پائیں گے۔

ہم اے آرزوی

اس بات کے گواہ ہیں کہ میں نے کبھی بھی کسی شادی کو
ماہوں نہ کیا نہ کسی سے سخت لہجے میں بات کی بلکہ ہر ایک کو
خوش اسلوبی سے جواب دیا۔ میں کوئی پیشہ ور عامل نہیں
ہوں بلکہ ایک دنیا دار عام گنہگار بندہ ہوں لیکن جو مجھے عطا
ہوا تھا وہ خلق خدا کی بھلائی کے لئے پھیلا دیا ہے کہ لوگوں
کی دعائیں مل جائیں اور یہی میرا معاوضہ ہے اور ان
دعاؤں میں ماہنامہ ”حکایت“ کی انتظامیہ کا بھی حصہ
ہے۔ ان کا لڑ کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آج
کل بچوں اور خالص کر بچیوں کے والدین ان کے رشتوں
کے لئے بے حد پریشان ہیں۔ ایسے والدین ایک ہفتے
تک نماز عشاء کے بعد سورۃ کوثر 11 بار پڑھیں اور اول و
آخر 7 بار درود ابراہیمی پڑھیں اور پھر اللہ تعالیٰ کے حضور
دعا مانگیں تو رشتوں کے حصول میں آسانی ہو جائے
گی۔ کاروبار میں ترقی کے لئے چلتے پھرتے ”یا معنی“ کا
زیادہ سے زیادہ ورد کریں اور چنی پریشانیوں اور برسوں

ماہنامہ ”حکایت“ میں میری متعدد تحریریں
چھپ چکی ہیں لیکن میں نے چونکہ اپنی کسی
بھی تحریر کے ساتھ کبھی اپنا موبائل نمبر نہیں دیا تھا اس لئے
مجھے کبھی اندازہ نہیں ہوا تھا کہ ماہنامہ ”حکایت“ کتنا
مقبول عام میگزین ہے۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ تو مجھے
تب ہوا جب ماہنامہ ”حکایت“ میں میری تحریر ”روحانی
علاج“ شائع ہوئی جس میں میں نے دغیفے کے حصول
کے لئے اپنا موبائل نمبر دیا تھا اور ماہنامہ ”حکایت“ کے
سینکڑوں قارئین نے کا لڑ کر کے یہ دغیفہ حاصل کیا جس
کی بدولت کئی لوگوں کی مشکلات اور پریشانیوں کا خاتمہ
ہوا اور یہی میرا مقصد تھا۔ اگرچہ ان کا لڑ کی وجہ سے
میرے معمولات زندگی بھی متاثر ہوئے یعنی کبھی اس
وقت کال آ جاتی جب میں ناشتہ کر رہا ہوتا، کبھی روڈ پر سفر
کے دوران کال آ جاتی، کبھی آفس میں کام کے دوران
کال آ جاتی، کبھی رات کو سوتے وقت کوئی اٹھا دیتا لیکن قارئین

”اور تمہاری شادی ہوئی ہے“
 ”نہیں اماں جی ابھی تو نہیں ہوئی“
 ”اور متکلفی وغیرہ؟“ اماں نے پوچھا۔
 ”جی وہ بھی نہیں۔“
 ”اچھا ٹھیک ہے۔“ اماں جانے کیا سوچ کر خاموش ہو گئی۔

”کیا بات ہے اماں جی آپ چپ ہو گئیں؟“
 اماں اس بات کو سن کر اچانک ہوش میں آ گئیں اور بولی۔ ”نہیں بیٹا میں ویسے ہی خاموش ہوئی تھی۔ باتیں کرتے کرتے تھک گئی ہوں تم بھی سوچو گے کہ اماں کیا میرے پیچھے ہی بڑبڑاتی ہے۔“ مقصود کے دل میں ایک لمحے کے لئے یہ بات آئی مگر اماں کو کہہ دوں کہ میری متکلفی ہو چکی ہے لیکن پھر اس نے سوچا کیا فرق پڑے گا اگر میں نے نہ بتایا تو۔ یہ سوچ کر وہ خاموش ہو گیا۔

بس جب راولپنڈی پہنچی تو مغرب کی اذانیں ہو چکی تھیں اور مقصود کو اماں نے بتایا کہ میں نے تو پشاور جانا ہے۔

”تو کوئی بات نہیں میں آپ کو پشاور کی بس میں بٹھا دیتا ہوں اماں جان۔“ مقصود نے مسعدا تمندی سے کہا۔ ”تو اماں نے کہا کہ تم میرے ساتھ آ جاؤ اور رات میرے پاس ٹھہر کر صبح واپس آ جانا۔“

”نہیں اماں جی میں ایسے نہیں جاسکتا۔“
 ”بیٹے میں اکیلی ذات ہوں اگر تم وقت پر پہنچا دیتے تو میں دن کو آرام سے نکل جاتی اب لیٹ ہو گئی بس تو جب میں پشاور پہنچوں گی تو بہت لیٹ ہو جاؤں گی۔“
 ”اماں جی، میں نے بس واپس فیصل آباد لے کر جانا ہے۔“

”تو صبح ہی جانا ہے ناں!“ اماں نے کہا۔ دوسرے ڈرائیور بھی اکٹھے ہو کر یہ باتیں سن رہے تھے اور پھر سب نے مقصود کو کہا کہ آپ اماں کو پشاور لے جائیں تمہاری

پرانے رکے ہوئے کاموں اور ہر قسم کی مشکلات کے خاتمے کے لئے حسینا اللہ و نعم الوکیل کا زیادہ سے زیادہ ورد کریں تو اللہ کی ذات آسانیاں پیدا کر دے گی۔ روحانی علاج میں کچھ قارئین نے قدرے حیرت کا اظہار کیا کہ ایسے بھی ہوتا ہے لیکن میری آج کی تحریر سے میرے بہن بھائی مزید حیران ہوں گے کہ رشتے ایسے بھی ملے ہوتے ہیں۔ دراصل ہر چیز کا ایک وقت ہوتا ہے اور فیصلے ہمیشہ اوپر سے ہوتے ہیں کہ جوڑے آسانوں پر بنتے ہیں اور ہم نہیں جانتے کہ ہمارے حق میں کب اور کیا فیصلہ ہوگا اس لئے پریشان رہتے ہیں لیکن میں کہتا ہوں کہ جب آپ کو کچھ سمجھ نہ آئے تو آپ فیصلہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں دے دیں تو وہ خود بخود آپ کے لئے بہتر فیصلہ کر دے گا۔ اس تمہید کے بعد آئیں میں آپکو اصل کہانی کی طرف لے آؤں جو آپ کو سنانا مقصود ہے۔

مقصود ایک بس ڈرائیور تھا اور فیصل آباد سے راولپنڈی تک کوہستان کی بس چلاتا تھا۔ وہ ضلع فیصل آباد کے ایک گاؤں کا رہائشی تھا اور اس کی اپنے ہی گاؤں میں اپنی حالہ زاد کے ساتھ متکلفی ہو چکی تھی۔ وہ بہت خوبصورت نوجوان نہ تھا بلکہ بڑی بڑی مونچھوں والا سانولے رنگ کا ایک نوجوان تھا۔ اس کی تعلیم واجبی سی تھی لیکن اس کا اخلاق بہت اچھا تھا۔ اسے ملازمت کا چوتھا سال تھا کہ ایک روز ایک پٹھان بڑھیا اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اس نے بھی پنڈی جانا تھا۔ بڑھیا نے لباس اور قیمتی شال سے ایک امیر خاندان سے مل کر رخصتی معلوم ہوتی تھی۔ وہ پرچی لکھی بھی تھی اور صاف اردو بول سکتی تھی۔ دوران سفر وہ مقصود سے باتیں کرتی رہی، کبھی موسم کی، کبھی سیاست کی اور پھر اچانک بولی ”بیٹے تم کہاں کے رہنے والے ہو؟“

”اماں جی، میں ضلع فیصل آباد کا رہنے والا ہوں۔“

”نہیں بیٹے یہ تمہیں رکھنا ہوگا۔“ یہ کہہ کر اماں چلی گئی۔ مقصود اس صورت حال میں یکدم گھر گیا تھا اور اسے سمجھ نہ آ رہی ہے تھا کہ وہ کیا کرے۔ مقصود ساری رات سوچوں کے تصور میں ڈوبتا بھرتا رہا اور پھر صبح ہو گئی تو اماں نے آکر چکا ”بیٹے ہاتھ منہ دھو لو ناشتہ تیار ہے۔“ مقصود نے ناشتہ کیا اور پھر اجازت لے کر وہاں سے نکل آیا۔ اس نے گھر آکر یہ سب کچھ بتایا تو سب گھروالے اس کے پیچھے پڑ گئے۔ ”یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔“ اس کے باپ نے طوفان اٹھا دیا۔ ”لیکن ابا جان وہ اگلے اتوار کو آئے گی یہاں گھر۔“

”آئے دوا ہے، میں دیکھ لوں گا اسے۔“
”اس طرح بھی ذمہ داری رشتے ہوتے ہیں بھلا۔“
اس کی ماں نے کہا۔ ”یہ رشتہ کرنے سے میرا بہن سے رشتہ ٹوٹ جائے گا اگر ہم نے ایسے کیا تو نہیں میں یہ نہیں کر سکتی اور نہ یہ ہوگا۔“ اس نے کہا تو سب نے اس فیصلے کو تسلیم کر لیا۔ اور پھر سب نے فیصلہ کیا کہ اماں جب آئے گی تو اسے یہ بتا کر کہ اس کی منگنی اس کی خال زاد کے ساتھ طے ہو چکی ہے اسے انکار کر دیں گے۔

ابن اتوار کو حسب پروگرام ان کے گھر پہنچ گئی۔ گھر والوں نے اماں کی مہمان نوازی تو کی مگر اس کو منگنی کا بتا کر رشتہ لینے سے انکار کر دیا۔ ”مگر میں تو اس کو زبان دے چکی ہوں۔“ ہاں ٹھیک ہے بہن! اس کے ابا نے کہا ”لیکن ہمارے ساتھ تو آپ کی زبان نہیں ہوئی ناں۔“
”ایک ہی بات ہے اور اس کے باوجود میں ناں نہیں کر سکتی۔“

”تم اس کی بیٹی سے شادی کرنے کو تیار ہو مقصود۔“
اس کے ابا نے پوچھا۔
”نہیں ابا جان!“ اس نے فوراً انکار کر دیا۔

”ابا کے سامنے تو بھی اپنی زبان سے پھر گیا ہے اب تو میں تجھے زندہ نہ چھوڑوں گی۔“ یہ کہہ کر اس نے

بس کوئی دوسرا ذریعہ لے جائے گا اور مقصود کو چار دنا چار اماں کے ساتھ پشاور جانا پڑ گیا۔

پشاور بس سٹاپ سے اماں نے ایک ٹیکسی کروائی اور اس نے اماں کی عالی شان رہائش گاہ پر پہنچا دیا۔ مقصود تو یہ ٹھاٹھ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اماں کی دو ہی بیٹیاں تھیں جو کہ انتہائی خوبصورت اور پڑھی لکھی تھیں انھوں نے مقصود کو سلام کیا اور پھر اس کے لئے شاندار رسم کا کھانا لگا دیا۔ اس کھانے کو دیکھ کر مقصود کو لگا جیسے وہ کسی فائنڈسٹار ہوٹل میں کھانا کھانے آیا ہے۔ اماں نے مقصود کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا اور پھر باتوں کے دوران اماں نے بتایا کہ اس کا شوہر فوت ہو چکا ہے بیٹا کوئی ہے نہیں اور وہ اپنی دونوں بیٹیوں کے ساتھ اس عالی شان گھٹی میں رہتی ہے۔ اماں نے بتایا کہ ان چچیوں کی شادی کے سلسلے میں بہت پریشان تھی تم مجھے بہت اچھے لگے ہو اور میں نے فیصلہ کیا ہے اپنے دل میں کہ میں بڑی بیٹی کا رشتہ تمہیں دے دوں۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے اماں جی، میں گھر والوں سے مشورہ کئے بغیر اتنا بڑا فیصلہ کیسے کر سکتا ہوں۔“

”بیٹے میں تمہاری کوئی بات نہیں سنوں گی اپنے گھر والوں کو منانا تمہارا کام ہے۔ میں اگلے اتوار کو تمہارے گھر آکر بات کروں گی اور وہیں شادی کے دن طے کر لیں گے۔“ یہ کہہ کر اماں اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی سانسے کمرے میں تمہارا بستر لگا دیا ہے تم آرام کرو اور صبح ناشتہ کر کے واپس چلے جانا اور یہ واپسی کا کرایہ رکھ لو میری طرف سے تم نے یہاں آنے میں میری خاطر تکلیف اٹھائی ہے۔ یہ کہہ کر اس نے 500 کے نوٹ میز پر رکھ دیے (اس زمانے میں یہ رقم پانچ ہزار روپے کے برابر تھی جاتی تھی)

”ٹھیک ہے اماں جان! لیکن میں یہ کرایہ نہیں لوں گا۔“ اس نے کہا۔

”تم مجھے لے کر چلو اس کے دفتر میں میں ان سے بات کرتی ہوں“۔ پھر مقصود اماں کو ایکسین کے آفس لے گیا اماں نے اس سے مقصود کے گھر بجلی لگوانے کی بات کی تو ایکسین نے کہا کہ اماں جی بات یہ ہے کہ پوری گلی کے لوگوں کی درخواستیں تو آتی ہیں لیکن ہمارے پاس فنڈ نہیں کیونکہ وہاں ایک نئے ٹرانسفارمر کی ضرورت ہے۔

”لیکن اس کا کوئی نہ کوئی حل تو ہوگا ناں آپ کے پاس؟“ اماں نے کہا۔

”ہاں اماں جی، حل تو ہر ایک مسئلے کا ہوتا ہے۔“

ایکسین نے کہا۔

”وہ کیا ہے؟“

”وہ یہ ہے کہ جن لوگوں کی درخواستیں ہیں وہ مل کر ٹرانسفارمر لگوانے کا خرچہ برداشت کر لیں تو محکمہ بجلی لگا دے گا۔“

”اور کتنا خرچہ ہے ٹرانسفارمر لگوانے کا؟“ اماں نے تو پوچھا تو ایکسین نے اماں کو کل خرچہ بتا دیا۔

”اور آپ کتنے لیس کے پیسے؟“

”میں نے کیا لیتا ہے؟“ ایکسین شرمندہ سا ہو گیا۔

اماں جنتے ہوئے بولیں بنے، میں سب سمجھتی ہوں آپ اپنا خرچہ ہی لے لیں مجھ سے مگر ایک ہفتے کے اندر اندر ان کے گھر میں بجلی لگنا ہے۔“

”ٹھیک ہے اماں جی، آپ فیس پہلے بینک میں جمع تو کرائیں اور پھر میرے پاس آئیں۔“

”وہ تو صبح جمع ہو جائے گی لیکن اپنی فیس تو آپ خود ہی وصول کر لیں۔“ اماں نے یہ کہہ کر دو ہزار روپے کے نوٹ اس کے فیل پر رکھ دیے اور اجازت لے کر واپس آئی۔ رات اماں مقصود کے گھر رہی اور صبح مقصود کے ساتھ بینک گئی۔ وہاں اس نے اپنا بینک اکاؤنٹ کھلوایا اور کئی ہزار روپے اپنے اکاؤنٹ میں جمع کروا دیے۔ فیبر

جانے کہاں سے خیر نکال لیا۔ یہ سب دیکھ کر مقصود تو گھر سے بھاگ گیا اور اس کے ابا چند معززین اور نمبردار کو بلا لائے اور ان کے سامنے سارا مسئلہ رکھ دیا۔ نمبردار نے بھی اماں کو سمجھایا لیکن اماں کا سب باتیں سن کر ایک ہی جواب تھا کہ وہ انکار کرنے کو اپنی توہین سمجھتی ہے اور اس صورت میں مقصود کو ہرگز زندہ نہ چھوڑے گی۔ اس پر نمبردار نے اس رشتے پر ہاں کر دی جس پر سب گھروالے خاموش ہو گئے۔ ”تو پھر آپ لوگ شادی کی تیاری کریں۔“

”لیکن اتنی جلدی ہم یہ شادی نہیں کر سکتے۔“

”وہ کیوں؟“ اماں نے کہا۔

”کیونکہ ہمارا آدھا مکان کچا ہے پہلے ہم گھر بنائیں گے پھر شادی کریں گے۔“

”تو بنوائیں گھر۔“

”لیکن ابھی پیسے نہیں ہیں ہمارے پاس گھر بنانے کے لئے۔“

”کتنا خرچہ ہوتا ہے بھائی صاحب!“

مقصود کے ابا نے کچھ حساب کتاب لگایا اور پھر بتایا کہ تقریباً ساٹھ ہزار خرچہ ہوگا۔

”ٹھیک ہے“ کہتے ہوئے اماں نے اپنی ایک جمیلی کھولی اور اس میں سے آدھ سارے نوٹ نکالے اور پھر 70 ہزار روپے گن کر مقصود کے ابا کے حوالے کر دیے۔ ”آپ لوگ کل سے یہ مکان بنانا شروع کر دو۔“ مقصود کے ابا نے یہ پیسے لینے سے انکار کر دیا لیکن اماں کے اصرار اور معززین کے کہنے پر یہ پیسے دکھائے۔

”اور اپنے گھر میں بجلی بھی لگواؤ شادی کرنے سے پہلے۔“

”اماں جی! اس گھر میں فوری طور پر بجلی نہیں لگ سکتی کیونکہ درخواستیں تو پہلے ہی دی ہوئی ہیں لیکن واپڈا والے کہتے ہیں کہ ابھی فنڈ نہیں ہیں ہمارے پاس۔“

آگیا۔ برات کی بس تیار کھڑی تھی لیکن گھر والوں کے سوا اتنی دور جانے کو کوئی بھی تیار نہ تھا۔ پھر گاؤں کی مسجد سے اعلان کیا گیا کہ براتی اگر نہ گئے تو پورے گاؤں کی بے عزتی ہوگی اس پر کچھ لوگوں کو حوصلہ ہوا اور وہ جانے کو تیار ہو گئے۔ اور یوں بس پشاور روانہ ہو گئی۔ جہاں برات کا شاندار استقبال کیا گیا۔ کھانے کو اتنا وافر اور ڈشز اتنی زیادہ تھیں کہ کھانے والوں کو سمجھ نہ آتی تھی کہ ہم کیا کھا رہے ہیں اور کیا چھوڑیں۔ برات کو رات پشاور میں ہی رکھا گیا اور واپسی سے پہلے صبح ہر براتی کو ایک عدد سوٹ اور ایک سو روپیہ نقد دیا گیا جس پر سب لوگ حیران اور خوش تھے۔ جمہیر کا سلطان علیحدہ ٹرک میں رکھوا دیا گیا تھا۔ ہر براتی مقصود کی قسمت پر رشک کر رہا تھا۔

پھلوں کے ایک باغ کے علاوہ اماں کی دو آرا مشینیں بھی تھیں جن کی آمدن وہ ہر ماہ اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرتی تھی اور نمبر اماں کا ہمیشہ کھڑے ہو کر استقبال کرتا اور اسے چائے کے بغیر واپس آنے نہ دیتا تھا کہ اماں کے اکاؤنٹ کی وجہ سے اس کی تنخواہ میں ترقی ہو گئی تھی۔

مقصود جو ایک بس ڈرائیور تھا وہ اب کئی گاڑیوں کا مالک بن چکا تھا۔ اس کی بیوی ایف اے پاس تھی اور بلا کی خوبصورت تھی۔ برسوں پہلے جب مجھے یہ کہانی ملی تو اس وقت اس کے گھر اللہ تعالیٰ نے دو بیٹے عطاء کئے تھے جن کا رنگ قدھاری اناروں کی طرح سرخ تھا۔ آج وہ بیٹے بڑے ہو کر خود صاحب اولاد ہوں گے۔ مقصود کی معیتر کی شادی حسب وعدہ نمبر دار نے ایک مناسب جگہ پر بڑی دھوم دھام سے کردوائی گاؤں کے لوگ پرانی باتیں زیادہ دیر تک یاد نہیں رکھتے لیکن مقصود کی شادی کو وہ کبھی نہ بھول پائیں گے۔



بہت خوش ہوا اس نے اماں کو چائے پلائی اور ٹرانسفارمر کے لئے اس کی فیس بھی اماں کے وہیں بیٹھے بیٹھے جمع کرادی اور اماں گھر میں سب کو مل کر اسی روز پشاور روانہ ہو گئی۔

اماں کی وجہ سے مقصود کا مکان بھی پختہ ہو گیا اور اس کے گھر کچلی بھی لگ گئی اور شادی کی تیاریاں بھی ہونے لگیں کیونکہ اماں نے جانے سے پہلے ایک ماہ بعد کی تاریخ طے کر دی تھی لیکن ایک بات خلاف معمول ہو گئی کہ مقصود کی معیتر جو کہ سات بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی انھوں نے مقصود کا شادی سے انکار اور پشاور میں شادی کا سن کر اپنی بے عزتی تصور کی اور مقصود کو قتل کرنے کے درے ہو گئے اور اس کے رستے میں گھات لگا کر بیٹھ گئے۔ کسی نے انہیں اس طرح بیٹھے دیکھا تو مقصود کے گھر آکر بتایا جس پر مقصود کے ابا پھر گاؤں کے نمبر دار کے پاس گئے اور اس کو سارا ماجرا سنایا جس پر نمبر دار نے ان لوگوں کو باپ بیٹوں سمیت اپنے ڈیرے پر بلوایا اور انہیں بتایا کہ میں اس بات کا گواہ ہوں کہ مقصود اور اس کے گھر والوں نے شادی سے انکار کیا تھا لیکن وہ بڑھاپا مقصود کو قتل کرنے پر آمادہ ہو گئی تھی جس پر میں نے اماں کو سمجھانا چاہا لیکن وہ اس کو کسی صورت زندہ چھوڑنے پر آمادہ نہ تھی جس پر میں نے مقصود کی زندگی کو خطرے میں دیکھ کر اس شادی پر آمادگی کا اظہار کر دیا تھا اور اس کے گھر والوں کو سمجھا بھجا کر آمادہ کیا تھا کہ وہ اماں کی بات مان لیں۔ تم لوگ اس بات کو اپنی بے عزتی تصور نہ کرو کہ مقصود اگر ماں کے ہاتھوں مارا جاتا ہے تو تمہیں ہی دکھ ہوگا کہ وہ تمہارا جوان ہے اور تمہاری بیٹی کا مستقبل بھی اندھیر ہو جائے گا۔ اس کی معیتر تمہاری بیٹی نہیں بلکہ میری بیٹی ہے اور میں اس کی شادی خود دیکھ بھال کر کروں گا کہ وہ میرے گاؤں کی عزت ہے۔ اس پر مقصود کے بھائی ٹھنڈے ہو گئے۔

مقصود کی شادی کا گاؤں میں چرچا تھا شادی کا دن

یہ عزت کی خواہش نفس والوں کے لئے دو کوڑی کی ہوتی ہے بے دام،
بے مطلب تیسرے درجے کی Sale میں پڑی بے کار چیز جیسی۔



☆ ترجمہ شاہد

دار کو اور گہرا کرتا جاتا۔ سیکنڈ کی زندگی اس کی پیدائش سے
نی مشکل تھی۔ اس پر اس کے بہن بھائیوں کی بڑھتی تعداد
نے جیسے اس کی معصوم، لاپرواہی کو چپ کی کیل پہ ٹانگ
کر رکھ دیا۔

اس کی ماں کا ہر روز اس کے باپ کو ایک ہی طعنہ
ہوتا جسے وہ ہر روز مٹی مگر ہر روز وہ نیا ہی دکھ دیتا۔ ”تو نے
مجھے دیا ہی کیا ہے، سوائے ان نامرادوں کے۔“ اور وہ
نامرادوں کی طرح مراد والی، بننے کا خواب دیکھتے دیکھتے
سو جاتی۔

ایک دن کچھ نیا ہوا تھوڑا سا نیا جیسے کسی کو بہت سے
دیکھوں کے بعد ایک بڑا اور نیا دکھ ملے اور وہ اپنے پرانے
دیکھوں کو کچھ دیر کے لئے کونے میں رکھ کے بھول جائے۔

اس کی ماں زندگی کے دیئے ہوئے تحفوں کو زیادہ دیر سہ
نہیں سکی اور اس کی کمزوری نے موت کو اپنی طاقت جان
لیا۔

سرس کی بچپلی جانب ایک تظار کی صورت میں تھا
ہوئی جمو پڑیاں وہاں کے کینوں کی بے
ترتیب زندگی کی نمائندگی کر رہی تھیں۔ زندگی نے امیری
غریبی نہیں دیکھی ہوتی اس نے تو بس انسانوں کو گزارنا
ہوتا ہے پھر وہ جا ہے کسے بھی گزارے دکھ کے سا غریب
غرق کر دے یا سکھ کی لہر میں سمودے یہ تو اس پر منحصر
ہے۔ تنویر کی جمو پڑی میں حسب معمول وہی بحث جاری
تھی۔ زندگی کی الجھنوں نے لہجوں اور رشتوں میں
کڑواہٹ گھول دی تھی تنویر کی بیوی شریا زندگی کی عطا کی
ہوئی کڑواہٹ کو لفظوں کی گوار میں پرو دیتی تھی بس یہی تو
اس کے بس میں تھا۔ پھر اس پہ بچوں کی زنجیر نے جیسے
خوشیوں کی ہر راہ کو اس کے لئے بند کر دیا تھا۔

سیکنڈ کی زندگی کا آغاز اور انجام ایسا ہی تھا اس کی
ماں شریا کے لفظوں کی اپنی اس کے معصوم دل پر ہر روز، ہر
شام، ہر صبح وار کرتی اور اس کے باپ کا بے حس انداز اس

R.T.M 121987

MASTER

گاسٹر

موٹر سائیکل پیسی



مونوبلاک پیپ



کلائمیکس آباد

جی۔ ٹی روڈ گوجرانوالہ

055-3252468
055-3483695

سکینز گھر میں بڑی تھی تو منزلوں کی تکلیفیں اسی کو سنی تھیں ورنہ اس کے بہن بھائی راستے میں پڑے کسی پتھر کی ٹھوکروں پہ لکھے جاتے۔ اس کے چھ عدد بہن بھائی ان کا کھانا پینا، دیکھ بھال، اس کے اندر جیسے وقت سے پہلے ایک ماں نے جنم لے لیا۔ اس کا باپ تو صبح کا گیا رات کو لوٹا اور یہی اس کا احسان تھا کہ وہ ہے۔

عمر کے کچھ پن اور دکھوں کی دی ہوئی سمجھداری نے اسے وقت سے پہلے پکا بنا دیا۔ اس نے لوگوں کے گھروں کی گندگی اور جھوٹ کو اپنے گھر والوں کی بھوک کی آگ بجھانے کا ذریعہ لیا۔ اس نے زندگی کو اسی ڈھنگ میں گزارنا سیکھ لیا جیسے اس کے اس پاس بکھری زند گیوں نے سیکھ لیا تھا لیکن کچھ تو ایسا تھا جو اسے باقیوں سے ممتاز کرتا کچھ چھپا ہوا نہ دیکھنے والا احساس۔

خواہوں اور خواہشوں کی افزائش تلخیوں اور تلخوں کو پنپنے سے نہیں روک سکتی۔ وہ خواہوں کی عمر کے پہلے رستے پہ کھڑی تھی۔ خواہوں میں وہ اپنے آپ کو ایک آسودہ عاں عورت کے روپ میں دیکھتی جس میں وہ زندگی کو خود کش ادنیٰ نہ کرے زندگی اسے۔ جہاں آزادی، خوشی اور سکون کا رائج ہوتا اور اس کے ارد گرد رشتوں کی زنجیریں کسی کانٹے کی طرح نہ چبھتی۔ اس کے ان صحت مند خواہوں کی تعبیر ایک بڑا پونے والے ساز اور دھن پہ بکھر جاتی اور حقیقت کا بد صورت چہرہ اس کے سامنے پوری آن بان جیسے جلوہ گر رہتا۔ گھر میں موجود دیواریں اسے استہزائی نظروں سے گھورتیں اور بہن بھائیوں کی آنکھوں میں ضرورتوں کی طلب کے چراغ روشن ہوتے اور اس کے خواہوں کا حسن کہیں منہ چھپا کے رو دیتا۔

لیکن پھر ایسا ہوتا کہ اس کی عمر کے اس حسین دور میں لپٹے ہوئے خواب اس کا بڑی بے تاب سے انتظار کرتے اور رات ہوتے ہی اسے پکڑ کر اپنی دنیا میں لے

خود کو سنبھالے وہ چار دیواری سے باہر نکلی تو جیسے ارد گرد انسانوں کے جسموں پر گدھوں کے چہروں کا احتجاج اسے دہلا گیا۔ انسان کی ضرورت اس کے خوف اور احساس سے کتنی بڑی ہوتی ہے یہ اسے آج پتہ چلا۔ وہ بھی ایک کہانی بننے کے عمل میں تھی ایسی کہانی جس کا انجام اور وہ سب ہنسی خوشی رہنے لگے، کی بجائے اب کیا ہو گا؟ اور کیا کرنا ہے؟ جیسا لگنے لگا۔ خود کو اس نکلن زدہ معاشرہ میں ہمت سے اٹھانا اسے بہت دشوار لگا مگر اس کی یہ دشواری اس کے گمراہیوں کو ایسے ہی کسی موڑ سے بچانے کے لئے سرگرداں تھی۔ اس نے میڈم جن کے ہاں وہ کام کرتی تھی ان کی مدد اور تعاون اور اپنی ہمت اور جذبے سے آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا۔ آخر اسے کچھ تو فیصلہ کرنا ہی تھا ہمت سے ہار جانے کا یا ہار کو ہمت سے ہرانے کا لیکن وہ اس سفر میں بہتر فیصلہ کرنا چاہتی تھی۔ میڈم کے گھر کے ایک کونے میں ان کے بنائے ہوئے دستکاری سکول کو چلانے کا فیصلہ اس کی میڈم کا تو تھا ساتھ ہی قسمت کی مہربانی نے بالآخر ترس کھا کر اسے ایک روزن دکھلایا۔ اپنے رزق کے حلال ہونے کی سند آخر کار اس نے حاصل کر لی اسی محنت سے اس نے اپنی بہنوں کو زندگی کے قابل بنایا اور اپنے بھائیوں کو زندگی گزارنے کا سکھایا وہ جو اس کے ماحول اور تربیت نے اسے نہ سکھایا وہ اس کے اندر کی بغاوت نے اسے سکھایا۔ وہ بغاوت جو اسی دائروں کے سفر کے خلاف تھی۔ وہ بغاوت جو اس سماج میں رہنے والی لڑکی اور اس کو نہ ملنے والے کی عزت کے خلاف تھی۔ اسے اپنی اولاد کو اس تکلیف اور اذیت سے بھی بچانا تھا جیسا اس نے اپنے بہن بھائیوں کے لئے کیا۔ اس نے سرخرویت کی جگہ منزل پہ قدم رکھ دیا تھا۔



جاتے اور وہ دائروں میں مقید ہوتی چلی گئی حقیقت اور خواب۔ خواب اور حقیقت اس کے ارد گرد رقصاں رہتے۔ دائرے سفر کرتے اور وہ سفر کرتی۔ اس کی دو بہنیں اب جوانی کی دلہیز پہ آکھڑی ہوئی تھیں اور چاروں بھائی اپنی مردانگی کے زعم میں جتلا ہونے کو ہی تھے۔ خواب اور ضرورتوں کی کشمکش میں اسیر وہ اپنی جوانی کی چادر کو حقیقت کی کڑی سچائی میں لپیٹے پھرتی مگر گدھ کی نظریں اپنے مردار کو ڈھونڈ ہی لیتی ہیں اور جو قسمت کے بدل جانے کی خواہاں تھی اپنی عزت کی گچی ہوئی باقیات کے ساتھ اپنی چار دیواری میں آسکئی۔

کتنے ہی دن گزر چکے تھے۔ اس کی آنکھوں کا خالی پن اس کے خوابوں کو جلاتا اور اس کے اپنوں کو تجسس میں جتلا رکھتا لیکن آخر کب تک؟ اسے اپنی لاش کو اپنے کندھوں پہ اٹھا کے دفنا ہی پڑا تا کہ اس کے بھائی بہنوں کو زندگی ایسے نہ ڈرائے۔ اس کے آس پاس کی زندگیوں میں یہ کوئی انہودنا اور اچھوتا واقعہ نہ تھا جو کسی تڑپ اور شور کا باعث بنے۔ یہ تو بس ایک معمول تھا جسے گزری جاتا تھا۔ یا یہ تو اخبار میں لگی ہوئی چھوٹی سی خبر تھی جو کسی کے دھیان کی چٹری سے بس اڑی جایا کرتی ہے۔

اس کے خوابوں نے آنکھوں کی ویرانی سے تنگ آ کر اپنا راستہ بدل لیا تھا یوں جیسے کوئی ویران گھر، جہاں کوئی آباد نہ ہونا چاہتا ہو۔ یہ رستہ اب اس کی بہنوں کی آنکھوں میں جا رکھا وہ جو بمشکل اپنا سن دھا پنے اترن اور جموٹن کی توفیق میں خود کو گم کئے ہوئے تھیں۔

یہ جانے بغیر کہ ان کی بہن کو ان خوابوں کی بہت بھاری قیمت چکانی پڑی ہے۔ اتنی بھاری کہ اس کی روح اس کے جسم کی مقروض ہو گئی۔ یہ عزت کی خواہش نفس والوں کے لئے دو کوڑی کی ہوتی ہے بے دام، بے مطلب تیسرے درجے کی Sale میں پڑی بے کار چیز جیسی۔

اسرائیلی ٹھیکہ بھنسی سوداگر کی احمق روئی کہانی

افریقہ میں خونی کارروائیاں

میاں محمد ابراہیم طاہر

0300-4154083



قسط: 13



جہازوں میں، جہاں آدم خور شیر اور چیتے کھوتے رہتے ہیں اور وحشی قبائل سے اپنا بچاؤ کر سکیں۔

موساؤ نے افریقہ میں اپنی ہم جوتی کا آغاز، کیوبا میں فیڈل کاسٹرو کے 1959ء میں برسرِ اقتدار آنے کے فوراً بعد کر دیا تھا جبکہ کاسٹرو اپنا انقلاب ایکسپورٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کو افریقہ میں پہلی کامیابی اس وقت ملی جب اس کے ایک نمائندے نے جان اوکیلو (John Okello) کو، جو خود ساختہ فیلڈ مارشل بنا ہوا تھا۔ جنگل سے نکال کر ہوانا میں گوریلہ جنگ کی مختصر

تربیت دی اور اُسے کہا گیا کہ وہ واپس افریقہ جا کر مشرقی افریقہ کے ساحل کے قریب جزیرے زنجی ہار (Zanzibar) پر قبضہ کر لے۔ وہ بلند قامت بھاری بھر کم جسمانی ساخت کا مالک تھا۔ اُس نے غیر منظمی آرمی جمع کر کے جزیرے کی پولیس کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔ اس کی فوج نے اپنے وحشیانہ پن سے جزیرے کی مختصر سی آبادی کو خوفزدہ کر کے غلام بنا لیا کیونکہ ان میں مقابلے کی سکت ہی نہ تھی۔ ان کے پاس اپنے کھیتی باڑی اور کاشت کاری کے آلات کے علاوہ کوئی ہتھیار ہی نہ تھے۔ زنجی ہار اپنے مصالحہ جات کی پیداوار کے لئے پوری دنیا میں مشہور تھا۔ کاسٹرو نے زنجی ہار کو اپنا مرکز بنا کر مرکزی افریقہ میں مداخلت شروع کر دی۔ دارالسلام کے ساحل کے قریب ایک مختصر چینی اقلیت آباد تھی۔ انہوں نے چش آئندہ حالات چینی حکومت کو لکھ بھیجے۔

بیجنگ حکومت نے ابھرتے ہوئے انقلاب سے فائدہ اٹھا کر پورے افریقہ پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ لہذا حکومت چین نے سی ایس آئی ایس کو حکم دیا کہ وہ انقلابیوں کی ہر ممکن مدد کرے اور انقلابی آرمی میں اچھے اور صحت مند لوگوں کی بھرتی کے لئے رہنمائی کرے۔

ہزاروں تربیت یافتہ اور جدید ہتھیاروں سے مسلح انقلابیوں کی اسرائیل کی سرحدوں سے چند گھنٹے کی

کے مشہور ناروونرک ہوٹل سے چند بلاک نیروبی پرے ”اوس کلب“ واقع ہے جو کینیا کے بزنس مینوں کے لئے ہمیشہ ہی کشش کا باعث رہی ہے۔ وہاں وہ تمام رات باوہ نوشی کر سکتے تھے اور مزید عیاشی کے لئے بار میں کام کرنے والی لڑکیوں میں سے کسی ایک کو اس کا میڈیکل سرٹیفکیٹ دیکھ کر کہ وہ مہلک بیماریوں سے پاک صاف ہے، کلب کے کسی کمرے میں بھی لے جاسکتے تھے۔

1964ء سے کلب میں کچھ غیر ملکیوں نے بھی آنا شروع کر دیا تھا۔ ان میں سفاری سوٹ میں ملیوں چینی، لیبوترے چھوٹے والے روسی اور کئی ایسے لوگ جن کی قومیت بھراکال کے کسی بھی ملک کی ہو سکتی تھی۔ وہ وہاں گرم گرم بیئر پینے یا جیسا کہ کلب کے اشتہارات میں لکھا ہوتا ”افریقہ کی گرم ترین لڑکیاں“ سے لطف اندوز ہونے نہیں آتے تھے۔ یہ لوگ مختلف اٹلی جیسے ایجنسیوں کے لئے کام کرتے تھے جو مرکزی افریقہ میں چڑ جانے کے لئے برسرِ پیکار تھے، جہاں کہ پہلے صرف برطانوی خفیہ ایجنسی M16 ہی آپریشن کیا کرتی تھی، ان نئے آنے والوں میں ”چائینز سیکرٹ اٹلی جنس سرورس“ (CSIS)، روسی کے لی بی (KBG) اور اسرائیل موساد شامل تھیں۔ ہر ایجنسی کا اپنا ایجنڈا اور پروگرام تھا اور وہ خفیہ طور پر ایک دوسرے کی جڑیں کاٹنے کے لئے کام کر رہی تھیں۔ ان میں موساد سب سے زیادہ مؤثر اور طاقتور تھی۔

کہا جاتا تھا کہ موساد ایک درجن سے زیادہ ایجنٹ خط استوا کے ساتھ پھیلے ہوئے تھے جو بحر ہند میں دارالسلام سے فری ٹاؤن، بحر اوقیانوس کے کنارے تک کارروائیاں کر رہے تھے۔ ان سب کے پاس جعلی پاسپورٹ تھے، نوجوان اور انتہائی مستعد، اپنے کام کے ماہر جنہوں نے دوائیوں کے استعمال اور معمولی قسم کی مرہم پٹی کی بھی تربیت لے رکھی تھی۔ تاکہ جنگل اور

جب وقت گزر جائے تو ماضی کے واقعات کا پوسٹ مارٹم فائدہ کی بجائے نقصان دیتا ہے۔

درمیان فلفلیہاں اور بدگمانیاں پیدا کی جائیں اور کے بی جی کے تربیت یافتہ عرب دہشت گردوں کو قتل کیا جائے۔ سیاہ فام افریقن انقلابیوں سے تعلقات بہتر بنائے جائیں اور انہیں یقین دلایا جائے کہ اسرائیل ان کی تحریک کی نہ صرف گور ہلا جنگ میں مدد کرے گا بلکہ سیاسی میدان میں ان کے منتخب ہونے میں مدد و معاون ثابت ہوگا۔ بد کے میں اسرائیل کی صرف یہ خواہش تھی کہ یہ تحریکیں اسرائیل پر حملہ آور نہ ہوں۔

اوس کلب اس جنگ کا حصہ بن چکی تھی جو افریقن انقلابیوں کے دلوں اور دماغوں میں لڑی جا رہی تھی۔ راتوں کو لمبے چوڑے بحث مباحثے ہوتے تھے کہ کس طرح بغیر کسی تشہیر کے، دہشت گردی ایک ایسا ہتھیار تھا جو اندھیرے میں وار کرتا تھا اور اپنے بنیادی ہدف کو قطعاً نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتا تھا۔ آزادی اور خود مختار کلب کے مضمّن زدہ ماحول میں منصوبے بنائے جاتے تھے۔ معاہدے طے ہوتے تھے، اہداف کی نشاندہی کی جاتی تھی تاکہ انہیں ختم یا تباہ کیا جاسکے۔ کچھ لوگوں کو کچے راستے پر جاتے ہوئے چلتی گاڑی سے کچل کر ہلاک کر دیا جاتا تھا۔ کچھ مخالفین اپنے بستروں میں مردہ پائے جاتے تھے۔ ایک دن اگر کے بی جی کا ایجنٹ شکار ہوتا تھا تو اگلے روز چینی سی ایس آئی ایس کا جاسوس مارا جاتا تھا۔ دونوں خفیہ ایجنسیاں ایک دوسرے پر شک کرتی تھیں حالانکہ کل و غارت گری کا یہ کارنامہ موساد انجام دیتی تھی۔

موساد کے سربراہ میٹر امیت نے اپنے ایجنٹوں اور جاسوسوں کو ان معلومات سے آگاہ کیا جو اُسے چینی اٹلی جنس ایجنسی سی ایس آئی ایس کے بارے میں

مسافت پر موجودگی نے اسرائیل میں خطرے کی گھنٹیاں بجا دیں اور اس کے سیاسی رہنماؤں کو خوفزدہ کر دیا۔ یہ اسرائیلی حکومت اور اٹلی جنس ایجنسیوں کے لئے بہت بڑا چیلنج تھا لیکن اس گور ہلا آرمی کو اشتعال دلانا، جب کہ اس نے اسرائیل کو کوئی نہ دی تھی، تصادم کا باعث بن سکتا تھا، جو اسرائیل کے مفاد میں نہ تھا کیونکہ پہلے ہی عرب دہشت گردوں سے لڑائی میں مصروف تھا۔ لہذا موساد کے سربراہ میٹر امیت نے اپنے افریقن ایجنٹوں اور جاسوسوں کو ہدایت کی کہ وہ انقلابیوں کی سرگرمیوں پر گہری نظر رکھیں لیکن ان کے کام میں کسی قسم کی مداخلت نہ کریں۔

جب روسی خفیہ اٹلی جنس ایجنسی کے بی جی بھی وہاں آگئی تو صورت حال ایک دم تبدیل ہو گئی۔ روس نے مستقبل کے دہشت گردوں کو دعوت دی کہ ان کی تعلیم و تربیت ماسکو کی پٹر انس لومبا یونیورسٹی میں کی جائے گی۔ انہیں وہاں کے بی جی کے بہترین افسر گور ہلا جنگ کے حربے، غریب و بے یار و مددگار لوگوں کو استعمال کرنے کے لئے طریقے اور جمہوری ریاستوں میں منتخب نہ ہو سکے والوں کو اپنے مفاد و مقاصد کے لئے متحرک کرنے کے حربے سکھائے جائیں گے۔ یہ ایسی دعوت تھی جسے رو کرنے کے بارے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ کے بی جی اپنے ساتھ کچھ ایسے انتہائی کامیاب، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور پٹر انس لومبا یونیورسٹی کے گریجویٹس کو افریقہ لے کر آئی تھی جو دراصل عرب گوریلے تھے۔

موساد کے سربراہ میٹر امیت نے اپنے ایجنٹوں کی مدد کے لئے کچھ کیدون (Kidon) (قاتل گردہ کے ارکان) بھی افریقہ بھیج دیئے تھے۔ اس کا نیا حکم یہ تھا کہ کے بی جی اور اس کے سیاہ فام افریقن میزبانوں کے تعلقات ہر قیمت پر خراب کئے جائیں۔ اسی طرح کے بی جی اور چینی اٹلی جنس ایجنسی سی ایس آئی ایس کے

شاطر شخص جو ہمیشہ اپنے آپ کو حقیر ترین سطح پر رکھتا تھا۔
 سی ایس آئی ایس کی افریقہ میں سرگرمیوں اور
 کارروائیوں کا نگران کرنل کاؤلنگ تھا جو جاسوسی کی دنیا کا
 ایک بے مثال شخص تھا جس نے نیپال اور انڈیا میں اپنی
 تعیناتی کے دوران اپنے نت نئے حربوں اور ترکیبوں
 سے بے پناہ شہرت حاصل کی تھی اور جو اس وقت زنجی ہار
 میں مقیم تھا۔ وہ وہاں پُر آسائش زندگی گزارتا تھا اور
 نوجوان افریقین عورتوں کو بطور خادمائیں نوکر رکھتا تھا۔ وہ
 ایک ماہر شکاری کی طرح سینٹرل افریقہ میں گھومتا رہتا تھا
 اور ہفتوں غائب رہتا تھا۔ اُس کی نیردلی آمد پر اوس
 کلب میں ہر کلف دعوتیں معمول بن جاتی تھیں۔
 اگر قبیلوں کے بچے کی خوشبو سے کلب کی فضا مہک اٹھتی
 تھی۔ براہ راست چین سے در آمد شدہ لوازمات سے
 مہمانوں کی تواضع کی جاتی تھی۔ افریقین طوائفیں اپنے
 مختصر ترین لباس میں بن ٹخن کر شریک محفل ہوتی تھیں اور
 کھرے ڈانسر ہانگ کا ہنگ سے بذریعہ دھاتی جہاز بلوائی
 جاتی تھیں اور کلب کے اندر آتش بازی کا بے مثال
 مظاہرہ ہوتا تھا۔

کیوبا سے ٹریننگ لے کر واپس آنے والے
 افریقین گوریلوں کی، انہیں اپنی کارروائیوں کے لئے
 جنگلوں میں بھیجنے سے قبل، خوب خاطر تواضع کی جاتی
 تھی۔ ان گوریلوں میں ایک ایسا بھی تھا جس نے بھری
 محفل کے دوران انسانی خون کا گلاس پینے کا مظاہرہ کیا
 تھا جو اس نے اپنے شکار کو قتل کرنے سے قبل اُس کے جسم
 سے کشید کیا تھا۔

اس دوران کاؤلنگ (Kao Ling) نہ صرف
 اپنے آپریشن پورے افریقہ تک پھیلا رہا تھا بلکہ شمال کی
 طرف استعمویا جنوبی چین اور مصر تک توسیع دینے کی
 کوشش کر رہا تھا۔ اس نے اپنے دہشت گردوں کو
 اسرائیل پر حملوں کے لئے بھاری رقمیں بھی ادا کی تھیں۔

حاصل ہوئی تھیں۔ چینی ایجنسی کی جاسوسی کی تاریخ
 2500 سال پیچھے تک جاتی تھی۔ صدیوں سے چین کے
 حکمران اپنی رعایا کی جاسوسی کرتے چلے آتے تھے لیکن
 سب سے پہلے ماؤ کی آمد اور اس کے بعد ڈنگ زیاؤ ہنگ
 کے دور میں خفیہ اطلاعات اور انٹیلی جنس معلومات کے
 حصول میں کئی نئی جدتیں اور طور طریقے وضع کئے گئے۔
 سی ایس آئی ایس نے نہ صرف ملک کے اندر بلکہ سمندر
 پار، امریکہ، یورپ، انڈل ایسٹ اور آخر میں افریقہ تک
 اپنا جاسوسی کا دائرہ عمل بڑھا لیا۔

جاسوسی کا یہ نظام صرف خفیہ اطلاعات و معلومات
 کے حصول کے لئے ہی استعمال نہیں ہوتا تھا بلکہ خبیثات
 کی سنگت اور پیسے کی غیر قانونی منتقلی کے لئے بھی زیر
 عمل لایا جاتا تھا۔ دنیا کی تقریباً آدمی انیون، ری پبلک
 آف چائنا کے ارد گرد "سنہری ٹھکان" کے ممالک، تھائی
 لینڈ، لاؤس اور برما میں پیدا ہوتی تھی اور سی ایس آئی
 ایس تینوں ممالک کے خبیثات کے سنگتوں کے ساتھ مل
 کر کام کرتی تھی، جو مغربی ممالک کو خبیثات سنگت کرتے
 تھے۔ چونکہ ہانگ کا ہنگ غیر قانونی رقوم کی منتقلی کا سب
 سے بڑا مرکز تھا، اس لئے سی ایس آئی ایس آسانی سے
 ڈرگ کی آمدنی اور چین کے منافع کو خفیہ رکھنے میں
 کامیاب رہتی تھی۔ کچا پیسہ انہیں افریقہ میں اپنے
 آپریشن چلانے میں مددگار ثابت ہوتا تھا۔ یہ سب
 کچھ 1964ء سے سی ایس آئی ایس کے ڈائریکٹر جنرل
 قیادوشی کے زیر نگرانی ہو رہا تھا۔ یہ ایک لبا لیکن بچ آدمی
 تھا جو فریسی شراب اور کیوبا کے سگاروں کا رسیا تھا۔ وہ
 سینکڑوں جاسوسوں کا افسر اعلیٰ تھا اور رشوت اور ہیک
 میٹنگ کے لئے اس کا بجٹ کے بی جی کے برابر تھا۔
 مرکزی چین کے لیبر کمپ ایسے لوگوں سے بھرے ہوئے
 تھے جنہوں نے کبھی قیادوشی کی مخالفت کی جرأت کی تھی۔ اس
 کے بارے میں موساد کا نفسیاتی تجزیہ یہ تھا کہ ایک ایسا

حصہ آگ کے شعلوں کی نذر ہو گیا جہاں ان کا عملہ رہائش پذیر تھا۔ ایک علاقائی دورے کے دوران کاؤنگ بشکل جان بچا سکا کیونکہ اس نے اپنی چھٹی جس سے خطرہ بھانپ کر اچانک اپنی کار تبدیل کر لی تھی جو چند منٹ بعد ہی دھماکے سے پھٹ گئی جس میں ڈرائیور ہلاک ہو گیا تھا۔ یہ حادثہ کانگو (Congo) میں برازاویل کے مقام پر پیش آیا تھا۔

جب گھانا کا حکمران، ججو چین کا دوست تھا، کوامی نکروما (Kwame Nkrumah)، بینک کے سرکاری دورے پر تھا تو موساد نے اُس کا تحفہ اٹنے کی سازش تیار کی۔ اس کے نتیجے میں نہ صرف نکروما اقتدار سے محروم ہو گیا بلکہ ملک میں سی ایس آئی ایس کے نیٹ ورک کا بھی خاتمہ کر دیا گیا۔

موساد نے تین سال سے زائد عرصہ تک افریقہ بحر میں سی ایس آئی ایس کے خلاف اپنی انتہائی خونی اور وحشیانہ جنگ جاری رکھی۔ دونوں طرف سے دم کی کوئی انتہائش نہ تھی۔ جب ایک مرتبہ کانگو میں موساد کا ایک ایجنٹ سی ایس آئی ایس کے قابو چڑھ گیا تھا تو انہوں نے اسے زندہ کریموں کے آگے ڈال دیا تھا اور اس کی زندگی کے آخری لمحات کی فلم تیار کر کے موساد کے مقامی شیخ چیف کو بھجوائی تھی۔ شیخ چیف نے اس کا انتقام اس طرح لیا کہ اپنے ہاتھوں سے اس بلڈمیک پر راکٹ فائر کیا جہاں سے چینی جاسوس کارروائیاں کیا کرتے تھے۔ اس راکٹ حملے میں تین چینی مارے گئے۔

آخر میں ایک ثالث، زائرے (Zaire) کے صدر موبوٹو (Mobutu) کے ذریعے سی ایس آئی ایس نے موساد کو پیغام بھیجا کہ مزید لڑائی جاری رکھنا نہیں چاہیے۔ اس کی بجائے دونوں مل کر براعظم افریقہ پر روس کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کے آگے بند باندھنے کے لئے کام کریں گے۔ یہ لائحہ عمل تو عین

سی ایس آئی ایس اسرائیل کو دھتکتن کا بغل بچہ اور کٹہ پتلی سمجھتی تھی اور کاؤنگ کے الفاظ میں ”میرے مجاہدین آزادی کا بہترین نشانہ۔“

موساد کے سربراہ میز امیت نے فیصلہ کیا کہ سی ایس آئی ایس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جانا چاہئے۔ سب سے پہلے چینیوں کی طرف سے ملاوی میں ہسٹنگ باندہ (Hasting Banda) کی حکومت کا تحفہ اٹنے کی سازش کو ناکام بنایا۔ پھر موساد نے کینیا کی حکومت کو اس کے اندر موجود چینی جاسوسی کے نیٹ ورک کی نشاندہی کر دی۔ بعد ازاں نیروبی کی حکومت نے اس طرح اظہار تشکر کیا کہ اپنے ملک کی فضائی حدود اسرائیلی طیاروں کو انٹی بے آپریشن کے لئے استعمال کرنے کی اجازت دی۔ اوس کلب بند کر کے اس کے چینی سرپرستوں کو جہازوں میں بھر کر ملک سے باہر نکال دیا گیا۔ الا لکھ وہ چیتے چلاتے رہے کہ وہ صرف تاجر اور کاروباری لوگ تھے جو ملک چھوڑ گئے وہ خوش قسمت تھے۔ باقی جوسی ایس آئی ایس کے مستقل ایجنٹ پیچھے افریقہ میں رہ گئے تھے انہیں موساد کے ایجنٹوں نے قتل کر دیا یا صحرا میں بھٹکنے اور جنگلوں میں شیروں اور چیتوں کا شکار بننے کے لئے چھوڑ دیا۔

افریقہ کے دوسرے ملکوں میں چینیوں نے جس قدر موساد کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی اس نے اتنی ہی سنگدلی اور بے رحمی سے اپنی کارروائیاں جاری رکھیں۔ چینی ایجنٹ جہاں کہیں دکانداروں کے روپ میں کام شروع کرتے موساد کے قاتل وہیں انہیں ختم کر دیتے۔ گھانا میں سی ایس آئی ایس کے ایک ایجنٹ کو اس وقت گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا جب وہ ایک باج گھر سے اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ باہر نکل رہا تھا۔ مالی میں ایک چینی ایجنٹ کار بم دھماکے میں مارا گیا۔ زنجی بار میں جواب بھی سی ایس آئی ایس کی سرگرمیوں کا مرکز تھا، مکانوں کا

جنگجوؤں کی توجہ اسرائیل کی طرف مڑ جائے گی۔ سی ایس آئی ایس کی یہ پیشکش کہ اپنے مشترکہ دشمن کے بی جی اور اس کے دہشت گردوں کے ساتھ منظور کر لیا۔ چینیوں نے افریقہ کے اندر عربوں کی آمدورفت کی اطلاع موساد کو دینی شروع کر دی۔ کچھ کو کار بم دھماکوں اور ان کے ہوٹلوں کے کمروں کے اندر دھماکہ خیز مواد لگا کر ہلاک کر دیا گیا۔ ایک موقع پر موساد نے ایک کرائے کے فوجی کے ہائلٹ میں بم لگا دیا کیونکہ وہ کانگو سٹک یا بیج میں جھلا تھا۔ جب اس نے اپنے خرطوم (Khartoum) ہوٹل کے کمرے کے فرش کی زنجیر کھینچی تو اس کا پھلا دھڑچھڑاؤ میں بٹ گیا۔

موساد نے عہد کی پابندی کرتے ہوئے سی ایس آئی ایس کو آگاہ کیا کہ روس نے دنیا کے غریب ملک صومالیہ کو بھاری مالی امداد کا پیکیج پیش کیا ہے۔ چین نے فوراً صومالیہ کو روس سے دوگنی امداد کی پیشکش کر دی۔ اگلے مرحلے میں موساد نے چین کی سوڈان میں بھی امداد کی جہاں روس نے صدر نیمیری کے ذریعے فطری حکومت کو بہت زیادہ اثر و رسوخ حاصل کر لیا تھا لیکن ڈکنینر نیمیری نے روس کے اشاروں پر پناہ پنے اور اس کی کٹھ پتلی بننے سے انکار کر دیا تو کے بی جی نے اس کے خلاف بغاوت کرانے کی سکیم جاری کر لی۔ موساد نے سی ایس آئی ایس کو اطلاع کر دی جس نے صدر نیمیری کو آگاہ کر دیا۔ نیمیری نے تمام روسی سفارتکاروں کو ملک سے نکال باہر کیا اور روسی ہلاک کی تمام امداد معطل کر دی۔

چینی اور روسی براڈ کے کیونز کو آہٹس میں ٹکرا کر اور ایک دوسرے کا گلا کاٹنے پر مصروف کر کے، بقول میٹر امیت، موساد نے افریقہ میں اپنا اثر و رسوخ بڑھانا اور پیر جمانا شروع کر دیے۔ موساد نے افریقہ میں ایک خفیہ انٹیلی جنس ایجنسی کی دوستی کا ہاتھ بڑھانا شروع کر دیا جو موساد جتنی ہی خونخوار وحشی اور خوفناک تھی جس سے پورا

موساد کی خواہشات کے مطابق تھا کیونکہ سوپر پاورز کے بارے میں موساد کے سربراہ میٹر امیت نے جو پالیسی وضع کر رکھی تھی وہ تھی کہ سوپر پاورز کے درمیان اختلافات پیدا کرنا اسرائیل کی بہانہ کے لئے ضروری تھا۔

جس وقت سی ایس آئی ایس اور موساد آپس میں برسر پیکار تھے، کے بی جی نے کاسٹرو کی پالیسیوں کو آگے بڑھانے کے لئے کئی اقدامات کر لئے تھے۔ کے بی جی کے چیف اور پولٹ بیورو کے ارکان کریملن میں اکٹھے ہوئے تھے اور فیصلہ کیا تھا کہ روس، کیوبا کی تمام اقتصادی ضروریات پورا کرنے کا ضامن ہوگا۔ یہ اس بات کا کافی ثبوت تھا کہ 70 لاکھ آبادی کی قوم روس کا دم چھلا بن جائے گی۔ اس کے بدلے میں کاسٹرو نے روسی براڈ کا کیونز افریقہ میں لانے پر سادہ کیا تھا، بجائے چینی براڈ کے اس نے اس بات پر بھی رضامندی ظاہر کی تھی کہ روس کے پانچ ہزار ماہرین کیوبا کی سکینڈری روس کے بی جی آئی کو افریقہ میں آپریشن کرنے کی تربیت کرے۔

چنانچہ کے بی جی نے تمام سیاہ فام افریقہ میں کیونوں کے ساتھ مل کر کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ اگلے چھ ماہ کے دوران افریقہ میں دہشت گردی کے ہر واقعہ کے پیچھے روسیوں کا ہاتھ ہوتا تھا۔ ڈل ایسٹ کے کہپوں میں ٹریننگ کے بعد بہترین دہشت گردوں کو جنوبی افریقہ کی سفید فام نسل پرست حکومت کے خلاف لڑائی کے لئے روس انہیں افریقہ لاتا تھا۔ یورپ، لاطینی امریکہ اور ایشیا کے دہشت گرد بھی ساتھ افریقہ کے ہمسایہ ممالک انگولا، موزمبیق وغیرہ سے اس کے خلاف دہشت گردانہ کارروائیوں میں مدد کر رہے تھے۔

موساد کے سربراہ میٹر امیت کے مطابق خطہ استوا کے نیچے معاملات واقعی گرم ہو رہے تھے۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ کچھ ہی عرصے میں ان تجربہ کار کرائے کے

جب مشکلات اتنی بڑھ جائیں کہ ناقابلِ برداشت حد تک چلی جائیں تو سمجھ لینا کہ کامیابی قریب آ چکی ہے۔ (حضرت علیؓ)

سپلائی کیا اور جواب میں پریٹوریانے دیونامیں تیار کردہ پہلے اسرائیلی ایٹم بم کی بحر ہند کے جزیرے پر ٹیسٹ کی اجازت دے دی۔

اسی دوران موساد نے "ہاس" کے ساتھ اپنے رابطے بہت مضبوط کر لئے تھے اس وقت تک جب کہ بیورو کے ایجنٹ تفتیش کے لئے پرانے تشدد اور مار پیٹ پر مبنی حربے استعمال کرتے تھے، اسرائیلی ایجنٹوں نے انہیں نئے نئے طریقے سکھائے جو لبنان اور دوسری جگہوں میں بڑی کامیابی سے استعمال کئے گئے تھے۔ ان میں خفیہ سے محرومی، جگراتا، جس دم، کسی مشن کو دوبارہ کے ساتھ طویل عرصے تک کھڑا رکھنا، خفیہوں کو کھینچنا، مختلف قسم کا دماغی مارچہ جس میں دھمکیاں، گلا دہانا وغیرہ شامل تھا، موساد کے ایجنٹ ہاس کے پوتے کے ساتھ دوسرے افریقی ملکوں میں جاتے آتے رہتے اور خفیہی کارروائیاں کرتے تھے۔ موساد کے قاتل گروپ کے ارکان ہاس کے ایجنٹوں کو بے سکھاتے تھے کہ کوئی سراغ چھوڑے بغیر قتل کس طرح کیا جاتا تھا۔ جب موساد نے افریقن نیشنل کانگریس کے لیڈروں کا سراغ لگانے کی پیشکش کی جو جلاوطنی میں برطانیہ اور یورپ میں چھپے ہوئے تھے تاکہ انہیں ہلاک کیا جاسکے تو ہاس نے یہ پیشکش بخوشی قبول کر لی لیکن حکومت نے یہ پیشکش مسترد کر دی کیونکہ اسے یہ خوف محسوس ہوا کہ ان باغی لیڈروں کے قتل سے پریٹوریانے حکومت لندن کے بعض سیاستدانوں کی حمایت سے محروم ہو جائے گی۔

دونوں خفیہ ایجنسیوں، موساد اور ہاس نے سنجیدگی اور ایمانداری سے محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ افریقہ

سیاہ فام افریقہ خوفزدہ رہتا تھا کیونکہ جمل سازی، بلیک میلنگ، اغوا اور قیدیوں سے تفتیش کے ہتھکنڈوں میں اس کا موساد کے علاوہ کوئی مانی نہیں تھا۔ نفسیاتی جنگ اور قتل و غارت کے لئے پورے افریقہ میں جس کی شہرت تھی، یہ تھی "ہاس" (Boss) جنوبی افریقہ کی نسل پرست حکومت کی خفیہ ایجنسی۔ موساد کی طرح ہاس بھی مخالفین سے نینے میں آزاد و خود مختار تھی۔ دونوں ایجنسیاں جلد ہی یکجا ہو گئیں۔ دونوں ایک دوسرے کے تعاون سے پورے افریقہ میں سرگرم عمل ہو گئیں اور دونوں کو اسرائیلی وزیراعظم گولڈا میئر اور پریٹوریانے حکومت کی سرپرستی حاصل ہوئی۔

اس خفیہ تعاون کا پہلا نتیجہ جنوبی افریقہ (پریٹوریا) سے اسرائیلی ایٹمی پلانٹ دیونام کو پورٹیمیم کی ایک سپورٹ کی صورت میں نکلا۔ یہ ایٹمی مواد جو ہانسبرگ سے مل گیا اسرائیلی ایئر لائن ایل ال کی کمرشل پروازوں سے لے جایا جاتا تھا اور کاغذات میں زرعی مشینری ظاہر کیا جاتا تھا۔ جنوبی افریقہ کے سائنسدان جہازوں میں ساتھ جاتے تھے اور بیرون ملک کے یہی واحد لوگ تھے جنہیں معلوم تھا کہ دیونام پلانٹ کس مقصد کے لئے کام کر رہا تھا۔ جب جنوبی افریقہ نے اپنے مکمل ایٹم بم کا بحر ہند کے ایک بے آباد اور دور دراز جزیرے پر تجرباتی ٹیسٹ کیا تو اس موقع پر دھماکے کی قوت کو جانچنے کے لئے اسرائیلی سائنسدان بھی موجود تھے۔ 1972ء میں اسرائیلی وزارت دفاع کے ایک سینئر افسر ایڈورڈ وائزمن (Ezer Weizman) نے پریٹوریا میں وزیراعظم جنوبی افریقہ پی ڈبلیو بوتھا سے ملاقات کی اور باہمی دفاعی معاہدے کی ایک نئی دستاویز پر دستخط کئے۔ اگر معاہدے میں شامل کسی ایک ملک پر حملہ ہوگا اور اس کو مدد کی ضرورت ہوگی تو دوسرا اس کی مدد کو آئے گا۔ اسرائیل نے بھاری تعداد میں امریکن اسلحہ جنوبی افریقن آرمی کو

واشنگٹن میں وزارت خارجہ نے خفیہ طور پر انتہائی سنجیدگی سے کوشش کی تھی کہ افریقہ میں اسرائیلی اثر و رسوخ کو گھٹایا جائے۔ اس نے یہ خیر لیک کی اور اس کی تفصیلات ذرائع ابلاغ میں پھیلائیں کہ کس طرح سینکڑوں یہودیوں کو نہرو سیز کی جنگ کے دوران جنوبی افریقہ سے جہازوں میں بھر کر (جنگ میں مدد دینے کے لئے) شمال کی طرف لے جایا گیا۔ اس خبر کے افشاء کے نتیجے میں افریقہ کے میں ممالک نے یروشلم (اسرائیل) سے اپنے سفارتی تعلقات توڑ لئے۔ ان ممالک میں نانجیریا بھی شامل تھا۔ ان سفارتی تعلقات کے ٹوٹنے سے اسرائیل پر کاری ضرب لگتی تھی کیونکہ اسرائیل کی 60 فیصدی ایندھن کی ضروریات نانجیریا کے تیل سے پوری ہوتی تھیں۔ تیل کے بدلے میں اسرائیل، نانجیریا کو امریکہ میں بنا ہوا اسلحہ سپلائی کرتا تھا۔ سفارتی تعلقات ٹوٹنے کے باوجود اسرائیلی وزیراعظم بن ہاک شامیر نے فیصلہ کیا کہ وہ خفیہ طور پر نانجیریا کو اسلحہ جاری رکھے گا۔ بشرطیکہ تیل کی آمد جاری رہے۔ بھکی کے نزدیک یہ ”سیاسی مداری پن“ کی انتہائی تھی۔ موساد سے اپنے پرانے اتحادی ہاس کا کندھا دہانا شروع کر دیا۔ اسرائیل کی 1982ء میں لبنان میں یلغار کے بعد موساد کے ہاتھ بے شمار کئی دستاویزات لگی تھیں جن سے پی ایل او (PLO) اور اے این سی (ANC) کے رہنماؤں کے درمیان رابطوں کے ثبوت ملے تھے، جن کی ہاس کو مدت سے تلاش تھی۔ موساد نے یہ ثبوت ہاس کے حوالے کر دیے، جس کے ایجنٹوں نے اے این سی کے لیڈروں اور ممبران کو گرفتار کر کے ظلم و تشدد اور تاراج کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔

1980ء کا زمانہ براعظم افریقہ میں موساد کی کامیابیوں کا سنہرا دور تھا۔ جہاں وہ چینیوں کو روسیوں کے خلاف استعمال کر رہی تھی وہیں اُس نے امریکن سی

بائیں بازو کے انقلاب کی طرف بڑھ رہا تھا جو اُن کے دونوں ملکوں، جنوبی افریقہ اور اسرائیل کو بھی نکل سکتا تھا۔ اس کی روک تھام کے لئے کسی بھی حد تک جایا جاسکتا تھا۔ دونوں خفیہ ایجنسیاں ایک دوسرے کے ساتھ اپنے خدشات، خطرات اور امکانات بارے صلاح مشورہ کرتی رہتی تھیں اور دونوں ہی اپنے طور پر یہ سمجھتی تھیں کہ اُن سے زیادہ پورے افریقہ میں ان خطرات سے آگاہ اور کوئی نہیں اور وہی اس کا توڑ کر سکتی ہیں کیونکہ دونوں کو سب سے خطرناک غیر ملکی جاسوس ایجنسیاں سمجھا جا رہا تھا۔

واشنگٹن (امریکہ) بھی ان کے اشتراک سے غافل نہ تھا۔ سی آئی اے کو یہ خطرہ محسوس ہونے لگا کہ سیاہ افریقہ پر اُس نے جو اثر و رسوخ قائم کر رکھا تھا یہ ایجنسیاں اس میں رخنہ نہ ڈال دیں۔ 1960ء کی دہائی کی آزادی کی تحریکوں نے سی آئی اے کی افریقہ میں دلچسپی دوچند کر دی تھی اور اس نے اس براعظم میں اپنی سرگرمیاں کئی گنا بڑھا دی تھیں۔ سی آئی اے میں ایک افریقی ڈویژن قائم کر کے تقریباً ہر ملک میں سی آئی اے ٹیمیں قائم کر دیئے گئے تھے۔

سی آئی اے کی طرف سے افریقہ میں کام کرنے والا سب سے پہلا شیشن کماڈرل بلکلی (Bill Buckley) تھا، جسے بعد ازاں حزب اللہ کے دہشت گردوں نے بیروت میں اغوا کر کے قتل کر دیا تھا۔ اپنے اغوا اور قتل سے تھوڑا عرصہ پہلے بلکلی نے کہا تھا۔

”افریقہ اس وقت خفیہ ایجنسیوں کے لئے پاگل پن کے دورے اور جنوبی کیفیت میں مبتلا ہے۔ ہر خفیہ ایجنسی، دوسروں کو پچھاڑنے کی تک وڈو میں لگی ہوئی ہے۔ ہم (CIA) اس میدان میں تاخیر سے اترے تھے اور موساد سمجھتی تھی کہ ہم دروازہ توڑ کر اندر گھس آئے تھے۔“

جو ہمارے ساتھ کام کرنا چاہتا ہو۔ اس سے ہمیں یہ جاننے میں مدد ملی کہ ملک کے اندر کیا کچھ ہو رہا ہے۔ کسی ملک کی پالیسی میں ذرا سی تبدیلی، جس کا اثر اسرائیل پر پڑ سکتا تھا، موساد کے ہیڈ کوارٹر کو رپورٹ کی جاتی تھی۔“

افریقہ جانے سے پہلے کوہن نے خفیہ جاسوس (انڈر کور) مصر اور دوسری جگہوں پر بڑا نام کمایا تھا۔ وہ اپنا حلیہ تبدیل کرنے میں بہت ماہر تھا۔ افریقہ بھیجنے سے پہلے، پلاسٹک سرجری کے ذریعے اُس کے چہرے کی ساخت، خصوصاً ناک اور رنگ، تبدیل کر دیا گیا تھا تاکہ مقامی لوگوں میں گھٹنے ملنے میں آسانی ہو۔ پلاسٹک سرجری کے بعد جب ہسپتال سے وہ گھر واپس آیا تھا تو اُس کی اپنی بیوی نے بھی اسے بمشکل پہچانا تھا۔

1984ء کے نئے سال کے دن موساد کے سربراہ تھوم ایڈمونی کی روزمرہ کی جاسوسی کی خبروں میں ناچھیریا میں فوجی انقلاب کی خبر بھی شامل تھی۔ ایک ملٹری سازش کے نتیجے میں جس کی قیادت میجر جنرل محمد بوہاری نے کی تھی، اقتدار پر قبضہ کر لیا تھا۔ اسرائیلی وزیراعظم شامیر کا پہلا سوال یہ تھا کہ اس سے اسرائیل کو ناچھیریا سے تیل کی سپلائی پر کیا اثر پڑے گا؟ کسی کو معلوم نہیں تھا۔ نئی حکومت سے فوری رابطوں کی دن بھر کی کوششیں ناکام رہیں۔

اقتدار پر قبضے کے دوسرے دن بوہاری نے سابق ارکان حکومت کی ایک فہرست جاری کی جس میں ان پر کئی قسم کے الزامات لگائے گئے تھے۔ فہرست میں سب سے اوپر سابقہ وزیر ٹرانسپورٹ اومارو دکو (Umaru Dikko) کا نام تھا، جس پر تیل کے منافع میں کئی ملین امریکن ڈالر قومی خزانے سے غبن کا الزام تھا، ملک سے فرار ہو گیا تھا اور حکومت کی انتہائی کوششوں کے باوجود اس کا سراغ نہ لگایا جاسکا۔

ایڈمونی نے موقع سے فائدہ اٹھانے کی ٹھان لی۔

آئی اے برطانوی ایم آئی 6 (MI-6) اور دوسری یورپ کی خفیہ ایجنسیوں کے لئے اس براعظم میں کام کرنا مشکل بنا دیا تھا۔ جب کبھی موساد کو کسی جاسوس ایجنسی سے خطرہ محسوس ہوتا یہ اُس کی خفیہ سرگرمیوں کو پشت از ہام کر دیتی تھی۔ کینیا میں ایم آئی 6 کے ایک ایجنٹ کے چوتھڑے اڑا دیئے گئے۔ ڈائرے میں فرانسیسی خفیہ ایجنسی کا ہیڈ ورک تباہ کر دیا گیا۔ تنزانیہ میں جرمنی کی خفیہ ایجنسی کا ایک آپریشن عین بروقت ناکامی سے دوچار کر دیا کہ موساد نے ایک مقامی اخباری رپورٹر کے ذریعے اس کا انکشاف کر دیا تھا۔

جب دہشت گرد رہنما ابو ندال (Abu Nidal) نے، جس نے لندن میں اسرائیلی سفیر شلومو آرگوف (Shlomo Argov) کو، 3 جون 1982ء کو ڈورچسٹر ہوٹل (Dorchester Hotel) کے باہر قتل کرنے کی سازش تیار کی تھی، سوڈان میں پناہ حاصل کرنے کی کوشش کی تھی، تو موساد نے وہاں کے حکمرانوں کو یقین دہانی کرائی تھی کہ ابو ندال کے زندہ یا مردہ پکڑے جانے کی صورت میں اسرائیلی حکومت انہیں دس لاکھ امریکی ڈالر ادا کرے گی، آخر ابو ندال وہاں سے بھاگ کر بغداد (عراق) کی پناہ میں چلا گیا تھا۔ افریقہ کے تقریباً ایک درجن ملکوں میں موساد نے نئی ابھرنے والی افریقن نیشنلزم کی تحریک کو ناکامی سے دوچار کر دیا تھا۔ ان ملکوں میں موساد کے جوائنٹ سرگرم عمل تھے، ان میں ایک معروف نام یعقوب کوہن کا بھی تھا، جس نے بعد میں بتایا۔

”ہم نے اپنے ایجنٹوں اور خبروں کو جاسوسی کے ایسے گریج سکھا دیئے تھے کہ وہ دوسروں کے مقابلے میں ہمیشہ آگے نظر آئیں۔ ناچھیریا جیسے ملکوں میں قبائلی تعصب کو ہوا دے کر خانہ جنگی شروع کرادی۔ ہماری پالیسی یہ تھی کہ ہر اُس شخص کے ساتھ مل کر کام کیا جائے

وہاں بھی موساد کے مجبر پھیلا دیئے گئے۔ رینٹ اسے کار کے ٹکڑوں سے کہا گیا کہ اگر کبھی وہ کرایہ پر کار حاصل کرے تو فوراً اس کی اطلاع دیں۔ انٹرائن کے ایجنٹوں کو کہا گیا کہ اگر وہ ٹکٹ خریدے تو فوراً موساد کو فون پر اطلاع کر دیں۔ موساد کے جو مجبر کریڈٹ کارڈ کمپنیوں میں کام کرتے تھے، ان سے کہا گیا کہ اس کے کریڈٹ کے استعمال پر نظر رکھیں۔ ہوٹلوں اور ریسٹورانوں کے ہیروں کو کوکے طبقے سے روشناس کرا دیا گیا۔ درزیوں کو اس کے کپڑوں کے ڈیزائن اور کارلساز سے آگاہ کر دیا گیا۔ روم سے نکلے کہ جس تک جوتے بنانے اور بیچنے والوں کو کوکے ساز ۱۲ کے پسندیدہ ڈیزائن اور جسم کی تفصیل بتا دی گئی۔ لندن میں رابرٹ میکسویل (مالک مرد گروپ آف نیوز پیپرز) کی ڈوٹی لگائی گئی کہ وہ یہ سراغ لگائے کہ لندن میں کن افریقی ممالک کے سفارتکاروں سے کے رابطے تھے، یا اس کہاں جاوے رکھی ہوگی، یا اس کے بارے میں کہیں کوئی ٹھس پٹس ہو رہی ہو۔

نام ایڈمونی نے اندازہ لگایا کہ دو لندن میں بی روپش ہو گا کیونکہ یہ شہر ان دنوں نئے حکمرانوں کے مخالفین کی جنت بنا ہوا تھا۔ چنانچہ اس نے انتہائی تجربہ کار ایجنٹ اس شہر میں لگا دیئے، ان کے ساتھ ساتھ تاجکین حکومت کے جاسوس بھی میجر محمد یوسف کے زیر نگرانی شہر میں آگئے۔ انہوں نے اپنی رہائش کے لئے کرمویل روڈ پر اپارٹمنٹ کرائے پر لے لیا۔ موساد کے ایجنٹوں نے ان ہوٹلوں کا انتخاب کیا جہاں اکثر افریقی سیاح آ کر ٹھہر کر رہتے تھے۔

دونوں گروپ الگ الگ کام کرتے ہوئے تاجکیریا کے لوگوں کی بڑی کیونٹی میں گھلنے پھلنے لگے۔ یوسف کے لوگوں نے نئی حکومت سے ڈر کر بھاگے ہوئے مہاجر ظاہر کرنا شروع کر دیا۔ موساد کے ایجنٹوں نے

وہ جعلی کینیڈین پاسپورٹ پر جو موساد کے اکثر جاسوس بیرون ملک آپریشن کے مواقع پر بہ سہولت استعمال کیا کرتے تھے۔ تاجکیریا کے دارالحکومت لاگوس پہنچا۔ یوہاری نے رات کے آخری پہر اس سے ملاقات کی۔ جنرل نے تسلی سے ایڈمونی کی بات سنی اور ایک پیشکش دی، جس کو اسرائیل کے وزیراعظم رابن کی منظوری حاصل تھی۔ اس ضمانت کے بدلے میں کہ اسرائیل کو تیل کی سپلائی میں رکاوٹ نہیں آنے دی جائے گی، موساد کو کوڈھونڈ کر تاجکیریا کے حوالے کر دے گی۔ یوہاری نے ایک سوال پوچھا۔ کیا موساد یہ پتہ بھی لگائے گی کہ دو نے نہیں شدہ رقم کہاں چھپا رکھی تھی؟ ایڈمونی نے جواب دیا کہ نہیں شدہ رقم یعنی طور پر سول بینک کے متعدد اکاؤنٹس میں ہوگی لیکن اس کا پتہ لگانا ممکن طور پر ناممکن ہوگا، تاہم تھیکہ دو خود اس کی موجودگی کا انکشاف نہ کرے۔ یوہاری کے چہرے پر پہلی مسکراہٹ نظر آئی۔ ایک دفعہ دو تاجکیریا واپس آ گیا تو اس سے اگھوانا کوئی مسئلہ نہیں ہو گا۔ یوہاری کا آخری سوال تھا۔ کیا موساد، تاجکیریا کی سکیورٹی ایجنسی کے ساتھ مل کر کام کرنا پسند کرے گی؟ اور دو کے پکڑے جانے کی صورت میں اس کا کریڈٹ لینے کا دعویٰ نہیں کرے گی؟ ایڈمونی نے یہ بات تسلیم کر لی۔ یہ آیا۔ سیدھا سادہ آپریشن تھا جس میں کوئی پیچیدگی نہ تھی۔

دانی ایٹان کے دور کے کہنے مشن جاسوس پورے یورپ میں متحرک کر دیئے گئے۔ موساد کے ایجنٹ چین سے سویڈن تک محوسر ہو گئے۔ ایک درجن سے زائد ملکوں میں خبروں کو چوکنا کر دیا گیا۔ ڈاکٹروں کو کہہ دیا گیا وہ اس کی تلاش میں مدد دیں۔ پلاسٹک سرجنوں کو بھی محتاط رہنے کے لئے کہہ دیا گیا مبارادہ اپنا حلیہ تبدیل کرانے کی کوشش کرے۔ جن علاقوں کے ہوٹلوں کو وہ ماضی میں رونق بخشا کرتا تھا۔ مثلاً سینٹ مورٹز، مونٹے کارلو،

کیا تھا۔

ایک اہم کردار، ایک باہر کی شخصیت کے سپرد کیا گیا تھا۔ یہ تھے انتہائی قابل احترام اور معروف ڈاکٹر لیوی آری شاہو، جو ہسپتال، گل ایب کے شعبہ آئی سی یو کے انسٹانٹ (بیہوش کرنے والے) انچارج تھے۔ ان کو حب الوطنی کا واسطہ دے کر موساد کے ایجنٹ الیکٹرینڈر باراک نے اس کام کے لئے آمادہ کیا تھا۔ ڈاکٹر نے لندن جانے اور باراک کے دیئے ایک ہزار ڈالر میڈیکل آلات کی خریداری پر صرف کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی تھی۔ اس کو مزید ہدایات لندن میں دی جاتی تھیں۔ شاہو نے اپنی پیشہ وارانہ فیس لینے سے انکار کر دیا تھا اور کہا تھا کہ اُسے اپنے ملک کی خدمت کرنے پر فخر ہے۔ موساد کا ایک اور ایجنٹ 2 جولائی کو ایمسٹرڈیم سے پہلے ہی لندن پہنچ چکا تھا جس کا نام فلیس آبتھ ہول تھا اور اس نے رسل سکوئر ہوٹل میں قیام کیا تھا۔ اس کی ہدایت ناچجرین ٹیم کے سربراہ ہونکو یہ بھی کہ ایک وین کرائے پر حاصل کرے۔ یونسو کے آدھوں میں سے ایک نے جس گاڑی کا انتخاب کیا وہ صاف سفید پہلے رنگ کی کاناری وین تھی۔ شاید یہی لمحہ تھا جب آپریشن کی ناکامی کا آغاز ہو گیا۔

3 جولائی کی شام کو ناچجرین ائربیز کا ایک مال بردار جہاز 707 سیٹھ (Stansted) ائربورٹ پر اترا جو لندن سے 30 میل کے فاصلے پر، شمال مشرق میں واقع ہے۔ یہ لاگوں سے خالی آیا تھا۔ جہاز کے پائلٹ نے ائربورٹ اتھارٹی کو بتایا تھا کہ اپنے سفارتخانے سے ڈپلومیٹک بیگج (Diplomatic Baggage) لینے آیا ہے۔ جہاز کے عملے کے ساتھ کئی سکیورٹی گارڈ بھی آئے تھے جنہوں نے کہا تھا کہ وہ بیگج کی حفاظت کے لئے آئے ہیں۔ جہاز پر ان کی موجودگی کی اطلاع سکاٹ لینڈ یارڈ کی سٹیشن برانچ کو دے دی گئی۔ گزشتہ ماہ ایسی کئی

ساؤتھ افریقہ میں آزادی کے لئے جدوجہد کرنے والے سیاہ فام افریقیوں کے ہمدردوں اور بی خواہوں کے طور پر پیش کرنا شروع کر دیا۔ آہستہ آہستہ انہوں نے اپنی تلاش کا کام مغربی لندن سے لے کر ہائیڈ پارک (Hyde Park) کے ارد گرد کے علاقے تک پھیلا دیا، جہاں امیر اور مالدار ناچجرین رہائش پذیر تھے اور جلا وطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔ انہوں نے دھڑوں کی ان فہرستوں کو کھٹکانا شروع کر دیا جو علاقے کے کمیٹی اور ناؤن ہالوں میں آسانی سے دستیاب تھیں۔ ہر مرتبہ انہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا۔

پھر لاگوں سے فرار ہونے کے سات ماہ بعد دو منظر عام پر آ گیا۔ 30 جون 1984ء کو موساد کا ایک ایجنٹ، کونزوے پر گاڑی چلاتے ہوئے گزر رہا تھا۔ جو تیس واٹر روڈ پر ایک بڑے بھوم گزرگاہ ہے کہ اس نے ایک آدمی کی جھلک دیکھی، جس کی شکل و شبہت او مارو کو سے ملتی جلتی تھی۔ وہ قدرے بوڑھا اور دبلا پتلا دکھائی دے رہا تھا لیکن اس کے چوڑے چہرے اور سیاہ آنکھوں میں کوئی فرق نہ تھا۔ بھوم میں پھنسی کار کی وجہ سے ایجنٹ کو دوبارہ دیکھنے کا موقع نہ مل سکا۔

پارکنگ ایریا دیکھ کر ایجنٹ نے کار کھڑی کی اور پیدل دوکانے کا تعاقب شروع کر دیا جو اسے ڈور چٹریس کے قریب واقع ایک گھر تک لے گیا انڈیونی کو فوراً اطلاع کر دی گئی۔ اس نے فوری طور پر جو عزم جاری کیا وہ یہ تھا فی الحال 24 گھنٹے مکان کی نگرانی کی جائے۔ جولائی 1984ء کے پہلے تین روز دو ایجنٹ لگا تار دوکانے کی نگرانی کرتے رہے۔ اسی دوران ناچجرین جاسموں کی ٹیم، ناچجریا کے سفارتخانے کو دوکانہ کو انکوائرنے کے بعد میں کیپ کے طور پر استعمال کرنے کی تیاری کرتے رہے۔ دوکانہ کو اسی طریقے پر انکوائر کیا جانا تھا جیسا رانی ایٹان نے اوڈولف ایچمن (Odolf Eichmann) کے ساتھ

کی اطلاع دے دی۔ چند منٹ میں پولیس موقع پر پہنچ گئی اور فوری بعد سکاٹ لینڈ یارڈ کا کافی ٹیریزم سکاڈ کا کمانڈر ولیم مہکوبلی بھی پہنچ گیا۔ جو کچھ ہوا، اس کا اسے پہلے سے ہی شک تھا۔ تمام ہندگا رہوں اور ہوائی اڈوں کو ہوشیار کر دیا گیا۔ مہکوبلی کے لئے صورت حال اور بھی پیچیدہ ہو گئی تھی۔ اگر دو کو تائیجیرین حکمرانوں نے اغوا کیا تھا تو اس سے کئی نازک سیاسی سوالات پیدا ہو جائیں گے۔ لہذا وزارت خارجہ کے ساتھ ساتھ وزیراعظم ہاؤس، 10 ڈاؤنگ سٹریٹ کو بھی الارٹ کر دیا گیا تھا۔ مہکوبلی کو حکم ملا کہ وہ جوائنٹشن مناسب سمجھے، لے۔

3 بجے کے کچھ ہی دیر بعد وین سلیٹڈ ائرپورٹ کے کارگو ٹرمینل پر پہنچی۔ پوسٹو نے کسٹم افسروں کو تائیجیرین ڈپلومیٹک پاسپورٹ لہرا کر دکھایا۔ انہوں نے دو کریٹ جہاز میں لوڈ ہوتے ہوئے دیکھے۔ کسٹم افسروں میں سے ایک، چارلس مورو، نے بعد ازاں بتایا۔ ایک کریٹ کے بارے میں کچھ مشکوک سی صورت حال تھی۔ بحریہ نے اس میں سے کچھ شور سنا۔ میں نے کہا کہ اس پر وائٹس کہ کریٹوں سفارتی تحفظ حاصل ہے یا نہیں۔ مجھے اندر سے ضرور جھانک کر دیکھنا چاہئے۔

کریٹوں کو جہاز سے اتار کر ایک قریبی بیئر میں لے جایا گیا، باوجود اس کے کہ پوسٹو شدید احتجاج کر رہا تھا کہ انہیں سفارتی امونیشن حاصل ہے۔ کھلنے پر پہلے کریٹ سے اومارڈو کو برآمد ہوا جسے جکڑ کر باندھا ہوا تھا اور وہ ٹیکے کے زیر اثر بے ہوش تھا۔ اس کے ساتھ ڈاکٹر شاہیر و بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں سرنج تھی تاکہ دو کو بے ہوش کی مزید ڈرگ لگائی جاسکے۔ دو کے گلے میں ایک ٹیوب لگی ہوئی تھی تاکہ قے آنے کی صورت میں اس کا سانس بند نہ ہو۔ دوسرے کریٹ میں موساد کے دونوں ایجنٹ ہاراک اور آبت ہول براجمان تھے۔

مقدمے کی سماعت کے دوران موساد کے دونوں

اطلاعات ملی تھیں کہ تائیجیریا کی نئی حکومت لندن میں جلاوطنی کی زندگی گزارنے والے تائیجیرین باشندوں کو ڈرا دھمکا رہی تھی۔ سکیورٹی والوں کو بتا دیا گیا کہ وہ ائرپورٹ سے باہر نہیں جاسکتے۔ انہیں صرف ائرپورٹ کی کافی شاپ تک جانے کی اجازت دی گئی ورنہ انہیں اپنے جہاز کے اندر ہی رہنا تھا۔

صبح کے وقت وہ کاناری وین جو ایک تائیجیرین نے کرائے پر لی تھی ٹونگ مل گیٹ سے باہر نکلی اسے پوسٹو خود چلا رہا تھا۔ پچھلی طرف ایک کریٹ کے ساتھ ڈاکٹر شاہیر و سکر کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے پہلو میں ہاراک اور آبت ہول جڑے بیٹھے تھے۔ دوپہر کے وقت جہاز 707 کے پائلٹ نے سلیٹڈ ائرپورٹ پر اپنی لاگوس کے لئے روانگی کا وقت 3 بجے سہ پہر درج کرا دیا۔ جہاز پر لاوے جانے والے سامان کی تفصیل میں دو کریٹ دستاویزات برائے وزارت خارجہ، لاگوس لکھوا دیا گیا۔ دونوں کنٹینرز کے لئے سفارتی تحفظ کلیم کیا گیا تھا (یعنی چیکنگ سے اسٹفی)۔

دوپہر سے کچھ ہی دیر پہلے وین ٹریفک کے بھجوم سے گزرتی ہوئی دوہر ٹریڈز کے قریبی مکان کے پاس آ کر رک گئی۔ تھوڑی سی دیر بعد اومارڈو کو اپنے دوست کے ساتھ دوپہر کا کھانا قریبی ریسٹورانٹ میں کھانے کے لئے گھر سے نکلا۔ مکان کی کھڑکی میں کھڑی دو کی پرائیویٹ سیکرٹری الزبتھ ہنس اسے گھر سے سڑک پر نکلتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ جونکی اس نے منہ دوسری طرف موڑا جھٹ سے وین کا پچھلا دروازہ کھلا، دو گہری رعیت والے بندے وین سے کودے اور دو کو قابو کر کے وین میں پھینک دیا اور خود بھی اندر کود گئے اور وین تیز رفتاری سے آگے بڑھ گئی۔ وین میں پھینکے جانے کے وقت دو ایک چیخ مارنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

سیکرٹری نے فوراً ایمرجنسی نمبر 999 ملا یا اور وقوع

آخری سلام

مشرقی پاکستان کے میدان جنگ سے

ميجر آفتاب احمد



1958ء اور 1970ء کے مارشل لا کو پاکستان کے دہشت گرد ہونے کا سبب۔ پاک فوج کی عوام سے دوری کا باعث اور ان کی صفوں میں سردار کے بحران کا محرک گردانتے ہوئے انہوں نے اپنے حلق کے حکاموں کے عین مطابق ملک میں ایک اور فوجی اور عوامی انتشار کے آثار جزاں ضیاء الحق کے تیسرے مارشل لا کے خلاف مسلح افواج کے اندر سے ہی مزاحمت کی حد تک الشال روایت ڈالنے کی جرات رندانی کی۔ اس ناقابل یقین، انوکھے اور منفرد "جرم وفاق" میں وہ جس دوام کے سختی ظہرے۔ ادھر جمہوریت کی بحالی کے بعد ضمیر کی آواز بلند رکھنے کے جرم نکر میں حاکم وقت بینظیر بھٹو نے بھی انہیں تین سال بنا مقدمہ سندھ کی جیلوں میں اسیر کیے رکھا۔

ایجنٹوں نے یہ افسانہ گھڑا کہ کرائے کے فوجی تھے جو تاجیریا کے تاجروں کے ایک گروپ کے لئے کام کر رہے تھے تاکہ دکانوں کو واپس لے جا کر اس پر مقدمہ چلایا جاسکے۔ ان کے دفاع کے لئے برطانیہ کے بہتے ترین وکیل جارج کارمن کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ اس نے اپنے اختتامی دلائل میں عدالت کو مخاطب کر کے کہا۔ "واضح اور صاف وضاحت یہ ہے کہ اسرائیلی انٹیلی جنس ایجنسی اس سارے آپریشن میں دور دور تک بھی ملوث نظر نہیں آتی۔"

عدعالیہ کی طرف سے موساد کے ملوث بارے کوئی شہادت پیش نہیں کی گئی۔ لہذا اتمام معاملہ جج کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا۔ اس نے جیوری کو بتایا۔ ملوث ہونے کے بارے میں یقینی طور پر ہر انٹیلی موساد کی طرف اٹھتی ہے۔ باراک کو 14 سال کی سزا سنائی گئی۔ ڈاکٹر شاہیو اور آبت ہول میں سے ہر ایک کو دس سال کے لئے جیل بھیج دیا گیا۔ یوسف کو بارہ سال کی قید دی گئی۔ جیل میں اچھے رویے اور کردار کی بناء پر بعد میں سب کو چھوڑ کر خاموشی سے ملک بدر کر کے اسرائیل بھیج دیا گیا۔ ان کے بہت سے پیش روؤں کی طرح انہیں تنہائی خاموشی کی زندگی گزارنے کے لئے چھوڑ دیا گیا۔ ڈاکٹر شاہیو، جو اندر سے ٹوٹ پھوٹ گیا تھا کیونکہ اس نے اپنے پیشروانہ حلق کو توڑا تھا، دوبارہ وہ اداروں کا کام شروع کر دیا لیکن کس کے لئے؟

ایم آئی 5 کی طرف سے موساد کے سربراہ ناہوم ایڈمونی کو بتایا گیا کہ آئندہ کوئی ایسی حرکت ہوگی تو موساد کو غیر دوست ایجنسی کی حیثیت سے سلوک کیا جائے گا لیکن انہی دنوں موساد کا سربراہ ایک نئے آپریشن کی تیاری میں جتا ہوا تھا تاکہ برطانیہ پر یہ ثابت کر سکے کہ حقیقی دشمن کون ہے؟ اور ساتھ ساتھ اسرائیل کے لئے ہمدردی اور حمایت بھی حاصل کر سکے۔



فلسفۂ انقلاب

انقلاب کی کامیابی کی ضمانت وہ سچے انقلابی ہوا کرتے ہیں جن کا مقصد حصول اقتدار نہیں، حصول رضائے الٰہی ہو۔

☆ آخری حصہ 0300-9242724 ڈاکٹر پروفسر سلیم احمد شاہ

انقلابی تحریک

ابتداء میں تو انقلابی سوچ ابھرتی ہے پھر وہ انقلابی سوچ مرحلہ وار ایسی شکل اختیار کرتی ہے کہ عوام بیدار ہو جاتے ہیں۔ رہنوں کے ذریعے، جلسوں کے ذریعے اور انقلابی نعروں کے ذریعے بیدار ہونے کے بعد عوام کی طاقت کو ایک باقاعدہ انقلابی تحریک کی شکل دینی ضروری ہوتی ہے۔ اگر منظم انقلابی تحریک نہ ابھرے تو عوامی طاقت کا جوش دہکی میں دودھ کے ابال کی طرح ختم ہو جاتا ہے، انتشار ظاہر ہوتا ہے، خانہ جنگی جنم لیتی ہے لیکن اگر اس انقلابی جذبہ کو قابو کر لیا جائے اور منظم کر لیا جائے تو انقلابی تحریک تعمیری شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اسے انقلابی تحریک کا تعمیری دور کہا جاتا ہے۔

انقلابی فلسفہ

انقلابی فلسفہ وہ فلسفہ ہے کہ جس کے نتیجے میں قوم کے اندر انقلابی سوچ اور انقلاب کی ضرورت کا احساس پیدا ہو جائے۔ علامہ اقبال کے انقلابی فلسفہ نے برصغیر میں انقلاب کی روح پھونک دی۔ بازوے تنگ کے انقلابی فلسفہ نے چینی قوم میں خود کو تبدیل کرنے کا احساس پیدا کر دیا۔ یوکیوشیا کے فلسفہ انقلاب نے جاپانیوں میں قومی غیرت کی روح پھونک دی۔ ہونگی منہ کے فلسفہ نے ویت نام کو آزاد کروایا۔ چنگی گویا کے فلسفہ نے کیوبا آزاد کر دیا اور لاطینی امریکہ میں آزادی کی روح پھونک دی۔ ہمارے خطے کو بھی قائد اعظم کے بعد ایک فلسفے کی ضرورت ہے جو افراد قوم میں حقیقی آزادی کی روح پیدا کر دے۔

انقلابی قیادت

گتے ہیں۔ ایسے مرحلے پر انقلابی تحریک کے قائدین کو چاہئے کہ ابتدائی محرکاتی انقلابیوں کی دل جوئی کریں ان کی قربانیوں کو غلوں کے ساتھ تسلیم کریں ان کو انعامات اور خطابات سے نوازیں۔ ان کے لئے نئے تعمیر کارکنوں کے دل میں احترام پیدا کریں تاکہ محرکاتی پُر جوش کارکن تعمیر کارکنوں سے نہ الجھیں اور نہ لڑائی کریں۔

برہنہ قریح مزاج قائدین تحریک انقلاب کے لئے ضروری ہے کہ تحریک انقلاب کی دونوں قوتوں کی قدردانی و منزلت کو سمجھیں۔ ان کی حوصلہ افزائی کرے اور ان کو ہام جوڑے رکھے۔ باہمی اختلافات جب دور ہوتے ہیں جب اختلافات کو ہوا نہ دی جائے۔ جس معاشرے میں مذہبی اور معاشرتی اختلافات کو ہوا دی جائے وہاں اتحاد پیدا نہیں ہو سکتا۔

انقلابی تحریک کے رہنما اصول

(1) پُر غلوں اور عوام کے ہمدرد۔ (2) ذہین اور معاملہ فہم (3) انتھک اور محنتی (4) سادگی اور فضول خرچی سے پرہیز (5) اعلیٰ اخلاق کے حامل (6) وقت کی پابند قیادت (7) عوامی فلاح و بہبود بغیر کسی تعصب کے۔

انقلابیوں کی خصوصیات

(1) یقین محکم: اس بات پر یقین انقلابیوں میں ہونا لازم ہے کہ انقلاب کامیابی کی منزل پر پہنچے گا۔
(2) عمل پیہم: مسلسل کوشش عمل پیہم انقلابیوں کے لئے ضروری ہے اور انتھک محنت جاری رہنی لازم ہے جب تک انقلاب نہ آجائے۔

(3) خدمتِ خلق: اس بات پر جنوں کی حد تک جھل کے ساتھ انقلابیوں کے لئے لازم ہے کہ قوم کی خدمت کی جائے۔

کامیاب انقلاب آزادی کے لئے ایسی انقلابی قیادت کی ضرورت ہوتی ہے جو کہ مرحلہ وار آگے بڑھتے ہوئے انقلاب کی طاقت کو تعمیری رخ دینے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ انقلابی فلسفے کو سمجھ کر سوچ اور شعور سے کام لے کر تعمیر کارکنوں میں انقلابی طاقت کو کارآمد بنائے۔ عوامی طاقت کو اگر تعمیری پروگراموں میں نہ لگایا جائے تو عوام کی انقلابی طاقت انارکی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ تعمیری انقلابی پروگرام ایسے بنائے جائیں کہ لاگت نرم پلاننگ اور قابل عمل حکمت عملی کے ذریعے قوم کی حالت کو مثبت طریق پر تبدیل کر دیا جائے۔ انقلابی تحریک ٹینک ایسا ہو کہ وہ مسائل کے عارضی حل کی بجائے مستقل حل نکالے۔ ہاشور انقلابی قیادت کامیاب انقلاب کی ضمانت ہوا کرتی ہے۔

انقلابی کمیٹیاں

ہرے ملک میں انقلابی تحریک کو پھیلانے کے لئے انقلابی کمیٹیاں بنانی ضروری ہوتی ہیں۔ ان کمیٹیوں کی تعلیم تعلیم یافتہ تعمیری سوچ رکھنے والے افراد پر مشتمل ہونی چاہئے۔ یہ بات یاد رکھی جائے کہ انقلابی روح نعروں اور دھڑوں اور جلسوں کے ذریعے عوام میں بیدار کرنے والی کمیٹیاں بھی بہت ضروری ہوا کرتی ہیں۔ یہ پُر جوش کارکن انقلابی تحریک کے پہلے کو حرکت دیتے ہیں اور پھر انقلابی تحریک کی گاڑی چل پڑتی ہے۔

انقلابی تحریک کو شروع کرنے والوں کی اہمیت ہے۔ حد ہے اگر یہ پُر جوش جذباتی کارکن انقلابی تحریک کو نہ لیں تو انقلابی تحریک شروع ہی نہیں ہو سکتی لیکن انقلاب کے اگلے مرحلے میں جب تعمیری انقلابی کمیٹیاں وجود میں آتی ہیں تو محرکاتی انقلابی کارکن دل برداشتہ ہونے

ہے۔ فوری اشتعال میں آکر بیان بازی اور نعرے بازی
سچے انقلابی کی خصوصیت نہیں ہوا کرتی۔ لاطینی زبان کا
معاورہ ہے ”Acta Non Verba“ یعنی ”کام،
باتیں نہیں۔ سچا انقلابی کچھ کر کے دکھاتا ہے اور اس کے
کام تعمیری ہوا کرتے ہیں تحریکی نہیں۔

حقیقی انقلاب کیلئے مذہب کا احترام لازم ہے

سچے انقلابی میں مذہب کا احترام لازم ہے اس
لئے کہ ہر اچھائی کی بنیاد مذہب میں ہی ہوا کرتی ہے لیکن
جو لوگ مذہب کے نام پر دولت کماتے ہیں اور مذہب کو
حصول مفادات کا ذریعہ بناتے ہوئے لوٹ مار کرتے
ہیں، وہ کبھی سچے انقلابی نہیں بن سکتے اور ایسے ملک میں
مذہب کے نام پر ذاتی مفادات حاصل کرنے والے لوگ
بستے ہوں وہاں سچا انقلاب کبھی نہیں آ سکتا۔ انقلاب
قربانیاں مانگتا ہے اور ضبط نفس کے حامل افراد کو انقلاب
حقیقی کی برکات حاصل ہوتی ہیں۔

مذہب کے احرام کا مطلب ہے مذہب کی اخلاقی
تعلیمات کو اپنی زندگی کا حصہ بنایا جائے صرف مذہبی
عبادات کے ذریعے مذہب کا احترام کافی نہیں ہو سکتا اس
لئے کہ عبادت کا تعلق حقوق اللہ کے ساتھ ہے اور مذہبی
اخلاقیات کا تعلق حقوق العباد سے ہوا کرتا ہے۔ سچا
انقلابی حقوق العباد کو بہت زیادہ اہمیت دیتا ہے اور حقوق
خدا کی بجی ہمدردی سے سرشار ہو کر انقلاب حقیقی کی
جدوجہد کرتا ہے اور ہر قسم کی سختیاں برداشت کرتا ہے۔

انقلاب کی کامیابی کی ضمانت وہ سچے انقلابی ہوا
کرتے ہیں جن کا مقصد حصول اقدار نہیں ہوا کرتا۔
حصولِ رضائے الہی اصل مقصد ہو تو انقلاب کامیاب ہو

گا۔

(4) ایمان: پختہ ہونا لازمی ہے کہ اللہ کی مدد نیک نیت
لوگوں کے حق میں ہوا کرتی ہے۔

(5) عزت نفس: اپنی ذاتی عزت نفس کا خیال رکھا جائے
جو اپنی عزت نفس کا خیال رکھتا ہے وہ قومی عزت کا بھی
خیال کرتا ہے۔

جب عوام میں خواہش انقلاب بیدار ہوتی ہے تو
پھر اس کے لئے انقلابی منصوبہ بندی کرنا ضروری ہے اور
منصوبہ بندی کے ذریعے انقلاب لایا جاسکتا ہے اور پھر
اس کو قائم رکھنے کا دور شروع ہو جاتا ہے۔

جب انقلاب آ جائے اور مثبت تعمیری نتائج
انقلاب کے ظاہر ہو رہے ہوں تو ضروری ہوتا
ہے کہ قیام انقلاب کی کوشش شروع کر دی جائے۔

ہر شعبہ زندگی میں جو انقلاب آیا ہو اس کو مستقل
بنیادوں پر قائم رکھنے کے اصول تشکیل دیئے جائیں اور
ایک ایسا سسٹم بنایا جائے جس کو قابل عمل بنائے رکھا
جائے اور اس میں ایسی خرابیاں تراشیں گے کہ ذریعے سے نہ
لائی جائیں جن سے کہ کرپشن کے دروازے دوبارہ کھل
جائیں۔

برائی کو پھیلنے دیکر اسے روکنا ضروری ہوتا ہے اگر
لوگ بے حس ہو جائیں تو انقلابی تبدیلیاں خواہ کسی قدر
اچھی ہوں پھر دوبارہ ضائع ہو جائیں گی اور برائیاں
دوبارہ جنم لیں گی۔ سچا انقلابی وہ ہے جو اچھائی کے
معاہدات میں دوسروں سے تعاون کرتا ہے اور برائی کو
پھیلنے سے روکنے کے لئے عملی اقدامات کرتا ہے اور
دوسرے انقلابیوں کا ساتھ دیتا ہے۔

سچا انقلابی کیسا ہوتا ہے؟

سچا انقلابی ایمان داری اور سچائی پر قائم رہتا ہے۔
ہر جگہ اور موقع پر اپنی عزت اور وقار کا خیال رکھتا ہے۔ سچا
انقلابی ہر وقت جگہ موقع اور ماحول میں درست عمل کرتا